ہماری ویب ڈیجیٹل بک

# نعیم الرحمان شائق

# NAEEM UR REHMAAN SHAAIQ

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

HAMARI WEB .com

**E-BOOK SERVICES**

*Collection of Published Articles*
*By "Naeem Ur Rehmaan Shaaiq"*
*at Hamariweb.com*

## اسلام امن کا مذہب ہے

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بلا شبہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ اسلام دہشت گردی اور خونِ ناحق کی اجازت کسی صورت میں نہیں دیتا۔ چناں چہ سورۃ البقرہ کی آیت 256 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے۔" "

اس آیت سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام زبردستی کا قائل نہیں ہے۔ اسلام کا نظریہ جہاد بھی یہ ہے کہ آپ ان سے لڑیں، جو آپ سے لڑتے ہیں۔ چناں چہ سورۃ الممتحنہ کی آیات 7 اور 8 میں ارشاد خداوندی ہے:

" جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمھارے گھروں سے نکالا، ان کے ساتھ انصاف اور بھلائی کا سلوک کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا۔ خدا تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ خدا انھیں لوگوں کے ساتھ تم کو دوستی سے منع کرتا ہے، جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ کی اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی۔ تو جو لوگ ایسوں سے دوستی کریں گے، وہی ظالم ہیں۔"

اسلام کی امن پسندی دیکھیے کہ یہ دینِ متین ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیتا ہے۔ چناں چہ سورۃ المائدہ کی آیت 32 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

"جو شخص کسی کو ناحق قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے، اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا، اور جو اس کی زندگانی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا باعث ہوا۔"

یہ بات نہایت قابلِ افسوس ہے کہ آج ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اسلامی تعلیمات کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ بلکہ اب تو ہم اسلام سے ڈرنے لگے ہیں۔ جب بھی اسلام کے نفاذ کی بات آتی ہے تو ہمارے ذہنوں میں شدت پسندی کا خیال آ جاتا ہے ۔ ہمارے خیال میں اگر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اسلام کا نفاذ ہو گیا تو شدت پسندی میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس خیال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلام کو جانتے ہی نہیں ہیں۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات کو جاننے کے لیے ہمیں قرآن و حدیث اور سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ تبھی ہم جان سکیں گے کہ ہمارا دینِ اسلام کتنا امن پسند ہے۔

اگر میں یہ بات کہوں تو بے جا نہیں کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کی تنزلی کی ایک بڑی وجہ حقیقی اسلام سے دوری ہے۔ حالاں کہ مسلمان دنیا کی دوسری بڑی قوم ہیں۔ دنیا کی 23 % آبادی مسلمان ہے۔ مسلمانوں کی تعداد تقریبا 1.62 بلین ہے۔ جب کہ اسلام دنیا کا سب سے زیادہ تیزی سے بڑھتا ہوا دین بھی ہے۔ تقریبا 57 ممالک اسلامی ہیں۔ اس کے باوجود ہم جدید دنیا سے بہت پیچھے ہیں۔ دنیا و آخرت کی ترقی کے لیے ہمیں لازما اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا ہوگا۔

# کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

نو محرم کا دن تو سکون و عافیت کے ساتھ گزر گیا، لیکن دس محرم کو پاکستان کے شہر راولپنڈی میں حالات نہایت کشیدہ ہو گئے۔ تفصیلات کے مطابق دس محرم الحرام کے ماتمی جلوس کے موقع پر جمعے کو راجہ بازار میں دو گروپوں میں فائرنگ کے نتیجے میں 10 افراد جاں بحق اور 35 زخمی ہو گئے۔ جن میں سے 6 کی حالت تشویش ناک بتائی جاتی ہے۔ ایک اخبار کے مطابق زخمیوں کی تعداد 100 ہو گئی ہے۔ شر پسند عناصر نے نماز پڑھنے کی جگہ کو پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ آگ پھیلنے سے ملحقہ کپڑے کی مارکیٹیں، مدینہ کلاتھ اور مدینہ اسٹریٹ اور ایک ہوٹل جل کر خاکستر ہو گئے۔ مسلح شر پسندوں نے دو گھنٹے تک من مانی کی اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھا۔ پولیس سے بندوقیں چھین لی گئیں اور پولیس اہل کار اپنے فرائض انجام دینے کی بجائے محفوظ مقامات پر بھاگ گئے۔ امن و امان کی صورت حال پر قابو پانے کے لیے ضلعی انتظامیہ نے فوج طلب کر لی اور کرفیو لگا دیا گیا۔

سانحے کے رد عمل میں پنجاب کے کچھ شہروں میں حالات اب تک کشیدہ ہیں۔ ملتان میں دو گروپوں میں جاری کشیدگی کے بعد صورت حال کو کنٹرول کرنے کے لیے فوج طلب کر لی گئی ہے۔ اولیا کے شہر میں مسلح افرد نے فائرنگ کی اور دو کانوں

کی توڑ پھوڑ بھی کی۔ بہاول نگر کی دو تحصیلوں چشتیاں اور ہارون آباد ن میں کشیدگی کے باعث موٹر سائکل پر ڈبل سواری پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ دوسری طرف حکومت کو بھی حساس حالات کا پورا پورا احساس ہے۔ وزیرِ داخلہ نے مختلف علما سے رابطے کیے اور سنگین حالات کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ وزیرِ اعلی پنجاب نے لاہور ہائکورٹ کو کسی سینئر جج سے واقعے کی تحقیقات کرنے کو کہا ہے۔

یہ سب کچھ پڑھنے اور لکھنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ آخر ہم کب فرقہ واریت کو اپنی صفوں سے باہر نکال پھینکیں گے۔ ہاں یہ فرقہ واریت ہی تو ہے، جس نے ہمیں اقوامِ عالم سے بہت پیچھے کر دیا ہے۔ اسی فرقہ واریت کی وجہ سے ہم بے دریغ اپنوں کا خون بہا رہے ہیں۔ جاں بحق ہونے والے بھی کسی کا خون ہوں گے۔ سوچیۓ کہ اس وقت ان کے پسماندگان پر کیا گزر رہی ہوگی۔ دوسری طرف کاروبار بند ہونے کی وجہ سے ان غریبوں کا کیا حال ہوگا، جو تازہ کماتے ہیں اور تازہ کھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں کچھ بھی ہو، نقصان عوام کا ہوتا ہے۔ میرے زہن میں اس وقت قرآن کریم کی وہ خوب صورت اور نہایت نصیحت آموز آیت آ رہی ہے، جس میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں۔

اور سب مل کر خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا اور"

خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے تھے تو خدا نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اس طرح خدا تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سناتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔" (سورۃ آلِ عمران، آیت 103)

قرآن حکیم کی یہ آیت ہم اکثر سنتے ہیں، لیکن اس پر عمل نہیں کرتے۔ بے شک فرقہ واریت ایک لعنت ہے، جو قوم کا قلع قمع کرکے ہی سکون کا سانس لیتی ہے، اور وہ قوم کبھی ترقی نہیں کرسکتی، جس کے افراد اپنے اپنے مسلکوں کے خول میں ہی بند رہتے ہیں۔ کاش کہ ہم فرقہ واریت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قلع قمع کردیں۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

# لیاری۔۔۔۔۔نوجوان ہی کچھ کر سکتے ہیں۔

خبر ہے کہ ملیر کے پانچ کالجوں نے لیاری یونی ورسٹی سے الحاق کرانے سے معذوری ظاہر کردی۔ایک پرنسپل نے بتایا کہ جب ہم نے اپنے طلبا سے کہا کہ وہ لیاری یونی ورسٹی کے امتحان دیں گے تو انھوں نے کہا کہ وہ کالج چھوڑ دیں گے ، مگر لیاری میں امتحان نہیں دیں گے۔

یہ ایک افسوس ناک خبر ہے۔ بہر حال ایک اچھی خبر یہ ہے کہ اس وقت لیاری کی شہید بے نظیر بھٹو یونی ورسٹی جامعہ کراچی کے بعد الحاق شدہ کالجوں اور پرائیویٹ امتحان لینے والی دوسری یونی ورسٹی بن گئی ہے۔ 19 نومبر سے شروع ہونے والے امتحانات میں 1000 طلباء شریک ہوں گے۔ حالاں کہ اس دفعہ بی ایس سی کے امتحان بھی نہیں ہو رہے ہیں۔ صرف بی اے اور بی کام کے امتحان ہو رہے ہیں۔ الحاق شدہ کالجوں کی تعداد 8 ہو گئی ہے۔ پچھلی حکومت نے لیاری کے جیالوں کے لیے تعلیمی لحاظ سے کچھ ایسے اقدامات کیے تھے، جو واقعی قابلِ تعریف ہیں ۔ پچھلی حکومت کے دور میں ہی بے نظیر بھٹو شہید یونی ورسٹی (لیاری یونی ورسٹی )، بیرسٹر ذوالفقار علی بھٹو کالج اور شہید بے نظیر بھٹو میڈیکل کالج جیسے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ پچھلی حکومت نے نوجوانوں کے لیے بہت سارے فنی کورسز کا بھی انعقاد کرایا تھا، جو بالکل فری

تھے۔

میرے مخاطب اس وقت لیاری کے نوجوان ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ لیاری جرائم پیشہ لوگوں کا گڑھ ہے۔ یہاں سرعام جوئے کے اڈے چلتے ہیں۔ یہاں کے کچھ لوگ چرس، افیون اور شراب جیسی چیزوں کے دھندے میں ملوث ہیں۔ یہاں سرعام طرح طرح کے حیلے بہانے تراش کر بھتا لیا جاتا ہے۔ یہاں ہر راہ گیر ہر لمحے اندھی گولی سے خائف رہتا ہے۔ یہاں اغوا برائے تاوان کی وارداتیں بھی کھلم کھلا ہوتی ہیں۔ یہاں عمارتوں اور دوکانوں پر لگے ہوئے گولیوں کے نشانات یہاں کے حالات کی سنگینی کی غمازی کرتے ہیں۔ یہاں فائرنگ شروع ہونے کا کوئی وقت نہیں۔ کسی وقت بھی شروع ہو سکتی ہے۔ یہاں "دو متحارب گروہوں کی لڑائی" کئی بے گناہوں کو ابدی نیند سلا چکی ہے۔ یہاں دوسرے علاقے کے لوگ آنے سے یوں ڈرتے ہیں، جیسے یہ ان کے دشمنوں کا علاقہ ہو۔ حالاں کہ لیاری کے عام باشندے نہایت امن پسند ہیں۔ سب سے افسوس ناک بات یہ ہے یہاں چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھما دی جاتی ہیں۔ یہی وہ وجوہات ہیں، جن کی وجہ سے ملیر کے پانچ کالجوں نے لیاری یونی ورسٹی سے الحاق کرانے سے معذوری ظاہر کی ہے۔

لیکن ان سب کے باوجود لیاری کے وہ بوڑھے جو سر شام اپنے پرانے ہم

جولیوں کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں، آپ سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آپ پڑھیں گے، لکھیں گے۔ پھر اپنے علم کی شمع سے ظلم و بربریت کے اندھیروں کا خاتمہ کریں گے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ آپ ہی لیاری کے ناگفتہ بہ حالات کو روایتی نہج پر لا سکتے ہیں۔ اس علاقے کو امن کا گہوارہ بنا سکتے ہیں۔ پچھلی حکومت نے آپ کے لیے جو تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں، ان سے بھرپور فائدہ اٹھایئے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ کی کوششوں سے آنے والی نسل کے ہاتھوں میں بندوق اور ٹی ٹی کی بجائے قلم اور کتاب ہو۔ مگر یہ سب کچھ آپ ہی کر سکتے ہیں۔۔۔ فقط آپ۔۔۔۔!

## ماما کا کارواں

سچ پوچھیے تو ماما کے کارواں کی بات ہی نرالی ہے ۔ اس کارواں میں سبھی ہیں ۔ معصوم بچے ہیں ، عورتیں ہیں ، شناخت سے بچنے کے لیے نقاب اوڑھے جوان ہیں ، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ 70 سالہ ماما بھی ہے ۔ ماما کا کارواں اس لحاظ سے بھی نرالا ہے کہ اس نے 400 میل کا سفر پیدل طے کیا ۔ 27 اکتوبر سے 22 نومبر تک کا یہ سفر ۔۔۔۔ کوئٹہ سے کراچی تک کا یہ سفر ۔۔۔ کتنا دشوار گزار تھا ، اس کا اندازہ ماما اور اس کے کارواں کے زخمی پاؤں سے لگایا جاسکتا ہے ۔ وہ زخم ، جو اس وقت تک نہیں بھریں گے ، جب تک ماما سمیت اس کے چھوٹے سے کارواں کے بچوں ، عورتوں اور جوانوں کو انصاف نہیں مل جاتا ۔ جب تک ملک کے سب سے بڑے صوبے کے باشندوں کو ان کے گم شدہ عزیز مل نہیں جاتے اور جب تک مسخ شدہ لاشوں کا سلسلہ ختم نہیں جاتا ۔ ماما ! آپ کے کارواں نے تو اگلی کئی صدیوں تک دل گداز ادب تحریر کرنے والوں کو غم آلود اور خوں چکاں موضوعات فراہم کر دیے ہیں ۔ یہ ادب آنے والی کئی نسلوں کو یہ شعور دیتا رہے گا کہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے آئینی اور قانونی طریقہ ہی اختیار کیا جائے ۔ چاہے 700 کلومیٹر پیدل ہی کیوں نہ چلنا پڑے ۔ چاہے سنگین چٹانوں کی تاب نہ لاتے ہوئے پاؤں زخمی ہی کیوں نہ ہو جائیں ۔

بیٹے کی مسخ شدہ لاش کا بوجھ اپنے غمزدہ دل اور مضبوط ارادوں پر اٹھائے ہوئے ماما کہتے ہیں: بلوچستان میں 23000 لاپتا افراد کے رجسٹرڈ کیسز ہیں۔ جن میں سے 14000 لوگ پچھلی قیادت کے دور میں لاپتا ہوئے۔ جون 2010 تک 730 لاپتا افراد کو گرفتار کرنے کے بعد قتل کیا جاچکا ہے۔ ماما کے کارواں میں شامل بی بی گل کہتی ہیں: انسانیت اور ایک بلوچ کے ناتے لانگ مارچ میں شرکت کا فیصلہ کیا ہے۔ کوئٹہ سے کراچی تک ہم نے کئی اذیتیں سہیں، راستے بھر میں یہ سوچتی رہی کہ جو لاپتہ ہیں ان کے لواحقین کیا سوچتے ہوں گے؟ جو سلوک مہذب معاشروں میں جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا ہمارے یہاں انسانوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ ماما کے کارواں کی فرزانہ مجید، جس کا بھائی 2009 سے لاپتا ہے، کہتی ہیں: میں خاموش نہیں رہوں گی، اگرچہ مجھے نظرانداز کردیا جائے یا قتل کردیا جائے۔ میں اس وقت تک اپنا احتجاج جاری رکھوں گی جب تک میرے بھائی سمیت تمام لاپتا افراد مل نہیں جاتے۔

ماما! ہم آپ کو اور آپ کے کارواں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آپ کو اور آپ کے کارواں کو ضرور انصاف ملے گا۔ یہ آپ کے جدو جہد ہی کی کاوش ہے کہ پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ میں آپ کے عزیزوں کی بازیابی کے قصے چل رہے ہیں۔ انشاء اللہ آپ کے گمشدہ عزیز آپ کو ضرور مل

جائیں گے اور ہم بھی وہ دن دیکھیں گے ، جب بلوچستان پاکستان کا سب سے پرامن صوبہ کہلائے گا۔ انشاء اللہ

## ریاض الدین اور ہمارا المیہ

امریکی جریدے نیوز ویک نے شکوہ کیا ہے کہ پاکستان کے جوہری پروگرام کا آغاز کرنے والے اور ایٹم بم کا ڈیزائن تیار کرنے والے ماہر طبیعات ریاض الدین رواں برس ستمبر میں 82 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ سائنس کی بین الاقوامی تنظیموں نے تو طبیعات کے شعبے میں ان کے کردار کی تعریف کی، لیکن پاکستان میں محض کچھ اخبارات میں چند سطروں کے سوا عمومی طور پر ان کے انتقال کا نوٹس نہیں لیا گیا۔

نیوز ویک کا یہ شکوہ بجا ہے۔ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ریاض الدین ایسے عظیم سائنسدان کی وفات کا علم ہمیں بھی 30 نومبر کو ہوا، اگرچہ ان کا انتقال 9 ستمبر کو ہو چکا تھا۔ بد قسمتی سے وطنِ عزیز میں ابتدا ہی سے اہلِ علم اور محسنوں کی خاطر خواہ قدر نہیں کی گئی۔ ہمارے کئی المیوں میں سے ایک افسوس ناک المیہ یہ بھی ہے۔وجہ "قحط العلم" ہے۔ جب علم ہی نہیں ہوگا تو علم والوں کی قدر کیوں کر کی جائے گی !!

طبعیات کے نامور نظری سائنس دان ریاض الدین 10 نومبر 1930 ء کو انڈیا کے شہر لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 1959 ء میں کیمبرج یونی ورسٹی (برطانیہ)

سے تھیوریٹکل پارٹیکل فزکس میں پی۔ایچ۔ڈی کی۔اپنی کارکردگی کے بل بوتے پرانھوں نے گولڈ میڈل، تمغہ امتیاز، ستارہِ امتیاز، ہلالِ امتیاز جیسے اعزازات بھی حاصل کیے۔انھوں نے سائنسی موضوعات پر 13 کتابیں بھی تصنیف کیں۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے وطنِ عزیز کے ایٹمی ہتھیاروں کے اولین نظری اور ریاضیاتی خدوخال وضع کیے۔ دیکھا جائے تو یہ ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ جس کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ایک استاد کی حیثیت سے بھی انھوں نے ملکی اور غیر ملکی درس گاہوں میں تعلیمی خدمات سرانجام دیں۔جن میں پنجاب یونی ورسٹی اور قائدِ اعظم یونی ورسٹی قابلِ ذکر ہیں۔ریاض الدین کے تذکرے میں نوبل انعام یافتہ پاکستانی سائنسدان ڈاکٹر عبد السلام کا ذکر نہ کرنا نا انصافی ہو گی۔ یہ ڈاکٹر عبد السلام ہی تھے، جنھوں نے ہر لمحے ریاض الدین کی رہنمائی کی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی "محسنوں کی بے توقیری" کی روش ترک کریں۔یہ جملہ ہم نے کئی بار سنا ہے کہ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں، لیکن ہم نے اس جملے پر نہ کبھی غور کیا اور نہ کبھی عمل کیا۔اگر یہ ہی ریاض الدین مغربی ہوتے تو کئی دنوں تک جگہ جگہ سے اظہارِ افسوس کی صدائیں بلند ہوتیں، اور ایک ہی سال میں ریاض الدین کے کام کے حوالے سے کئی مشن شروع ہو جاتے !!!

# ہمارا علمی انحطاط

ہمارے علمی انحطاط کا اندازہ درج ذیل چھوٹی چھوٹی خبروں سے لگایا جا سکتا ہے:

یونی ورسٹی میں طلبہ تنظیم کے لڑکوں نے دو استاذوں کو مار کر کمرے میں بند کر دیا۔

دوسری طرف ایک استاذ کی بے حسی بھی ملاحظہ ہو۔

ایک میڈیکل کالج میں پروفیسر صاحب نے نقاب اوڑھنے پر طالبہ کا نہ صرف مذاق اڑایا ، بلکہ اسے لات اور تھپڑ بھی دے ماری۔

ایک یونی ورسٹی میں ممتحن نے جب طلبہ کو نقل سے منع کیا تو جواباً توڑ پھوڑ شروع کر دی گئی۔

وزیرِ اعلا سندھ کے ضلع خیرپور کے ہائر اسکول میں صرف ایک صرف ایک استاذ متعین ہے۔ اسی ضلع میں 400 اسکول بند پڑے ہیں۔

سلسل غیر حاضری پر تعلقہ مٹھی 151 اساتذہ معطل کر دیے گئے۔

سکھر کے ایک اسکول میں سیوریج کا پانی جمع ہونے کی وجہ سے بچے متعدی امراض میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ والدین بچوں کو اسکول سے نکال رہے ہیں۔

یونیسکو کی ایک پرانی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں 7 ملین بچے اسکول نہیں جاتے ، جن میں سے 60 فیصد بچیاں ہیں۔

ایک اور رپورٹ کے مطابق پاکستان میں شرحِ تعلیم صرف 21 فیصد ہے۔ شرحِ خواندگی کے حوالے سے پاکستان 180 ویں نمبر پر ہے۔اس رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ 18 سے 24 سال کے تقریباً 72 فیصد افراد ناخواندہ ہیں۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں، ایک ایسی قوم جس کی پرورش کا آغاز "اقراء" جیسے خالص علمی اور الہامی لفظ سے ہوا تھا، آج کیوں علم سے اتنی دور ہے۔ علم کے حقیقی وارث تو ہم ہی ہیں کہ آج سے صدیوں پہلے اس کائنات کی سب سے کامل اور بزرگ ہستی نے اپنے چاہنے والوں کے ذہنوں میں علم کی تڑپ، جستجو اور ذوق پیدا کرنے کے لیے فرمایا تھا: علم مومن کی گم شدہ متاع ہے۔" پھر کیا ہی خوبصورت اور صنفی امتیازات سے بالاتر "ارشاد ہے: "علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کی ترقی کا راز صرف اور صرف علم ہی ہے، مشاہدہ کیجیے کہ انھوں نے صرف اور صرف علم کے بل بوتے پر نہ صرف ستاروں پر کمندیں ڈالی ہیں، بلکہ پاتال کے بھی کئی اسرار ہائے پنہاں آشکار کیے ہیں۔اور ہم ۔۔۔ ربِ العالمین کی تخلیق سماوات وارض پر غور و فکر کی دعوت کے باوجود نہ غور کرتے ہیں نہ فکر۔ بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہیں۔یاد رکھیے سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ احکم الحاکمین اس قوم کی حالت نہیں بدلتا ،

جو اپنی حالت خود بدلنے کی کوشش نہ کرے۔ اس "امتِ مرحومہ" تنزلی کی حقیقی وجوہات میں سے ایک وجہ "قحط العلم" بھی ہے۔ کیا ہی اچھی ہو کہ ہم۔۔ جو علم کے حقیقی امین ہیں کہ صدیوں پہلے سائنس کے سوتے ہماری دانش کدوں سے ہی پھوٹے تھے۔۔۔ علم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں، پھر دیکھیے، یہ نحس گھڑیاں کیسے تھمتی ہیں !!!

# اب گیس بھی نہیں ہے

بیرے کو چائے کا آرڈر دے کر میں اخبار پڑھنے میں لگ گیا۔ اخبار کیا تھا ! محض چند کٹی پھٹی لہوزدہ لاشوں اور کچھ کالی سرخیوں کا مجموعہ تھا۔ یہ لاشیں ۔۔ یہ کالی کالی سرخیاں تو میری نظروں سے روزانہ گزرتی ہیں، اس لیے مجھے ذرا بھی حیرت اور دکھ نہ ہوا۔ کافی دیر کے بعد بھی چائے نہ آئی تو میں نے اپنی آواز ذرا بلند کر کے کہا: بھائی چائے کہاں ہے؟

"یار گیس ہوگا تو چائے بنے گی۔ حکومت۔۔۔۔۔۔" حکومت سے متعلق چائے بنانے والے کے باقی فقرے 'قابلِ خال' ہیں۔ اس لیے میں انھیں سنسنر کیے دیتا ہوں۔ حکومت کے خلاف چائے بنانے والے کے برانگیختہ جملے سن کر میں سوچنے لگا۔ اس ملک میں کچھ بھی ہو، متاثر غریب ہوتا ہے۔ ڈالر مہنگا ہو جائے تو مہنگائی غریب کی قوتِ خرید ناکارہ کر دیتی ہے۔ فرقوں کے نام پر جلوس نکالے جائیں تو سب سے زیادہ متاثر غریب کا ٹھیلا ہوتا ہے۔ سیاسی اور مذہبی ٹارگٹ کلنگ کے بعد مخالف جماعت کے پر اشتعال جلوس میں بسیں جلا دی جائیں تو بے چارہ ڈرائیور اور کنڈیکٹر بے روزگار ہو جاتا ہے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجے تو سب سے پہلے غریب کو اپنی ریڑھی بند کرنی پڑتی ہے کہ وہ سب سے زیادہ غیر محفوظ

ہوتا ہے۔ اونچی اونچی دوکانوں والے تو شٹر نیچے کرکے اپنی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرلیتے ہیں، مگر غریب کہاں جائے ؟اسے مجبوراً اپنا ٹھیلا بند کرنا پڑتا ہے۔ شدید گرمی میں بجلی آنکھ مچولی کھیلے تو سب سے زیادہ متاثر غریب ہوتا ہے۔ کیوں کہ امیر تو متبادل طریقہ اختیار کرلیتا ہے۔ اور اختیار کرنے کی سکت بھی رکھتا ہے، مگر غریب کیا کرسکتا ہے؟ سوائے صبر کے کڑوے گھونٹ پینے کے! اور اب گیس نہیں ہے تو بھی سب سے زیادہ غریب ہی متاثر ہو رہا ہے۔

پانی اور بجلی کے وفاقی وزیر نے خوشخبری سنائی کہ قوم بجلی کے ساتھ ساتھ گیس کی لوڈشیڈنگ کے لیے بھی تیار رہے۔ شاید انھیں معلوم نہیں کہ عوام تیار ہی کیا، گیس کی لوڈشیڈنگ بھگت رہی ہے۔ پہلے خیال تھا کہ شاید یہ لوڈشیڈنگ صرف کراچی تک محدود ہے، لیکن ایک خبر سے معلوم ہوا کہ کوئٹہ میں لوگ تاریخی جنگلات کاٹ کاٹ کر کھانا بنارہے ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ کوئٹہ بلوچستان میں ہے، اور اسی صوبے سے سوئی کے مقام سے پہلی دفعہ گیس نکلی تھی۔ گیس کی لوڈشیڈنگ کیا ہوئی، پھل بیچنے والوں کے وارے نیارے ہوگئے۔ وہ خالی پیٹی جو پانچ روپے کی بھی مشکل سے بکتی ہے، اب 30 روپے کی بیچی جارہی ہے۔ بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ یعنی بادشاہ تو بادشاہ، عوام کا بھی جواب نہیں۔ پہلے جب چولھا جلتا تھا، تو گیس اپنے ہونے

کا یقین دلانے کے لیے ہلکی پھلکی آواز نکال لیتا تھا، پر اب وہ آواز سننے کے لیے لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں۔ جو سالن آدھے سے پونے گھنٹے میں پکتا تھا، اب چار گھنٹوں میں بھی بہ مشکل پکتا ہے۔ایک خبر کے مطابق صنعتوں اور سی این جی سیکٹر کی گیس بند کرنے کے باوجود گیس گھروں میں نہیں پہنچ رہی ۔ جس سے متعلقہ ادارے کی بد انتظامی کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ سردیاں نکتہ عروج پر پہنچ گئی ہیں، اور گیس نہیں ہے۔ یعنی متعلقہ حکام کی طرف سے ہمیں یہ تسلی کی جا رہی ہے کہ مہربانو! گرمی میں تو آپ نے بغیر پنکھے کے رہنا سیکھ لیا ہے، اب سردی میں بغیر گیزر کے رہنا بھی سیکھ لو!!

(اگر میری اس بذلہ سنجی سے کسی کی دل آزاری ہوئی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرے پیارے وطن کے تمام لوگوں کے گھروں کا گیس بحال ہو جائے۔)

# اتحاد۔۔۔ مسلم امہ کی سب سے بڑی ضرورت

وفاق وزیر برائے مذہبی امور سردار محمد یوسف کی زیرِ صدارت ہونے والی اتحاد بین المسلمین کانفرنس نے ایک تیرہ نکاتی اعلامیہ منظور کیا ہے۔ جس کے تحت فیصلہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد، محبت اور رواداری کے فروغ کے لیے ضابطہ اخلاق مرتب کیا جائے گا۔ علماء کی تقریروں اور تحریروں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان صلح، محبت، رواداری اور افہام و تفہیم کی فضا پیدا کر کے خلوصِ نیت سے اس پر عمل کیا جائے گا۔ دوسرے مسالک کا احترام کیا جائے گا۔ مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کی احترام اور حفاظت کو یقینی بنایا جائے گا۔ نیز اقلیتی فرقوں کے تحفظ اوران کے مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے انتظام کیا جائے گا۔ایسی مساعیِ جلیلہ کو عمل میں لایا جائے گا، جس سے عوام میں علماء اور مشائخ کا احترام بحال ہو۔ مسلکی تنازعات کو باہم مشوروں اور افہام و تفہیم کے اصولوں کی روشنی میں طے کیا جائے گا۔ پبلک پلیٹ فارم پر اپنے مخالفین کے خلاف طعن و تشنیع سے مکمل اجتناب کیا جائے گا۔امہات المومنین رضی اللہ عنھن، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اہلِ بیت اطہار رضی اللہ عنہم، اولیائے امت، تابعین و تبع تابعین اور تمام مسلمانوں کا احترام کیا جائے گا۔ دوسروں کے

حقوق کی پاسداری اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جائے گا۔

یہ تیرہ نکاتی اعلامیہ بلا شبہ قابلِ ستائش ہے۔ وطنِ عزیز میں روزانہ کی بنیاد پر فرقہ وارانہ ٹارگٹ کلنگ ہو رہی ہے۔ جسے ہر معتدل شخص قابلِ نفرین سمجھتا ہے۔ تعصب کی خزاؤں میں محبت کے پھول بہت جلد مرجھا جاتے ہیں۔ تعصب، چاہے وہ فرقہ واریت کی صورت میں ہو، لسانیت کی صورت میں ہو، قومیت کی صورت میں ہو یا کسی بھی صورت میں ہو، قابلِ مذمت ہے۔ کیوں کہ یہ کسی بھی قوم کو دیمک کی طرح اندر ہی اندر سے چٹ کر جاتا ہے۔ پھر وہ قوم دیگر اقوام کے لیے تختۂ مشق بن جاتی ہے۔ مگر بد قسمتی سے ہم آج یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کل جب دشمن ہم پر حملہ کرے گا تو وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ ہم کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ صرف "ہمارا" دشمن ہوگا۔ پھر ہم ایک کیوں نہیں ہوتے ؟

اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ امتِ مسلمہ کے زوال کا سب سے بڑا سبب کیا ہے تو میرا جواب ہوگا : نا اتفاقی۔ جی ہاں ، ہمارا سب سے بڑا مسئلہ نا اتفاقی ہی ہے۔ ہم کسی ایشو پر ایک نہیں ہوتے ۔ پھر روتے ہیں کہ ہماری حالت کیوں نہیں بدلتی۔ دوسری طرف ہمارا دین اتحاد و اتفاق کا سب سے بڑا داعی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنی ساعدہ کے دن فرمایا تھا: "یہ بات

تو کسی طرح بھی درست نہیں ہے کہ مسلمانوں کے دو امیر ہوں، کیوں کہ جب کبھی ایسا ہوگا تو ان کے احکام و معاملات میں اختلاف رونما ہو جائے گا۔ان کی جماعت تفرقہ کی شکار ہو جائے گی اور ان کے درمیان جھگڑے پیدا ہو جائیں گے۔" پہلے خلافت ہوتی تھی تو کچھ کچھ مسلمانوں کی مرکزیت کا بھرم قائم رہتا تھا۔اب تو وہ بھی نہیں ہے۔قرآن مجید کی ایک آیت کا ترجمہ ملحوظ ہو: "بے شک جو لوگ دین کو فرقوں (ٹکڑوں) میں کرتے ہیں اور (مختلف) گروہ ہو جاتے ہیں،آپ ﷺ کا ان سے کسی چیز میں کچھ تعلق نہیں ہے۔ان کا معاملہ صرف اللہ کی طرف ہے۔پھر وہ (اللہ)ان کو (واضح طور پر) بتائے گا،اس بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے۔(الانعام،آیت 159)

باتیں اور بھی بہت سی ہیں، لیکن اس کالم کا دامن بہت چھوٹا ہے۔بس آخر میں یہ تیرہ نکاتی اعلامیہ پیش کرنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ اس کو عملی طور پر نافذ کرنے کی کوشش کریں کہ ہم میں فرقہ وارانہ تعصب جھیلنے کی مزید ہمت نہیں ہے۔

# ترے حسنِ خلق کی اک رمق۔۔۔۔

آج 10 ربیع الاول ہے۔ کل 11 اور پرسوں 12 ربیع الاول ۔ نعتوں کے مسحور کن بول ابھی سے سماعتوں میں رس گھولنے لگے ہیں ۔ عاشقانِ مصطفیٰ ﷺ بہ دل و جاں آقا علیہ السلام کی بارگاہِ اقدس میں نذرانہِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ کیوں نہ کریں کہ دنیا کی سب سے عظیم ترین ہستی کی ولادت باسعادت کے دن کی آمد آمد ہے
۔ اگرچہ ہر عاشق محمد الرسول اللہ ﷺ کی شان میں گل ہائے رنگا رنگ پیش کر رہا ہے ۔ مگر "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" کے مثل کوئی بھی آقا علیہ السلام کی شان کلی طور پر تا قیامت بیان کرنے سے قاصر رہے گا۔ یہ ہی میرا ایمان اور میرا عقیدہ ہے ۔ اس لیے کہ ربِ کریم نے صدیوں پہلے "ورفعنا لک ذکرک" فرما کر آقا علیہ السلام کی شان کو اتنا بلند اور اتنا ارفع کر دیا کہ عام انسان اور عاشق کی رسائی آپ ﷺ کی شانِ اقدس کی رفعت تک محال ہے ۔
مگر آج میں ڈیڑھ کروڑ سے زائد مسلمانوں میں آقا علیہ السلام کی پاکیزہ اور تا قیامت قابلِ عمل سیرتِ طیبہ کی ایک چھوٹی سی جھلک بھی نہیں دیکھ پاتا۔ سوچتا ہوں کہ ہمیں تو ہمارے آقا علیہ السلام نے ایک بہترین نظامِ حیات عطا فرمایا تھا۔ مگر ہم نے تو سب کچھ فراموش کر دیا۔ حیف ہے ہم پر کہ ہم اپنی بے

نور زندگیوں میں آقا کے پور نور اسوہِ حسنہ سے ذرا بھی نور نہ لے سکے۔ پھر ہی روتے ہیں کہ ہم دنیا کی پسماندہ قوم ہیں۔ کوئی پرسان حال نہیں ہے ہمارا۔ یقین کیجیے کہ اگر آج ہی ہم اس طرح ہو جائیں کہ ہمیں دیکھ کر لوگ کہیں : "امتی ایسا ہے تو نبی کیسا ہوگا۔" تو ہم دنیا کی سب سے بہترین قوم بن جائیں گے۔ لیکن ہم آقا علیہ السلام کے اسوہِ حسنہ کو اپنے لیے کیوں کر مشعلِ راہ بنا سکتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمیں "قدامت پرست" کہیں۔ اگر ہماری یہی سوچ رہی تو جان لیجیے کہ ہم کبھی بھی ۔۔۔ہاں کبھی بھی اس دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے۔

ذرا آقا علیہ السلام کی تعلیمات ملاحظہ ہوں۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آقا علیہ السلام نے مجھے آخری نصیحت یہ فرمائی تھی: "اپنے اخلاق کو لوگوں کے لیے اچھا بناؤ۔"

وہ حدیثِ مبارکہ تو ہم اکثر پڑھتے رہتے ہیں جس میں آقا علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تھا: "میں اچھے اخلاق کو مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔" آج ہم اخلاقیات کے کون سے معیار پر ہیں، وہ سبھی جانتے ہیں۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔

یہ حدیثِ مبارکہ بھی ہم اکثر سنتے ہیں۔"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہ چیز پسند نہ کرے، جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔" اس حدیث کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی کردار کا ذرا محاسبہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہم تو خطرناک حد تک خود غرضی میں مبتلا ہیں۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کون سے مسلمان کا اسلام افضل ہے؟ ارشاد فرمایا: جس (مسلمان) کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔" اور آج۔۔۔بد) قسمتی سے نہ ہماری زبانوں سے ہمارے اپنے بھائی محفوظ ہیں، نہ ہمارے ہاتھوں سے!!

عصبیت کے مفہوم کے ضمن میں آقا علیہ السلام نے فرمایا: "اپنی قوم سے محبت عصبیت نہیں ہے، بلکہ عصبیت یہ ہے کہ قوم کے ناحق پر ہونے کے باوجود آدمی اپنی قوم کی مدد کرے۔"

قارئین، آپ میرا یہ مضمون پڑھتے ہوئے اندازہ لگائیں گے کہ میں نے وہ احادیث تحریر کی ہیں، جو ہم میں سے اکثر لوگ یا تو جانتے ہیں یا پڑھ چکے ہیں۔ یہ احادیث تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم جانتے ہوئے بھی آقا علیہ

اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہیں۔کیا ہی اچھا ہو کہ اس بارہ ربیع الاول سے ہم
آقا علیہ السلام کی ایک ۔۔ صرف ایک سنت پر عمل پیرا ہو جائیں۔کیا ہم اپنے پیارے
آقا علیہ السلام کے لیے اتنا کچھ بھی نہیں کر سکتے ؟؟

## مسلمانوں کو درپیش میڈیائی چیلنجز

کچھ عرصہ پہلے ایک ٹاک شو سنا۔ اس ٹاک شو میں میزبان نے جب ایک معروف دینی عالم سے مسلم امہ کے سب سے بڑے مسئلے کی بابت دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ میڈیا ہے۔ مجھے اس وقت بڑی حیرت ہوئی۔ کیوں کہ میں اس وقت بھی اور اب بھی نااتفاقی کو مسلم دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھتا ہوں ۔تاہم کافی غور و خوض اور پڑھنے کے بعد میں ان عالمِ دین کے خیال سے کافی حد تک متفق ہوگیا۔اب میں اس بات کا قائل ہوگیا ہوں کہ "میڈیا" مسلمانوں کے بڑے مسائل میں سے ایک ہے۔

2004 ء میں جب فلسطین کے سابق صدر یاسر عرفات کا انتقال ہوا تھا تو اس کی خبر سب سے پہلے فرانسیسی خبر رساں ایجنسی اے۔ایف۔ پی ۔ نے نشر کی تھی ۔ پھر مسلم دنیا کی سبھی خبر رساں ایجنسیوں نے اسی ادارے سے یہ خبر مستعار لے کر نشر اور شائع کی تھی ۔ یہ کتنی قابلِ افسوس بات ہے ۔ اتنے بڑے مسلم رہنما کی خبر بھی ہماری کوئی ایجنسی سب سے پہلے شائع کرنے سے قاصر رہی ۔ مجھے اس بات پر بہت دکھ ہوتا ہے کہ مسلم دنیا کا پورا میڈیا یو ٹیوب پر اپ لوڈ ہونے والی ایک پندرہ منٹ کی کلپ "انوسنٹ آف مسلمز" کا جواب نہیں دے سکا۔ ہمارے میڈیا

کی کمزوری کا اندازہ اسی امر سے لگایا جا سکتا ہے۔
میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے کہ مسلم دنیا کا کوئی چینل سی این این، بی بی سی، فاکس نیوز وغیرہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایسا کیوں ہے کہ مسلم دنیا کا کوئی روزنامہ واشنگٹن پوسٹ، نیویارک ٹائمز، ڈیلی میل وغیرہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایسا کیوں ہے کہ پوری مسلم دنیا میں گوگل، یوٹیوب، فیس بک اور ٹوئٹر کے پائے کی ایک ویب سائٹ بھی نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ مسلم دنیا کا کوئی میگزین ریڈرز ڈائجسٹ، نیشنل جغرافک پیپل وغیرہ جیسے میگزینوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہماری کوئی بھی، ڈاکیومنٹری بی بی سی، نیشنل جغرافک اور سی این این کی ڈاکیومنٹریز کے پائے کی نہیں ہوتی۔ ہمارا میڈیا مغربی میڈیا کے ہاتھوں کس حد تک مسخر ہو چکا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے اخبار، ہمارے میڈیا چینلز، ہماری خبر رساں ایجنسیاں، ہمارے صحافیوں کے مضامین، تجزیے اور کالم وغیرہ جا بجا مغربی خبر رساں ایجنسیوں کی خبروں اور تجزیوں سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔
مسلم میڈیا کی کمزوری کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت سے نقصانات اٹھانے پڑے ہیں اور اٹھانے پڑ رہے ہیں۔ میڈیا کی کمزوری کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ

مسلمانوں کا امیج پوری دنیا میں بہت خراب ہو چکا ہے، کیوں کہ اکیسویں صدی کا میڈیا اتنا مضبوط ہو چکا ہے کہ وہ جس کو ہیرو بناتا ہے، وہ ہیرو بن جاتا ہے، اور جس کو زیرو بناتا ہے، وہ زیرو بن جاتا ہے۔ 11/9 کے بعد مغربی میڈیا نے مسلمانوں کی جو تصویر دنیا کے سامنے پیش کی اس کا خمیازہ آج اتنے سال گزرنے کے باوجود پوری مسلم دنیا سہہ رہی ہے۔ 11/9 کے بعد مسلمانوں کو دہشت گرد اور انتہا پسند کہا گیا۔ جس سے پوری دنیا میں مسلمانوں کی عزت بری طرح مجروح ہوئی۔ حالاں کہ جنگ جو لوگ ہر قوم میں موجود ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں برما کے ان لوگوں کو دیکھ جا سکتا ہے، جنھوں نے کچھ عرصہ پہلے روہنگیا مسلمانوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے تھے۔ یا پھر تامل ٹائیگرز کی مثال بھی لی جا سکتی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم دنیا، جتنا ہو سکے، اپنے میڈیا کو مضبوط کرے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ مسلم دنیا کا میڈیا اتنا مضبوط ہو کہ "کون ہیرو اور کون زیرو" کی باگ ڈور ہی مسلم میڈیا کے ہاتھوں میں آجائے۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو کم از کم ہمارا میڈیا اتنا مضبوط ہو کہ ہم اینٹ کا جواب اینٹ سے تو دے سکیں۔ یعنی جہاں ہماری کردار کشی ہو، جہاں ہمارے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کا بازار گرم کیا جائے، وہاں ہمارا میڈیا اپنی طاقت کے بل بوتے پر اس رائے عامہ کو ہی بدل دے کہ ہم ایسے نہیں ہیں، جس طرح ہمارے خلاف

پر پیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ کیا دنیا کی دوسری بڑی قوم کے لیے یہ بھی ناممکن ہے ؟؟

## ذریعۂ تعلیم ، اردو کیوں؟

وطنِ عزیز میں آج کل ایک گرما گرم بحث چل رہی ہے۔ موضوعِ بحث یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی ہونا چاہیے یا اردو۔ اس سلسلے میں مختلف لوگ مختلف آراء دے رہے ہیں۔ بعض لوگ اردو کے حامی ہیں تو بعض انگریزی کے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم اردو ہونا چاہیے۔ ذریعۂ تعلیم اردو ہونے کے درج ذیل فائدے ہوں گے۔

1. یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کا ایک عام طالبِ علم جس طرح اردو سمجھتا ہے، انگریزی نہیں سمجھتا۔ اگر آپ کو میری اس بات پر یقین نہ آئے تو آپ کسی بھی عام اسکول میں چلے جایئے۔ وہاں کسی متوسط درجے کے طالبِ علم سے کسی دقیق مضمون کی دو چار سطریں اردو میں پڑھوایئے۔ پھر اس کو ان سطروں کا مفہوم سمجھانے کا کہیے۔ پھر اسی طالبِ علم سے کسی دوسرے مضمون کی دو چار سطریں انگریزی میں پڑھوا کر ان سطروں کا مفہوم پوچھیے۔ آپ مشاہدہ کریں گے کہ طالبِ علم نے جو سطریں اردو میں پڑھی ہوں گی وہ اسے انگریزی میں پڑھی گئیں سطروں سے زیادہ سمجھ آئی ہوں گی۔ اس مشاہدے سے آپ یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کر لیں گے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے پاکستانی طالبِ علم کے سمجھنے کی صلاحیت میں کافی حد تک اضافہ ہو جائے گا۔

2 ۔اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے یک ساں نظامِ تعلیم وضع کرنے میں کافی حد تک مدد ملے گی۔یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ پاکستان کو یک ساں نظامِ تعلیم کی کتنی ضرورت ہے ۔پاکستان کے ترقی نہ کرنے کی بڑی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں یک ساں نظامِ تعلیم نہیں ہے۔

3 ۔اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے کم از کم ملکی سطح پر اردو کو فروغ ملے گا۔یوں اردو کی ترویج و اشاعت میں اضافہ ہوگا۔اردو سے محبت کرنے والے اس بات سے بہ خوبی واقف ہیں کہ پاکستان ۔۔۔جس کی قومی زبان اردو ہے۔۔۔ میں اردو کے فروغ، ترویج اور اشاعت کی کتنی ضرورت ہے۔

4 ۔جو طالبِ علم آج غالب واقبال کی ادق شاعری سمجھنے سے قاصر ہے، اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے وہ اس کو سمجھنے لگے گا۔یوں بڑے لوگوں کی بڑی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت اس کے شعور و آگاہی میں اضافہ کر دے گی۔یاد رکھیے کہ تعلیم کا دوسرا نام شعور و آگاہی ہے۔

لیکن ان تمام فوائد کے باوجود انگریزی کی اپنی اہمیت ہے۔انگریزی دنیا کے تقریباً ہر ملک میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔یہ واقعی ایک بین الاقوامی زبان

ہے۔میڈیا کے بیشتر حصہ انگریزی سے بھرا ہوا ہے۔اس لیے جہاں حکومتِ پاکستان اردو کو ذریعہِ تعلیم بنانے کی کوشش کرے، وہاں انگریزی کی تعلیم کو بھی پرائمری سے لے کر ماسٹرز کی سطح تک جدید سے جدید تر اور معیاری بنائے،تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ اردو کو ذریعہِ تعلیم بنانے کی وجہ سے پاکستانی طالبِ علم انگریزی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔

# قابلیت کی کوئی کمی نہیں

پچھلے دنوں محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اقراء یونی ورسٹی کے 14 ویں کانووکیشن کے موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جب ایٹمی سائنسدان کہوٹہ میں جوہری منصوبے پر کام کر رہے تھے تو اس پروجیکٹ میں کام کرنے والوں میں وہ جذبہ تھا جو جذبہ قیام پاکستان کی جدوجہد کرنے والی قیادت میں تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ دنیا کے تین چار ترقی یافتہ کام کرنے والے ممالک میں جو کام وہاں کے سائنسدان بیس سال میں پورا کرتے ہیں وہ کام ہم نے چند برسوں میں کر دکھایا۔ ہمارے پروجیکٹ میں کوئی غیر ملکی سائنسدان نہیں تھا، بلکہ ہمارے پروجیکٹ میں کراچی، لاہور، پشاور اور دیگر شہروں کے تمام سائنسدان کام کر رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے اور بھی بہت سی قیمتی باتوں سے سامعین کو مستفید کیا۔ ان کی درج بالا تمام باتیں قیمتی ہیں۔ لیکن ان کی بہت زیادہ قیمتی اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کہوٹہ پروجیکٹ میں کوئی غیر ملکی سائنس دان نہیں تھا۔ گویا انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی پاکستان میں قابلیت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔

ہمارا ملک قابل لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں

کے بڑے لوگوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے طلبا و طالبات بھی بہت قابل ہیں۔ پچھلے دنوں ایک خبر جو اخبارت کی زینت بنی، وہ یہ تھی کہ پاکستان کے ایک نو سالہ طالبِ علم حارث نے کیمبرج یونی ورسٹی کے "او" لیول کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔ واضح رہے کہ یہ دنیا کا واحد لڑکا ہے، جس نے صرف 9 سال کی عمر میں سائنس کے تمام مضامین میں کامیابی حاصل کی۔ ایک اور خبر جو اسی ویب سائٹ (ہماری ویب) کی وساطت سے بی بی سی اردو کے حوالے سے پڑھنے کو ملی، وہ یہ تھی کہ پاکستان کے ایک اکیس سالہ میڈیکل کے طالبِ علم عمر انور کو ورلڈ اکنامک فورم میں پہنچ کر عالمی ایجنڈا طے کرنے کا موقع ملا ہے۔ بی بی سی اردو نے اس نوجوان کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کی ہے: " عام طور پر ورلڈ اکنامک فورم کے دروازے سب کے لیے آسانی سے نہیں کھلتے۔ عمر نے نہ صرف اس دروازے کو وا کیا بلکہ اس فورم کے مخصوص فورم "گلوبل شیپر" یعنی دنیا کو نئی شکل و سمت عطا کرنے والے لوگوں میں بھی شامل ہو گئے۔ واضح رہے کہ اس میں دنیا کے بہترین 50 نوجوان تیز ذہنوں کو شامل کیا جاتا ہے۔"پاکستان کے ایک اور طالبِ علم ہارون طارق نے کچھ ہفتوں پہلے "او" لیول اور "اے" لیول کے امتحانات میں 47 نمبر لے کر عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ پھر وہ پاکستانی طالبِ علم بھی کسی کو نہیں بھولا، جس نے گھریلو چیزوں کی مدد سے ایک چھوٹا سا "ایف۔ 16 " ایجاد" کر ڈالا۔ پاکستان کے ایک اور 13 سالہ ہونہار طالبِ علم نے موسیٰ فیروز" نے آسٹریلیا کی طرف ہونے والے آن لائن عالمی

ریاضی مقابلے میں پہلی پوزیشن لے کر ثابت کر دیا کہ "ہم بھی کسی سے کم نہیں۔" پھر وہ ارفع کریم کس کو بھولی ہے جس نے 2004ء میں صرف نو سال کی عمر میں "مائیکرو سافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل" بن کر سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ چند مہینوں قبل لاہور کے چند طلبا نے "گروپکٹ" کے نام سے موبائل کی ایک ایسی ایپلیکیشن ایجاد کی تھی، جس کے ذریعے کسی گروپ کی تصویر میں فوٹو گرافر اپنی تصویر بھی لگا سکتا تھا۔ پاکستان کے ایک نامور سپوت ڈاکٹر عطاء الرحمان سے بھلا کون واقف نہیں ہے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ 79 طلباء ان کی زیرِ نگرانی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی 124 کتب اور سائنسی جرائد میں 713 تحقیقی اشاعتیں قابلِ ذکر ہیں۔ یوں ان سے نہ صرف پاکستانی طلباء، بلکہ غیر ملکی تشنگانِ علم بھی سیراب ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات سن کر بھی آپ کو حیرت ہوگی کہ پرسنل کمپیوٹر کا سب سے پہلا وائرس برین ہے، جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اسے ایجاد کرنے والے دو پاکستانی تھے، جن کی لاہور میں سوفٹ ویئر کی چھوٹی سی دوکان تھی۔ انھوں نے یہ کارنامہ 1986ء میں سرانجام دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی باشندوں کی قابلیت کا زمانہ معترف ہے۔ یہ کتنی انوکھی بات ہے کہ ایک ایسے ملک، جس کی شرح خواندگی پر نہ صرف غیروں کو، بلکہ اپنوں کو بھی تحفظات ہیں، میں ہونہار طلباء فقط اپنے بل بوتے پر ایسے

کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر پاکستان کا معیارِ تعلیم بلند ہو جائے، قابل طلباء و طالبات کی سرکاری سطح پر حوصلہ افزائی کی جائے، اگر وہ ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو ان کو بھرپور مالی مدد فراہم کی جائے تو عجب نہیں کہ ہم سائنس اور آئی ٹی کے میدانوں میں مغرب سے بھی آگے نکل جائیں۔ پتا نہیں میری یہ سوچ کب عملی جامہ پہنے گی۔ ایک شخص نے بڑی اچھی بات کہی کہ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ یہاں جو قابل ہیں، ان کے پاس اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لیے سرمایا نہیں ہے، اور جن کے پاس سرمایہ ہے، وہ قابل نہیں ہیں۔

# نقل اور اس کا سدِ باب

خبر ہے کہ دورانِ امتحانات ،بڑھتی ہوئی نقل اور کاپی کلچر کے رجحان کے خلاف پبلک اسکول سکھر کے طلبہ نے احتجاجی ریلی نکالی ۔کاپی کلچر کے خلاف نکالی جانے والی اس ریلی میں بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات نے شرکت کی ۔ریل کے شرکاء نے ہاتھوں میں پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے، جن پر کاپی کلچر اور نقل مافیا کے خلاف نعرے درج تھے۔پبلک اسکول سکھر سے نکالی جانے والی ریلی کے شرکاء کمشنر آفس پہنچے ،جہاں انھوں نے نقل کے خاتمے کے لیے نعرے بازی کی ۔ان کا کہنا تھا کہ کاپی کلچر معاشرے میں تیزی سے پھیلتا ہوا ناسور ہے اور نقل کا یہ رجحان ، قابلیت اور تعلیم کو تیزی سے تباہ و برباد کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ نقل کلچر نوجوانوں کے مستقبل اور ملک کی خوش حالی اور ترقی کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے ۔ملک کی نظریاتی ، معاشی اور معاشرتی سرحدیں کھوکھلی ہوتی جارہی ہیں ، جس کی مثال اس طرح لی جاسکتی ہے کہ سی ایس ایس جیسے انتہائی ضروری مقابلے کے امتحان میں ہزاروں امیدواروں کے مقابلے میں صرف چند سو امیدوار بھی کام یاب نہیں ہوتے ۔ہمارے ملک میں تعلیم کے عدم فروغ کی وجہ سے بے روزگاری ، اغوا برائے تاوان ، چوری ، ڈکیتی اور دہشت گردی جیسے گھمبیر مسائل تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں ۔اس لیے حکومت اور وزارتِ

تعلیم نئی نسل کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے نقل کے رجحان کو ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کرے۔ کاپی کلچر کو ختم کرنے کے لیے انقلابی اقدامات کیے جائیں اور نقل کے رجحان کو جرم قرار دیتے ہوئے اسمبلی میں قانون سازی کی جائے اور اس پر عمل درآمد کو یقین بنایا جائے۔

پیچھے جادنوں سندھ کے سینیئر وزیر برائے تعلیم و خواندگی نثار احمد کھوڑو نے سندھ اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سندھ میں کاپی کلچر پر ہمیں طعنے ملتے ہیں۔ ہماری ڈگریوں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور ہمارے نوجوانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ سندھ سے کاپی کلچر کا خاتمہ کریں گے۔ میں اساتذہ اور طلباء سے کہتا ہوں کہ وہ امتحان کی تیاری کریں۔ ہم نقل کو روکنے کے لیے ہر اقدام کریں گے۔

یہ حقیقت ہے کہ نقل کلچر ہماری تعلیمی پسماندگی کی ایک بہت بڑی وجہ ہے، جس کا تدارک بہت ضروری ہے۔ سکھر کے طلبہ و طالبات نے جن خدشات کا اظہار کیا، وہ بالکل درست ہیں۔ جب تک نقل کے فروغ کی سرکاری سطح پر حوصلہ شکنی نہیں کی جائے گی، ہم تعلیمی میدان میں پسماندہ ہی رہیں گے۔ اجتماعی سطح پر ہمارے طلبہ و طالبات میں وہ تخلیقی اور شعوری صلاحیتیں پیدا نہیں ہو سکیں گے، جو انھیں دنیا بھر میں ممتاز و فائق کر سکیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ

بالکل درست ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی نقل ہے، جس کے بل بوتے پر یہ نوجوان ڈگریوں پر ڈگریاں تو لیتے جاتے ہیں، مگر اپنی نہاں صلاحیتوں کو ابھار نہیں پاتے۔ پھر اسی قابلیت اور صلاحیت کی کمی کی وجہ سے کسی اچھی نوکری کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔

نقل کے سد باب کے لیے اگر درج ذیل چند تجاویز بروئے کار لائی جائیں تو بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔

1۔ سال کے ابتدا میں ہی سرکاری سطح پر یہ اعلان کر دیا جائے کہ اس دفعہ جو اسٹوڈنٹ کسی بھی ذریعے سے (مثلاً موبائل، کاپی یا کسی اور ذریعے سے) نقل کرتے ہوئے پکڑا جائے گا، اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے سے بالکل گریز نہیں کیا جائے گا۔ (مجھے باقی صوبوں کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ وہاں نقل کی کیا سزا ہے، لیکن سندھ میں نقل کی سزا یہ ہے کہ امیدوار تین سال تک امتحان میں شریک نہیں ہو سکتا۔)

2۔ تمام اسکولوں اور کالجوں کے پرنسپل، ہیڈ ماسٹر وغیرہ کو سال کی ابتدا میں ہی محکمۂ تعلیم کی جانب سے نوٹس بھیج دیا جائے کہ وہ اپنے شاگردوں کی پڑھائی پر خصوصی توجہ دیں اور انھیں امتحانات کے دوران نقل نہ کرنے کی تنبیہ کریں، تاکہ وہ قانونی کارروائی اور سزا سے بچ سکیں۔

۔ امتحانی مراکز میں سوائے امید واروں ، نگرانوں اور متعلقہ حکام کے کسی کو اندر 3 جانے کی اجازت نہ دی جائے ۔ ( میں نے بار ہا دیکھا ہے کہ امیدواروں کے رشتہ دار اور دوست وغیرہ امتحانی مراکز میں بے باکی سے داخل ہو جاتے ہیں اور امید واروں کو نقل فراہم کرتے ہیں ۔ اکثر اوقات نگران کو ڈرا دھمکا کر کلاس سے ہی نکال دیتے ہیں (! ۔ یہ کتنے فسوس کی بات ہے

۔ چھوٹے چھوٹے جیبی سائز کی حل شدہ کتابوں پر پابندی عائد کی جائے ۔ (برائے 4 مہربانی ان کتابوں کے شائع کرنے والے ناراض نہ ہوں ، کیوں کہ یہ حل شدہ جیبی سائز کی کتابیں نہ صرف طلباء کو نقل فراہم کرنے میں آسانیاں فراہم کرتے ہیں ، بلکہ ( ان کی وجہ سے طلباء نصاب کی اصل کتاب بھی نہیں پڑھتے ۔

۔ آخر میں سب سے اہم بات یہ کہ نقل کے سدباب کے قانون پر عمل ضرور کیا جائے 5 (۔ (ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ یہاں قانون تو بن جاتے ہیں ، لیکن عمل نہیں کیا جاتا ۔ نقل کے سدباب کے لیے ماہرینِ تعلیم کے ذہنوں میں اور بھی بہت سی تراکیب و

تجاویز ہوں گی۔جس کی روشنی میں ایسے مؤثر قوانین وضع کیے جا سکتے ہیں، جن کی مدد سے نقل کا مکمل طور پر خاتمہ کیا جاسکے۔وطنِ عزیز میں معیاری تعلیم کے احیا کے لیے سرکاری سطح پر انقلابی اور سخت اقدام اٹھانا ناگزیر ہو چکا ہے۔

## امریکا کے حاتم طائی

ایک امریکی پندرہ روزہ اخبار کرانیکل آف فیلینن تھراپی نے 2013 ء کے دوران سب سے زیادہ چندہ دینے والی امریکا کی 50 شخصیات کی فہرست تیار کی ہے۔ان 50 شخصیات نے تقریبا 7۔7 بلین کا چندہ دیا ہے۔کالم کے دامن اور اپنے قارئین کے قیمتی وقت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے میں صرف مذکورہ اخبار کی رپورٹ میں شامل ابتدائی پانچ شخصیات کے بارے میں لکھوں گا۔اس اخبار کے مطابق فیس بک کے بانی مارک زکرسرگ اور ان کی اہلیہ پرسیلا چین نے 2013 ء میں امریکا میں سب سے زیادہ خیرات دی ہے۔انھوں نے فیس بک کے اٹھارہ ملین حصص چندے میں دیے۔ جن کی مالیت تقریبا 992 ملین ڈالر ہوتی ہے۔انھوں نے یہ رقم سلیکون ویلی کمیونٹی فاؤنڈیشن کو دی ہے۔واضح رہے کہ اس جوڑے نے 2012 ء میں بھی اتنی ہی رقم دی تھی۔ دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ چندہ جارج مچل نے دیا۔انھوں نے تقریبا 750 ملین ڈالر چندے میں دیے۔ تیسرے نمبر پر سب سے زیادہ چندہ فلپ نائٹ اور ان کی اہلیہ نے دیا ہے۔انھوں نے تقریبا 500 ملین ڈالر چندے میں دیے۔ انھوں نے یہ رقم آرگن ہیلتھ اینڈ سائنس یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کو دی ہے۔چوتھے نمبر پر سب سے زیادہ رقم دینے والے مائیکل بلومبرگ ہیں۔انھوں نے 452 ڈالر عطیہ کیے ہیں۔انھوں نے یہ رقم

آرٹس، تعلیم، ماحول اور عوامی صحت وغیرہ جیسے میدانوں میں خرچ کی ہے۔پانچویں نمبر پر سب سے زیادہ چندہ جان اور ان کی اہلیہ لارا ارنلڈ نے دیا ہے۔اس جوڑے نے تقریبا 269 ملین ڈالر چندے میں دیے ہیں۔

خیرات یا چندہ دینا ایک بہت ہی اچھا عمل ہے۔اس سے معاشرے میں پھیلی غربت کے خاتمے میں مدد ملتی ہے۔پھر اسلام میں تو صاحبِ ثروت لوگوں پر زکوۃ فرض کردی گئی ہے۔پاکستان میں غربت کس طرح بڑھ رہی ہے، اس کا اندازہ صرف ان بھیک مانگنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافے سے لگایا جا سکتا ہے، جو خصوصا مساجد کے دروازوں پر اور عموما گلیوں گلیوں گھوم پھر کر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں، پہلے صرف معذور لوگ ہی بھیک مانگتے نظر آتے تھے۔لیکن اب تو اچھے خاصے "جینٹل مین" قسم کے لوگ بھی ہاتھ پھیلائے نظر آتے ہیں۔پہلے شاید ہی کسی نے "باپردہ" فقیرنی دیکھی ہوگی۔اب آپ روزانہ ان کا بھی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔یہاں اگرچہ اس حقیقت کا کلیاتی طور پر انکار عبث ہے کہ کچھ لوگ عادت سے مجبور ہو کر اور اپنی فطری کاہلی کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں، لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر شخص کو عزت پیاری ہوتی ہے۔مہذب اور غیرت مند شخص کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ اس پر بھیک مانگنے کی وجہ سے فقرے کسے جائیں۔کوئی مہذب خاتون یہ نہیں چاہے گی کہ وہ گلیوں گلیوں گھوم کر، بھیک مانگ کر اپنے بچوں کی روٹی روزی کا بندوبست کرسکے۔ان فقیروں میں

سے اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے۔جو غربت کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں یا بے روز گاری کے ترسے ہوئے ہوتے ہیں۔

ایسے موقع پر جب کہ وطنِ عزیز کی غربت میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہاہے، ہمارے ملک کے امیر لوگوں پر اس بات کی بڑی بھاری زمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بہ نظرِ غائر اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں اور بلا دریغ غریبوں پر خرچ کریں۔ وہ زکٰوۃ کے ساتھ ساتھ خیرات، صدقات اور عطیات کو بھی یقینی بنائیں۔یاد رکھیے کہ راہِ خدا میں دینے سے دولت بڑھتی ہے، نہ کہ کم ہوتی ہے۔سورۃ البقرۃ کی آیت 261 میں ارشادِ خداوندی ہے :

" جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان (کے مال) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بال میں سو دانے ہوں، اور خدا جس (کے مال) کو چاہتا ہے، زیادہ کرتا ہے وہ بڑی کشائش والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔"

یہ بات لائقِ تحسین ہے کہ وطنِ عزیز میں ایسی شخصیات بھی رہائش پزیر ہیں، جنھوں نے دکھی انسانیت کی خدمت کو وظیفہِ حیات بنا رکھا ہے۔تاہم اس کام کو وسیع پیانے پر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔اتنا وسیع پیانے پر کہ ہمارے پیارے ملک میں ایک بھیک مانگنے والا بھی نہ رہے! میرے خیال میں

ہمارے ملک کے امیر طبقے کے لیے یہ کام مشکل نہیں ہوگا۔

## ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

پچھلے دنوں سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ سلمان بن عبد العزیز نے پاکستان کا بھر پور دورہ کیا۔ پیر کو ان کے دورے کے اختتام پر ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا، جس میں ایک طرف دفاع، توانائی، تجارت، سرمایہ کاری اور زراعت کے شعبوں میں تعاون بڑھانے پر اتفاق کیا گیا تو دوسری طرف ،مسئلہِ فلسطین ، مسئلہِ کشمیر ، مسئلہِ شام اور افغانستان کی ابتر صورت حال کا احاطہ بھی کیا گیا۔اس اعلامیے میں امتِ مسلمہ کے جن دیو ہیکل مسائل کا احاطہ کیا گیا، وہ درج ذیل ہیں :

1۔ دونوں فریقوں (پاکستان اور سعودی عرب ) نے جنیوا قرارداد کے مطابق شام میں امن بحال اور وہاں کے لوگوں کے قتلِ عام کی روک تھام کے لیے حالیہ بحران کا فوری حل تلاش کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ دونوں فریقوں نے اس حوالے سے بین الاقوامی نگرانی میں شام کے قصبوں اور دیہاتوں کے محاصرے کے خاتمے اور فضائی اور توپ خانے کی بم باری روکنے پر بھی زور دیا ہے۔اعلامیے میں شام کے ملکی حالات سنبھالنے کے لیے با اختیار عبوری حکومتی باڈی کے قیام کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے۔

2۔ اعلامیے میں مسئلۂ کشمیر کے پر امن حل کی امید کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔
3۔ دونوں فریقوں نے مارچ میں شیڈول کے مطابق افغانستان میں انتخابی عمل کی حمایت کا بھی اعلان کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس عزم کا بھی اظہار کیا گیا ہے افغانستان میں امن و سلامتی کی بحالی کے لیے مفاہمتی عمل کی حمایت کی جائے گی۔
4۔ دونوں فریقوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ مسئلۂ فلسطین اس انداز میں حل کیا جائے کہ فلسطینیوں کی آزاد ریاست قائم ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں نے فلسطینیوں کی حمایت جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ بھی کیا۔اعلامیے میں اسرائیلی کارروائیاں فوری طور پر بند کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔

اس اعلامیے میں پاکستان اور سعودی عرب کے مشترکہ مفادات کے ضمن میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا، میں ان کو طوالت کے خوف سے یہاں تحریر کرنے سے قاصر ہوں۔ ویسے وہ میرا موضوع بھی نہیں ہیں۔اس اعلامیے میں جو باتیں میری آج کی تحریر سے متعلق تھیں، وہ میں نے لکھ دیں۔

یہ پاک سعودی مشترکہ اعلامیہ واقعی قابلِ تعریف ہے، جس کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ایک ایسے پر آشوب وقت میں، جب پوری مسلم امہ انتہائی نازک دور سے گزر رہی ہو، دو اہم اسلامی ملکوں کی طرف سے ایک ایسے اعلامیے کا اجراء جو دو برادر ملکوں کے مشترکہ مفادات کے ساتھ ساتھ مسلم امہ کے بڑے بڑے مسائل کا بھی احاطہ کرتا ہو، واقعی لائق تحسین اقدام ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے اعلامیے اور پھر ان پر عمل مسلم امہ کے تمام مسائل کے حل میں مد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ظاہر ہے کہ جس طرح اپنی قوم کے افراد اپنے ہی لوگوں کے غموں میں شریک ہو سکتے ہیں، اس طرح دوسری اقوام کے افراد نہیں ہو سکتے۔اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہا جا سکتا ہے جس طرح اپنی قوم کے افراد اپنے لوگوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں، اس طرح دوسری اقوام کے افراد نہیں کر سکتے۔اس بات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ شام ۔۔۔ جو تین سالوں سے خانہ جنگی کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے، جہاں اب تک ایک لاکھ سے زائد افراد موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں ۔۔۔ ہنوز امن کے لیے ترس رہا ہے۔ایک خبر کے مطابق وہاں کے لوگ مردار جانور کھانے پر مجبور ہو چکے ہیں۔اگرچہ اقوام متحدہ نے جنیوا ون اور جنیوا ٹو معاہدں کی مدد سے شام کا مسئلہ حل کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے، لیکن کچھ نہیں ہو سکا۔شام اُسی طرح خانہ جنگی کی آگ میں جل رہا ہے۔مسئلۂ کشمیر اور مسئلۂ فلسطین بھی مسلم امہ کے دیرینہ مسائل ہیں، جو، بشمول مسئلۂ شام و دیگر، اسی

صورت میں حل ہو سکتے ہیں، جب اسی طرح کے اعلا میہ، قرارداد یں اور ان پر عمل سامنے آتا رہے۔

بلکہ میں تو اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک اور بات کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس وقت اقوامِ متحدہ جیسے ایک مضبوط اور منظم ادارے کی اشد ضرورت ہے، ایک ایسا ادارہ جس کے تمام مسلم ممالک ممبر ہوں۔ ایک ایسا ادارہ جو مسلم امہ کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلے پر تڑپ اٹھے، اور اس مسئلہ کے حل کے لیے ہر ممکن کوشش کرے۔ لیکن جناب، یہ اسی صورت ممکن ہے، جب ہم اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں گے اور عصبیت کی بیخ کنی کریں گے۔ جب ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمان متحد ہو کر اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کریں گے، تو ان کے سارے مسائل ایک ایک کرکے حل ہو جائیں گے۔ پھر ہماری کوئی بہن یا بھائی غیروں کی جیلوں میں نظر نہیں آئیں گے۔ لیکن اتحاد شرط ہے۔

!! پوری مسلم امہ سے میری دردمندانہ گذارش ہے کہ خدارا متحد ہو جایئے۔ خدارا

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے<br>
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر

(نوٹ: میرا فیس بک رابطے کا ایڈریس یہ ہے :

https://www.facebook.com/naeemurrehmaan.shaaiq(

# پیارے قائدً ! ہم آپ سے شرمندہ ہیں

پیارے قائدً ! ہم آپ سے شرمندہ ہیں ۔آپ کتنے عظیم تھے ،تاریخ بتاتی ہے کہ آپ نے اپنا تن من دھن ، سب کچھ ہمارے لیے لوٹا دیا تھا۔ یہ آپ ہی کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے آج ہم ایک آزاد مملکت میں آزادی سے رہ رہے ہیں ۔آپ نے برِ صغیر کے مسلمانوں کی اس وقت رہنمائی کی ،جب وہ غلامی کی چکی میں پس رہے تھے ۔ہمیں تاریخ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ آپ 1930 ء میں برطانیہ چلے گئے تھے ، مگر محض پانچ سال بعد دوبارہ برصغیر آ گئے کہ دیارِ غیر میں بھی آپ ہر دم اپنی قوم کے لیے مطرے ب رہتے تھے ، کیوں کہ آپ برِ صغیر کے مسلمانوں کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے ۔آپ چاہتے تھے کہ آپ کی قوم کا فرد فرد آزاد فضاؤں میں سانس لے ۔ ان پر کسی غیر قوم کا تسلط نہ رہے ۔ یوں آپ نے صرف ہمارے لیے برطانیہ کی پر سکون زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ پھر آپ میدانِ عمل میں اس آن، بان ، شان ، خلوص، عزم اور استقلال سے اترے کہ باآخر ہمار لیے ایک آزاد مملکت حاصل کرکے ہی سکھ کا سانس لیا۔ زمانے کی کوئی طاقت نہ آپ کو جھکا سکی ، نہ دبا سکی ۔آپ ثابت قدم رہے ۔اپنوں کے تیر سہے ، غیر وں کی صعوبتیں جھیلیں ، مگر مجال ہے ،آپ کی پائے ثبات میں ذرا سی بھی لغزش و جنبش آئی ہو ! آپ نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی ، باآخر رب تعالی نے بھی آپ

کو سرخرو کیا کہ آپ پر خلوص تھے اور اپنی قوم کے سچے ہم درد۔

پیارے قائد ! آپ کی اس لازوال اور بے مثال قربانی کا مگر ہم نے آپ کو کیا صلہ دیا ! ہم نے تو آپ کی تمام تعلیمات کو ہی یکسر فراموش کردیا۔ آپ نے طلبہ وطالبات کو سیاست اور سیاسی پارٹیوں سے احتراز برتنے کی نصیحت کی تھی ،آپ نے اسلامی تاریخ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وطنِ عزیز کے سیاست دانوں کو عوام کا خادم کہا تھا ،آپ نے کرپشن کو لعنت گردانا تھا ،آپ نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں صوبائیت اور فرقہ واریت کی نفی کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام ہمیں یہ ہی سکھاتا ہے ، آپ نے غریبوں کی دیکھ بھال اور ان کی مدد کرنے کی نصیحت کی تھی ، آپ نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خواتین کا رتبہ بڑھانے کی تلقین کی تھی ، آپ نے مسلمان ملکوں سے دوستانہ مراسم بڑھانے پر زور دیا تھا۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ مسلم اتحاد کے داعی تھے ۔۔۔۔ پیارے قائد ! آپ کے خطبات ، نصیحتوں اور اقوال سے کتابیں بھری پڑی ہیں ۔۔۔ مگر ہم نے آپ کی تعلیمات کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطحوں پر بھلا دیا ۔۔ افسوس ، خجالت اور شرمندگی سے ہم یہ اعترافِ جرم کرتے ہیں کہ ہم آپ کی تعلیمات کا بھرم نہ رکھ سکے ، شاید یہی وجہ ہے کہ آج ہم آزاد ہو کر بھی ، آزاد نہیں ہیں۔

پیارے قائد، ہم نے آپ کی تعلیمات کو پس پشت ڈالنے پر ہی اکتفا نہ کیا، ہم تو آپ کی اس رہائش گاہ کو بھی نہ سنبھال سکے، جہاں آپ نے اپنی زندگی کے آخری "علیل ایام" کاٹے تھے۔ آپ کی اس یادگار پر راکٹوں سے حملہ کیا گیا، اور آپ کی اس نشانی کو ہم سے چھیننے کی زبردست کوشش کی گئی۔ بھلا اس رہائش گاہ کا کیا قصور تھا! اس حملے کو ایک سال ہونے کو ہے، مگر ابھی تک یہ احساس دامن گیر ہے کہ آپ ہم سے کتنے ناراض ہوں گے!

اور پھر یہ بات ۔۔ جو میں لرزتی قلم اور دھڑکتے دل کے ساتھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ آج مجھے آپ کے سامنے اعترافِ جرم کرنا ہے ۔۔۔۔ کہ آپ کی آزاد کردہ مملکت کے کچھ باسیوں نے سفاکیت کی تاریخ رقم کرتے ہوئے آپ کی قبر کی ہی بیچ ڈالا۔ آپ کی قبر کے اصل کمرے کو قحبہ خانہ بنا دیا گیا۔

پیارے قائد!! ہم بھی کیا قوم ہیں! ۔۔۔ ہم نے آپ کے احسانات کا بدلہ کتنے "احسن طریقے سے چکایا کہ آپ کی قبر کو ہی بیچ دیا ۔۔۔ پیارے قائد، ہم اتنے شرمندہ ہیں" کہ اب تو تخیل میں آپ کی آنکھیں سے آنکھیں ملانے کی ہمت بھی جواب دے گئی ہے کیوں کہ ہم آپ کی قبر کے تقدس کا تحفظ نہ کر سکے ۔۔۔ پیارے قائد!!! ہمارے دلوں، میں راج کرتی ادسیاں اور ہماری نظروں کی وحشتیں بتا رہی ہیں کہ آپ ہم سے بہت ناراض ہیں ۔۔۔ بہت ہی زیادہ ناراض ۔۔ اتنے

!!! ناراض ۔۔ کہ شاید آپ ہمیں کبھی معاف ہی نہ کریں

: نوٹ: میرا فیس بک رابطے کا ایڈریس یہ ہے)

https://www.facebook.com/naeemurrehmaan.shaaiq)

## تھر کی حالتِ زار

یاد داشت بخیر۔۔۔ 31 جنوری 2014 ء کو وزیرِ اعظم نواز شریف اور سابق صدر آصف علی زرداری نے مشترکہ طور پر تھر کول پروجیکٹ کا افتتاح کیا تھا۔ سندھ کے صحرائی علاقے تھرپارکر کے کوئلے کے ذخائر سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس منصوبے پر ایک ارب 60 کرور ڈالر خرچ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ کہا جارہا تھا کہ یہ منصوبہ 2017 ء میں پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا اور ابتدائی طور پر اس سے 660 میگا واٹ بجلی حاصل ہوگی۔

مگر کوئلے، گرینائٹ اور دیگر معدنیات سے بھرپور سندھ کے اس صحرائی علاقے کی حالیہ حالتِ زار نے بالخصوص سندھ کے لوگوں کو اور بالعموم پورے پاکستان کو اداس کر دیا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے مطابق غذائی قلت اور خشک سالی کی وجہ سے تھر کے 125 بچے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ صوبائی وزیرِ بلدیات و اطلاعات کے مطابق گذشتہ چار ماہ کے دوران مذکورہ علاقے میں 69 بچوں کی اموات ہوئی ہیں، جن میں سے زیادہ تر اموات بچوں میں نمونیہ کے باعث ہوئی ہیں۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق گذشتہ دو ماہ میں تھر میں غذائی قلت کی وجہ سے ہلاک ہونے والے بچوں کی تعداد 200 کے قریب ہے۔۔۔ یوں بہت سی متضاد خبریں

گردش کر رہی ہیں۔ بہر حال ہمارے لیے تو ایک ایک بچے کی جان قیمتی ہے۔ چاہے وہ بچہ نمونیہ، ڈائریا وغیرہ کی وجہ سے ہلاک ہوا ہو یا غذائی قلت، قحط وغیرہ کی وجہ سے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عین اس وقت جب تھرپارکر میں بچے مر رہے تھے سندھ حکومت موئن جو ڈرو میں کلچرل فیسٹیول منا رہی تھی۔ اس فیسٹیول پر 450، ملین روپے خرچ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

ذرائع ابلاغ نے تھرپارکر کی حالتِ زار کی جانب حکامِ بالا کی توجہ مبذول کرائی تو بالخصوص سندھ حکومت اور بالعموم وفاق حرکت میں آ گئی۔ سندھ کے وزیرِ اعلیٰ نے اعتراف کر لیا کہ تھر میں غفلت برتی گئی۔ انھوں نے محکمۂ صحت ضلع تھر کے ڈائریکٹر اور ایم ایس مٹھی سول اسپتال کو معطل کر کے غفلت برتنے کی پاداش میں گرفتار کرنے کے احکامات بھی جاری کر دیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے قحط کے متاثرین کی فوری امداد کے لیے ایک لاکھ بیس ہزار گندم کی بوریاں مفت تقسیم کرنے، مرنے والے بچوں کے والدین کو دو دو لاکھ روپے فی کس امداد دینے اور ادویات کے لیے ایک کروڑ روپے کا اعلان کیا ہے۔ وزیرِ اعلیٰ ہاؤس میں تھر ریلیف اینڈ ری ہیبلی ٹیشن سیل بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں سندھ کے وزیرِ اطلاعات و بلدیات نے کہا ہے کہ سندھ حکومت نے ڈسٹرکٹ تھرپارکر کے لیے 42 کروڑ روپے کی گندم کی مفت فراہمی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ ہم تھرپارکر کے لوگوں کو یقین دلاتے ہیں پیپلز

پارٹی اور سندھ حکومت انھیں کسی صورت اکیلا نہیں چھوڑے گی۔ان خیالات کا اظہار انھوں نے تھرپار کرکے کے علاقے مٹھی کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر اسپتال کے دورے کے بعد میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے کیا۔پاک فوج بھی ضلع تھرپار کر پہنچ گئی ہے ۔آرمی کی ٹیم اپنے ساتھ 10 ٹن اشیائے خورد و نوش اور منرل واٹر لائی ہے۔اس کے علاوہ وزیرِ اعظم نے کہا ہے کہ تھر کے متاثرین کی بحالی کے لیے سندھ حکومت سے مکمل تعاون کریں گے۔ تھرپار کرکے متاثرین کے لیے بحریہ ٹاؤن کے چیئر مین ملک ریاض کا جذبہ قابلِ قدر ہے۔ انھوں نے ابتدائی طور پر تھرپار کرکے متاثرین کے لیے 20 کروڑ روپے مختص کر دیے ہیں ۔انھوں نے اس عزم کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ تھر کے متاثرین کے لیے 50 کروڑ یا10 کروڑ روپے خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

تھرپار کرکے متاثرین کے لیے سندھ حکومت کی کوششیں اور کاوشیں اگرچہ قابلِ ستائش ہیں ، لیکن یہی کوششیں اور کاوشیں پہلے کیوں نہ ہوئیں۔ کیوں کہ حالات کی سنگینی کی پہلے سے پیشین گوئیاں کی جانے لگی تھیں۔ نیشنل ڈیزاسٹر مینیجمنٹ اتھارٹی کے سربراہ میجر جنرل محمد سعید سلیم کے مطابق قحط کی صورت حال ایک رات میں پیدا نہیں ہو جاتی۔ جنوری میں محکمۂ موسمیات کے ذریعے ہماری ٹیم نے معمولی درجے کے قحط کی وارننگ دی تھی۔ محکمۂ صحت کے ترجمان نے کہا ہے کہ فروری میں 21 بچے ہلاک ہوئے اور جنوری میں 18 بچے جان سے ہاتھ

دھو بیٹھے۔

اگر پہلے سے ہی حالات کی سنگینی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس مسئلے کی جانب توجہ دی جاتی تو شاید حالات اتنے سنگین نہ ہوتے۔ بہر حال۔۔۔۔ ہوتا تو وہی ہے، جو میرے رب کو منظور ہوتا ہے۔ پانی اب بھی سر سے اونچا نہیں ہوا۔ حالات اتنے گمبھیر بھی نہیں ہیں کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ جائیں یا ایک دوسرے پر الزام دھرتے رہیں۔ مسئلہ اتنا بھی نہیں الجھا کہ سلجھ ہی نہ سکے۔ صرف صوبائی حکومت ہی کیوں۔۔۔کیا ہم اس ملک کے باشندے نہیں ہیں؟ یا کیا تھر پارکر والے ہمارے بھائی بہن نہیں ہیں۔یقیناً، ہیں۔اگر ہیں تو ہم سب کا یہ فرض بنتا ہے کہ ہم ان کی بھرپور مدد کریں۔

# لہو لہو لیاری

اگر چہ لیاری کا لہو لہان ہونا تو معمول بن چکا ہے ، مگر بروز بدھ ، مورخہ 2 1 مارچ 2014 ء کو کراچی کی یہ قدیم بستی اتنی لہو لہان ہوئی کہ پورا لیاری سوگوار ہو گیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق کلاکوٹ تھانے کی حدود لیاری جھٹ پٹ مارکیٹ میں بدھ کی صبح لیاری گینگ وار ملزمان کی جانب سے اندھا دھند فائرنگ اور راکٹ لانچروں سے حملہ کیا گیا، جس کے باعث خواتین اور بچوں سمیت 16 یا 18 افراد جاں بحق اور 27 یا 37 افراد زخمی ہو گئے۔اس سانحے کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ اندھا دھند فائرنگ اور راکٹ لانچروں سے حملے عین مارکیٹ میں کیے گئے، جہاں بہت سی خواتین خریداری کر رہی تھیں ، اس کے علاوہ یہ واقعہ ایک ایسے وقت میں رونما ہوا، جب اسکولوں کے بچے اسکولوں سے گھروں کو لوٹ رہے تھے ، جس کی وجہ سے اس سانحے سے خواتین سمیت بچے بھی متاثر ہوئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جمعرات کو لیاری کے تقریبا سارے پرائیویٹ اسکول بند کر دیے گئے۔اس حادثۂ جاں کاہ میں جاں بحق اور زخمی ہونے والے افراد کو سول اسپتال منتقل کیا گیا تو وہاں ایمر جنسی نافذ کردی گئی ۔ لیاری کے مظلوم لوگ اپنے پیاروں کی لاشوں سے لپٹ کر روتے رہے۔ رقت آمیز مناظر نے وہاں کی فضا کو بھی سوگ وار کر دیا۔دوسری طرف لیاری

سنسان ہو گیا۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ جھٹ پٹ مارکیٹ، جہاں یہ حادثۂ الم ناک وقوع پذیر ہوا، اب تک ویران اور سنسان پڑی ہے۔

لیاری کتنا خوف ناک ہو چکا ہے، اس امر کا اندزہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کراچی کی اس قدیم بستی میں دیگر علاقے کی سواری (رکشہ اور ٹیکسی وغیرہ) خوف کے باعث نہیں آتی۔ لیاری کے باشندوں کو اس وقت بڑی مشکل درپیش آتی ہے، جب وہ کراچی کے کسی دوسرے علاقے میں جائیں اور انھیں لیاری میں آنے کے لیے کوئی سواری چاہیے ہو۔ بہت کم رکشے اور ٹیکسی والے اس طرف رخ کرتے ہیں۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہاں کے حالات ہیں۔لیاری کے عام باشندے نہایت سادہ اور غریب ہیں ۔یہاں کی اکثریت محنت مزدوری کرکے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے، مگر اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں، جن کی وجہ سے پورا لیاری بے سکون ہے۔

موجودہ حکومت نے لیاری میں جو آپریشن شروع کیا ہے، اس سے لیاری کے حالات مزید خراب ہو گئے، اگرچہ گینگ وار کے کئی ملزمان اب تک پولیس اور رینجرز کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں، لیکن اسی آپریشن کی وجہ سے ہی لیاری میں ایک نئی "متحارب گروپوں کی لڑائی" نے جنم لیا ہے۔ اس لڑائی میں روازنہ کی بنیاد پر معصوم اور بے گناہ لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔لیاری کی

ابتر صورتحال کی وجہ سے لوگ نقل مکانی پر مجبور ہو چکے ہیں۔ کاروبارِ زندگی بری طرح مفلوج ہو چکا ہے۔ لیاری۔۔۔ جہاں کبھی رات کو بھی دن کا سماں ہوتا تھا، اب وہاں دن کو بھی رات کا سماں ہوتا ہے۔

کہتے ہیں، بے گناہ لوگوں کا خون رائیگاں نہیں جاتا۔ جھٹ پٹ مارکیٹ سانحے کے بعد فوری طور پر پولیس اور رینجرز حرکت میں آ گئی اور 8 ملزمان کو ہلاک کر دیا۔ دوسری طرف وزیرِ اعظم نے بھی اس سانحے کا نوٹس لے لیا۔ تفصیلات کے مطابق بدھ کو وزیرِ اعظم کو وفاقی وزیرِ داخلہ نے کراچی کی صورت حال کے بارے میں بریفنگ دی۔ اس دوران وزیرِ داخلہ نے لیاری واقعے اور پر تشدد کارروائیوں سے متعلق ڈی جی رینجرز کی رپورٹ بھی پیش کی۔ جس پر وزیرِ اعظم نے سخت تشویش کا اظہار کیا۔ ساتھ ساتھ انھوں نے رواں ہفتے کراچی کے دورے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ 14 مارچ بروزِ جمعہ کو وزیرِ اعظم نے کراچی کا دورہ کیا۔ یہاں بھی انھوں نے لیاری کی صورت حال پر خاصی تشویش کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ لیاری کھیلوں کے حوالے سے پاکستان کی پہچان ہے۔ سندھ حکومت لیاری کو پر امن بنائے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سندھ حکومت کو لیاری میں صورت حال کو کنٹرول کرنے کے لیے مزید تھانے قائم کرنے اور مفرور ملزمان کے سر کی قیمت مقرر کرنے کی ہدایت بھی کی۔ وزیرِ اعظم کے کراچی کے دورے کے بعد پولیس اور رینجرز مزید حرکت میں آ گئی۔ شنید ہے کہ اب وہاں پولیس اور

رینجرز کی بڑی تعداد موجود ہے۔

لیاری کے معصوم لوگ امن کے لیے ترساں ہیں۔لیاری کے معصوم بچے اسکول اور مدرسے میں جانے سے ڈرتے ہیں۔اس لیے نہیں کہ "متحارب گروپوں کی لڑائی" دیکھ دیکھ کر ان کے پڑھنے کا شوق ماند پڑ گیا ہے، بلکہ اس لیے کہ ان کی دانست میں لیاری کی سرزمین پر، قدم قدم پر جھٹ پٹ سانحے جیسے خطرات جنم لے چکے ہیں اور وہ کسی بھی لمحے اوان گولے، کسی اندھی گولی یا کسی ظالم راکٹ کا نشانہ بن سکتے ہیں۔لیاری کے نوجوان جب ارد گرد غربت، جہالت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے روز گاری کو دیکھتے ہیں تو خود بہ خود گینگ وار کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں، یہ گینگ وار بالآخر ان کی زندگیوں کے چراغ ہی گل کر دیتی ہے۔ شنید ہے کہ لیاری کے پرانے بابے آج کل سر شام اپنے گھروں اور پارکوں کے باہر تاش بھی نہیں کھیلتے، کیوں کہ کوئی اندھی گولی کسی بھی لمحے انھیں بھی نشانہ بنا سکتی ہے۔۔۔اور ہاں۔۔۔اب کوئی اماں جھٹ پٹ مارکیٹ میں سبزی لینے بھی نہیں جاتی!!!!

1950ء سے جاری گینگ وار کی بیخ کنی کرنے کے لیے بالخصوص سندھ حکومت اور بالعموم وفاقی حکومت کو سخت محنت کی ضرورت ہے۔کیوں کہ اب لیاری کے بدن میں مزید غیر قانونی کاموں اور دھندوں کو جھیلنے کی سکت نہیں ہے اور نہ ہی

!! اپنے باشندوں کا لہو جذب کرنے کا حوصلہ

"یہ میرے پاس تمھارے لیے ایک امانت ہے، تم اس کشت و خون کے عالم میں مجھے مل گئے، میرا بوجھ ہلکا ہو گیا"۔ پھر اس نے جیب میں سے کپڑے کا رومال نکالا جس پر کئی گرہیں لگی ہوئی تھیں، انھیں کھولا اور اس کے اندر ایک چھوٹا سا تعویذ تھا۔
اس نے یہ تعویذ اس مسلمان کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "لو آج موہن سنگھ سرخرو ہو گیا۔"
امرتسر کے جلے ہوئے مسلمان محلے کی ایک تاریک گلی میں جب وہ یہ تعویذ اس کے حوالے کر رہا تھا تو خوف سے چاروں طرف دیکھتا جاتا کہ کہیں کوئی ہندوؤں یا سکھوں کا غول اسے اس مسلمان کے ساتھ دیکھ نہ لے۔ یہ مسلمان امرتسر کا رہائشی مشہور ادیب اے حمید تھا۔ اے حمید نے پوچھا لیکن یہ تعویذ ہے کس کا؟ موہن سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے کہا۔ چند دن پہلے جب مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوا تو ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے مسلمان محلوں پر ٹوٹتے، مردوں کو قتل کرتے، مکانوں کو آگ لگاتے اور عورتوں کی بے حرمتی

کرتے۔ میں ایک رات ایک چوک سے گزر رہا تھا کہ وہاں چند ہندو غنڈے نشے میں بد مست بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے روکا۔ میں نے کہا کہ گھر جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا آؤ تمہیں سورگ کی سیر کراتے ہیں۔ میں ان کا اشارہ سمجھ گیا۔ شاید کوئی مظلوم مسلمان لڑکی ان کے ہاتھ چڑھ گئی ہے۔

میں نے پوچھا تو بولے ہاں! آج ہم دیکھیں گے کب تک جے ہند نہیں کہتی۔

میں نے ان سے کہا: "چلو میں اس کو راضی کرتا ہوں"۔

"انہوں نے کہا: "جا تو 'موج' کر لے۔

میں ساتھ والی چھوٹی سی کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ دیے کی روشنی میں چارپائی پر ایک سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی بیٹھی تھی جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بال یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے زبردستی نوچ کھسوٹے گئے ہوں لیکن اس کی آنکھوں میں شیرنی کی سی چمک تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا: "خبردار میرے قریب "مت آنا۔

میں نے کہا: "بہن میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔" بہن کا لفظ سن کر اسے تسلی ہوئی۔ اس نے کہا میرا نام رقیہ ہے۔ ان غنڈوں نے میرے باپ اور بھائیوں کو قتل کر دیا اور مجھے اٹھا کر لے آئے لیکن انھیں علم نہیں ایک مسلمان عورت اپنی عزت کی حفاظت کیسے کرتی ہے؟ پھر اس نے اپنے گلے سے ایک تعویذ اتارا

اور میرے قریب آ کر مجھے دیتے ہوئے کہا: "یہ میری امانت ہے اسے کسی مسلمان کو دے دینا" اور جھپٹ کر میرے گلے میں لٹکی کرپان کو زور سے اپنے سینے میں اتار لیا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور تھوڑی دیر تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ دھیمی روشنی میں اس کے چہرے پر ایسا سکوت اور نور سا تھا کہ میں خوف زدہ ہو گیا اور تعویذ جیب سے نکال کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس دن سے میں کسی مسلمان کو ڈھونڈ رہا تھا جس کو یہ امانت لوٹا دوں، پتا نہیں میری سمجھ میں نہیں آتا ایک مسلمان عورت اتنی بہادری سے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کس طرح جان دے سکتی ہے؟"

(مجھے ہے حکمِ اذاں۔ اوریا مقبل جان)

آمنہ کی دکھ بھری داستان میڈیا کے ذریعے سامنے آئی تو مجھے برسوں پہلے پڑھی ہوئی یہ تحریر یاد آ گئی۔ واقعی مسلمان عورت اپنی عزت اور عصمت کی خاطر جان بھی دے دیتی ہے۔ زندہ مثال آمنہ ہے، جسے انصاف نہیں ملا تو اپنی جان ہی دے دی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مسلمان عورت کے لیے اس کی عزت، اس کی عصمت، اس کی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ وطنِ عزیز کی طول و عرض میں نہ جانے ہوس کی کونسی آگ لگی ہے کہ تین سال کی بچی بھی محفوظ نہیں۔ حوا کی بیٹی پر

پے در پے ہونے والے ظلم اور تشدد نے ہمارے اقدار اور روایات کو بری طرح پامال کر کے رکھ دیا ہے۔اس ضمن میں شکار پور کا حالیہ واقعہ دیکھا جا سکتا ہے۔جہاں ایک جرگے نے ناجائز تعلقات کی بنا پر دو خواتین کو قتل کی سزا دے دی۔ یہ تو بھلا ہو چیف جسٹس صاحب کا، جنھوں نے فوری طور پر اس اندوہ ناک واقعے کا نوٹس لیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدالتوں کی موجودگی میں جرگے کا قیام اور ان کے فیصلوں پر عمل ۔۔چہ معنی دارد ؟ پھر یہ جرگے جس طرح کے فیصلے کرتے ہیں، وہ سب جانتے ہیں۔

تین سال سے لے کر بیالیس سال کی عورت تک سے زیادتی ۔۔کیا ہم انھی روایات کے امین تھے ؟آخر ہمیں ہو کیا گیا ہے؟ابھی میں اخبار پڑھ رہا تھا تو اس نوعیت کے ایک اور واقعے نے افسردہ کر دیا۔ جو لوگ اس طرح کی قبیح رسموں میں ملوث ہیں، وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ رب تعالیٰ سب سے بڑا منصف ہے۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔جو وہ آج بو رہے ہیں، کل اسے کاٹنا بھی پڑے گا۔بتایا جاتا ہے کہ 2009 ء سے پاکستان میں اس طرح کے واقعات میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

خواتین کے ساتھ تشدد کے واقعات میں کیوں اضافہ ہو رہا ہے۔اس کی بہت ساری وجوہات ہو سکتی ہیں۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ "بے خوفی" بھی ہے۔ خوف

کوئی بھی ہو، جرائم کی روک تھام میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ خوف سزا کا بھی ہو سکتا ہے۔ رب تعالی کا بھی ہو سکتا ہے، جسے اسلامی اصطلاح میں تقویٰ کہتے ہیں۔ یہ خوف اس بات کا بھی ہو سکتا ہے کہ اگر میں کچھ برا کروں گا تو میرے ساتھ بھی ضرور برا ہو گا۔ بد قسمتی سے اب ہم میں ان تینوں قسم کے خوفوں کا فقدان ہے۔ ہمارے ملک میں قانون کی بالا دستی نہ ہونے کے برابر ہے۔ امیر لوگ کس طرح بچ جاتے ہیں، اس کا اندازہ آمنہ والے واقعے سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس طرح کے لوگوں کو کھلی چھوٹ دے دی جائے گی تو یقیناً وہ معاشرے کا جینا مشکل کر دیں گے۔ مادی دور کی چکا چوند روشنیوں نے خوفِ خدا بھی چھین لیا۔ اور اب ہم میں " جیسی کرنی ویسی بھرنی " کا خوف بھی نہیں ہے۔ اگر ہماری حکومت واقعی عورتوں پر تشدد کے خاتمے میں سنجیدہ ہے تو انصاف کی بالادستی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث عناصر کو اولا قانون کے کٹھرے میں لائے اور پھر انھیں بلا امتیاز سخت سے سخت سزائیں دے۔ اگر اس طرح کے کسی ایک مجرم کو بھی عبرت ناک سزا دے دی جائے تو اس طرح کے واقعات نہ ہوں۔ لیکن انصاف شرط ہے۔

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت، ذلیخا کی بیٹی

## یہ ٹاک شوز

یہ ٹاک شوز بھی عجیب ہوتے ہیں ۔جذباتی تقریریں ، تلخ لہجے ، جارح بیان بازی ، سب کچھ آپ کو یہاں دیکھنے اور سننے کو مل جائے گا۔صورت حال وہاں بچگانہ ہو جاتی ہے ، جب دو مہمانان ایک ساتھ بولنا شروع ہو جاتے ہیں ۔پھر کچھ سمجھ نہیں آتی کہ کیا کہا جا رہا ہے۔مناظرے یا مباحثے کا اصول ہے کہ ایک وقت میں ایک بولے ،تاکہ سننے والے کو سمجھ آسکے اور موقف بھی واضح ہو سکے ۔کیا ہی اچھا ہو کہ ٹاک شوز کے مہمانان مناظرے کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے ایک ایک کرکے بولیں ۔اکثر ٹاک شوز میں مباحثے کی تمہید شخصیت سے کی جاتی ہے۔ مخالفین ایک دوسرے کی شخصیت کو خوب نشانہ بناتے ہیں ۔ مقصد اس کا مخالف کو ذک پہنچانا ہوتا ہے ۔یاد رکھیے کہ جو دلائل سے ہٹ کر شخصیت پر آجائے ، سمجھ لیجیے کہ اس کے پاس دلائل نہیں ہیں ۔احسن طریقہ یہ ہے کہ مخالف کی شخصیت کا احترام کرتے ہوئے اس کی باتوں کا دلائل کے ذریعے توڑ پیش کیا جائے ۔ایک ٹاک شو میں میں نے مہمانان کو ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ مہمانان کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان کے اس طرح کھلم کھلا گالیں دینے سے ان کے چاہنے والوں پر برے اثرات مرتب ہوں گے ۔اگر وہ گالیاں دیں گے تو ان کی اپنی شخصیت ہی داغ دار

ہو گی اور ایک ہی لمحے میں وہ ہیرو سے زیرو بن سکتے ہیں۔ پڑھا لکھا آدمی اپنی باتوں، اخلاق اور رویے سے پہچانا جاتا ہے۔

شاید یہی وجوہات ہیں کہ حد سے زیادہ سنجیدہ شخصیات ٹاک شوز میں آنے سے کتراتی ہیں۔ پاکستان میں بہت سے ایسے قابل لوگ موجود ہیں، جو ٹاک شوز میں شرکت نہیں کرتے، کیوں کہ اپنی شرافت کی وجہ سے وہ ان ٹاک شوز کی "بے باکیوں" کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

آج سے دس پندرہ سال قبل، جب اتنے سارے چینلز نہیں تھے، پروگرام دیکھنے کے قابل ہوا کرتے تھے۔ آنے والے مہمانان نظریاتی اختلاف کو شخصی اختلاف ہر گز نہیں بناتے تھے۔ آج مگر اس کے بر عکس ہو رہا ہے۔ اس وقت میڈیا اتنا جارح نہیں تھا، جتنا آج ہے۔ آزادیِ صحافت کا فائدہ بہت ہوا، نقصان مگر یہ ہوا کہ میڈیا تلخ ہو گیا۔ ایسے ایسے ٹاک شوز معرضِ وجود میں آئے، جن میں ایشو سے زیادہ شخصیات موضوعِ بحث بنتی ہیں۔ کچھ تدارک اس کا بھی ہونا چاہیے۔

دوسری طرف اینکر حضرات پر بھی بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ ایسے سوالات نہ کریں، جس سے تلخیاں بڑھیں۔ میں نے بارہا دو مخالفین کے درمیان

ہونے والی گرما گرم اور الزامات سے بھرپور "تقریر" پر اینکر پرسن کو لطف اندوز ہوتے دیکھا ہے۔ آزادیِ صحافت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپس کی رنجشوں کو سرِ عام مشتہر کیا جائے۔ میڈیا کا کردار تعمیری ہونا چاہیے۔ اگر مہمانان شخصیات پر اتر آئیں تو میزبان کا فرض بنتا ہے کہ انھیں روکے۔ اسی طرح درمیان میں بولنے والے کو بھی روکنا میزبان کے لیے ضروری ہے۔

# لاحاصل بحثیں

اخبارات اور ٹاک شوز میں متنوع قسم کی بحثیں پڑھنے اور سننے کو ملتی ہیں۔ عموما موضوعات اس قسم کے ہوتے ہیں:

قائدِ اعظم مولوی تھے یا مسٹر؟

ہمارا آئین اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟

پاک فوج شہید ہے یا ہلاک؟

اگر علامہ اقبال انگریزوں کے خلاف تھے تو انھوں نے سر کا خطاب کیوں لیا؟

جماعتِ اسلامی، جمعیت علمائے ہند، احرار وغیرہ نے پاکستان اور قائدِ اعظم کی کس حد تک مخالفت کی؟

مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مودودی نے قائدِ اعظم کی مخالفت میں کیا کیا لکھا اور کہا؟

کیا پاکستان کے قیام میں واقعی نظریہ پاکستان کا کلیدی کردار تھا؟

اس قسم کے مسائل پر لکھنے اور بولنے والے تمام قلم کار حضرات اور دانشور میرے لیے قابلِ احترام ہیں۔ کیوں کہ میں ان سے بہت کچھ سیکھتا ہوں۔ لیکن اس قسم کے موضوعات پر طبع آزمائی کرنا لاحاصل ہے۔ لاحاصل ہی نہیں، قوم پر اس کے مضر اثرات بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے موضوعات پر لکھنے اور

:بولنے سے درج ذیل اثرات مرتب ہو سکتے ہیں

سننے اور پڑھنے والے مزید کنفیوژ ہو جائیں گے۔(مزید کنفیوژ اس لیے کہ ہم پہلے سے بہت سے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔)

عدم برداشت کو بڑھاوا مل سکتا ہے۔(جو کہ ہمارے لیے تو بہت خطرناک ہیں۔ کیوں کہ ہم پہلے سے عدم برداشت کے ڈسے ہوئے ہیں۔)

محبتوں میں کمی اور نفرتوں میں اضافہ ہوگا۔

ہمارے ملک میں بہت سے سماجی اور معاشرتی مسائل ہیں۔غربت ہے، بے روزگاری ہے۔مہنگائی ہے۔کرپشن ہے۔لوڈشیڈنگ ہے۔ٹارگٹ کلنگ ہے۔پانی کا بحران ہے۔دہشت گردی ہے۔خواتین کی حالتِ زار کا مسئلہ ہے۔تعلیم کی ناگفتہ بہ حالت ہے۔تھر کا مسئلہ ہے۔طالبان، حکومت مذکرات کا ایشو ہے۔مشرف کیس کا مسئلہ ہے۔اتنے سارے قدآور اور دیو ہیکل مسائل کو چھوڑ کر "تاریخی اور اختلافی" مسائل پر لکھنا اور بولنا۔۔چہ معنی دارد؟ مخالف کو زیادہ سے زیادہ ذک پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ اختلافی معاملات پر لکھنا اور بولنا عقلمندی نہیں ہے۔حالاتِ حاضرہ پر لکھے ہوئے اور بولے ہوئے الفاظ ہی عوام میں پذیرائی حاصل کرتے ہیں۔پھر قلم کار کو تو اس بات کا ہر دم خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے قارئین میں سبھی قسم کے خیالات کے مالک لوگ شامل ہیں۔اس لیے انھیں سب کا خیال رکھتے ہوئے لکھنا اور بولنا چاہیے۔ کیوں کہ اگر

وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کی شہرت پر زوال کے بادل منڈلانے لگیں گے۔
پچھلے دنوں اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے دو بیانات آئے تو کونسل کے ممبران کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ہر طرف سے کہا گیا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبران نے اہم اور بنیادی مسائل پر سفارشات پیش کیوں نہیں کیں۔ یہی سوال میں اہلِ قلم اور دانشور طبقے سے پوچھتا ہوں (جو اختلافی مسائل پر لکھتے اور بولتے ہیں۔) کہ وہ بنیادی اور اہم مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے غیر اہم باتوں پر کیوں لکھتے اور بولتے ہیں۔ ہمارے ہاں اکثر یہ بات بھی دہرائی جاتی ہے کہ جب ہلاکو خان بغداد کو اجاڑ رہا تھا تو اس وقت کے علماء اختلافی مسائل پر بحثیں کر رہے تھے۔ (معلوم نہیں، یہ بات کس حد تک سچ ہے کیوں کہ یہ بات میں نے کسی کتاب میں نہیں پڑھی ہے۔) ہمارا ملک بھی اس وقت، اجڑ رہا ہے۔ غربت، مہنگائی، بے روزگاری وغیرہ جیسے خطرناک مسائل اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ وقت متقاضی ہے کہ قوم کو بجائے مزید کنفیوژ کرنے کے، جوڑا جائے۔ یہ ملک اس وقت ترقی کرے گا، جب پوری قوم متحد ہوگی۔ ہمارے قلم کار اور دانشور حضرات قوم کو متحد کرنے کے لیے اپنے قلم اور گفتگو کی تمام توانائیاں صرف کردیں، اگر وہ اس مملکتِ خداداد کو حقیقی معنوں میں ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔

## نصابی کتابوں کا مسئلہ

مارچ کا قدرے ٹھنڈا، مگر گرم مہینا بیت گیا۔ (اصل لفظ "مہینا" ہوتا ہے۔) یہ مہینا جوں ہی شروع ہوتا ہے، پھولوں جیسے بچے پرندوں کی مثل امتحانات کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ مہینا آتے ہیں "بڑے امتحانات" کی منادی کر دیتا ہے۔ اسی مہینے میں ہی بچے امتحانات دیتے ہیں۔ جو پاس، وہ ایک سال آگے۔ جو فیل، اس کا ایک سال برباد۔ ناکام بچے کے والدین ادھر بھٹکیں گے، ادھر بھاگیں گے۔ پرنسپل صاحب کا در کھٹکائیں گے۔ میڈم صاحبہ کی سخت باتیں سنیں گے۔ کوشش کریں گے کہ کچھ سخت و تند جملے سن کر بدلے میں اپنے نالائق بچے کو پروموشن کرالیں۔ مگر جس کے نصیب میں ایک سال ضائع ہونا لکھا ہو، اسے بھلا کون مٹا سکتا ہے!

اب اپریل آگیا ہے۔ مارچ کی نسبت قدرے گرم، مگر پھر بھی ٹھنڈا۔ یہ مہینا نونہالوں کی اصطلاح میں "نتیجے کا مہینا" کہلاتا ہے۔ اب جب کہ اس مہینے کا ایک عشرہ بیت گیا، دوسرا پوری آن بان شان سے جاری ہے، پرائیویٹ اسکولوں کے کام یاب بچے نئی کاپیاں اور کتابیں خرید کر اپنی نئی سال کی پڑھائی کا آغاز کر چکے ہیں۔

گورنمنٹ اسکولوں کی حالت، مگر اس سے مختلف ہے۔ یہاں پڑھنے والے بچے غریب ہوتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ ان کی غربت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھیں مفت کتابیں مہیا کرتی ہے۔ (یہاں سندھ حکومت کی بات ہو رہی ہے۔ باقی صوبوں کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے۔) گورنمنٹ کے اس انقلابی اقدام کو میں سراہتا ہوں کہ وہ کم از کم غریب بچوں کے والدین کو کتابوں کے خرچے سے تو بچالیتی ہے۔مگر مسئلہ ۔۔۔۔جس کی وجہ سے یہ ساری تمہید باندھنی پڑی۔۔۔۔یہ ہے کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی گورنمنٹ اسکولوں میں صوبائی حکومت کی طرف سے بچوں کو نصابی کتابوں کی فراہمی کا سلسلہ تاخیر کا شکار ہے۔ بہت سارے اسکولوں کے بچوں کو ہنوز کتابیں نہیں ملی ہیں۔خبر ہے کہ اس دفعہ تاخیر کی وجہ نصابی نصاب میں کی گئی تبدیلیاں ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بہت ساری نصابی کتابیں ہنوز پبلشرز کے پاس "تشنۂ اشاعت" ہیں ۔اب اپریل کا مہینا ہے، جو تقریباً آدھا گزر چکا ہے۔ پھر مئی آئے گا۔اور پھر جون جولائی کی چھٹیاں۔ نتیجتاً بچوں کی پڑھائی ہر سال کی طرح اس سال بھی اگست سے شروع ہو گی۔

صوبائی محکمۂ تعلیم نے نصابی کتابوں میں تبدیلیاں کی ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔ کیوں کہ نصاب وہ ہی اچھا ہوتا ہے، جو جدید سے جدید معلومات سے ہم

آہنگ ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان تبدیلیوں کے بارے میں دو تین مہینے پہلے کیوں نہیں سوچا گیا ؟ تاکہ بچوں کو وقت پر کتابیں مل جاتیں۔اور اب وہ لہک لہک کر کتابوں سے استفادہ کر رہے ہوتے۔پھر یہ بات بھی ملحوظ ہو کہ کتابوں میں تبدیلیاں یک سر نہیں ہو جایا کرتیں۔ یہ بڑا جان جوکھوں میں ڈال دینے والا کام ہے۔اگر صوبائی محکمہ تعلیم اس کام کو اگلے سال تک کے لیے چھوڑ دیتا تو آج میں اس مضمون کی بہ جائے کچھ اور لکھ رہا ہوتا !

سندھ کا محکمۂ تعلیم اگر اپنی کتابوں کی اشاعت قدرے جلدی کرے، تاکہ نئے تعلیمی سال کے آغاز میں ہی بچوں کو کتابیں مل سکیں، تو اس کے اس عمل سے پرائیویٹ اسکولوں کی اکثریت اس کی کتابیں خریدے گی، یوں یہ محکمہ مالی طور پر مزید مستحکم ہو سکتا ہے

۔اگرچہ پرائیویٹ اسکولوں کے اکثر مالکان کو سندھ کی نصابی کتابوں کے معیار پر تحفظات ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سارے پرائیویٹ اسکولوں کے مالکان محض اس وجہ سے اپنے اسکولوں میں سندھ کی نصابی کتابیں نہیں پڑھاتے کہ یہ سال کے ابتدا میں مارکیٹوں سے مفقود ہو جاتی ہیں۔

سندھ کے محکمۂ تعلیم کو نئے تعلیمی سال کے آغاز میں ہی اپنی کتابوں کی فراہمی کے لیے کچھ "انقلابی" اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے۔

# عوام بھی قصور وار ہے

اگر آپ چائے دینے والے بیرے سے ، سبزی بیچنے والے سے ، شام کو چپس بنانے والے خان صاحب سے ، خوش الحان واعظ سے ، دیہاڑی پر کام کرنے والے مزدور سے ۔۔ غرض کسی سے بھی موجودہ حکومت کی کارکردگی کی بابت دریافت کریں تو وہ الف سے ے تک حکومت کے تمام برے کاموں کی فہرست آپ کے سامنے پیش کر دے گا۔ متنوع قسم کے نیوز چینلز نے گلی کے نکڑ پر فضول گوئی کرنے والوں کو بھی اچھا خاصا تجزیہ کار بنا دیا ہے ۔آپ کے سامنے اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ہر عام شخص آپ کو بتائے گا کہ موجودہ حکومت جتنی کرپٹ ہے ، اس سے پہلے ہم نے کوئی حکومت ایسی نہیں دیکھی ۔اس حکومت نے پاکستان کی معیشت کو تباہ و برباد کر دیا ہے ۔اس حکومت نے مہنگائی کا وہ بازار گرم کر رکھا ہے کہ غریب بلبلا اٹھے ہیں ۔ بجلی کی ایسی لوڈ شیڈنگ اس سے پہلے ہم نے تصور میں بھی نہیں دیکھی تھی ۔ اس حکومت نے مشرف کا کیس اس لیے اٹھایا ہے ، تاکہ عوام کی توجہ بنیادی مسائل سے ہٹ جائے ۔ یوتھ لون اسکیم بھی کوئی اسکیم ہے ۔ پیلی ٹیکسی اسکیم کی طرح یہ بھی ناکام ہو گی ۔طالبان سے مذاکرات اس حکومت کی ناکامی کی دلیل ہے ۔وغیرہ وغیرہ ۔

لیکن کوئی عام سا شخص بھی مجال ہے ، آپ کو بتائے کہ اس کا ایک جاننے والا

پچھلے دو سالوں سے کے ای ایس سی کا مقروض ہے۔ بل ادا نہیں کر رہا۔ کوئی آپ کو یہ بھی نہیں بتائے گا کہ اس کی گلی کے نکڑ پر جو شخص جوئے کا اڈا چلا رہا ہے، اس کے ساتھ اس کے قریبی مراسم ہیں۔ کوئی آپ کو یہ بتانے کی ہمت بھی نہیں کرے گا کہ اس کے محلے کے ایک حاجی صاحب ماشاء اللہ پانچ وقت کے نمازی ہیں۔ 10، 9 حج بھی کر رکھے ہیں۔ لیکن جب وہ مسجد تشریف لے جاتے ہیں تو اپنے لیے خصوصی طور پر مسجد کے دو پنکھے چلواتے ہیں۔ آخر بزرگ ہیں۔ 65 سال کے ہیں۔ دو پنکھے چلانے کا حق ان سے بھلا کون چھین سکتا ہے۔ جب وہ مسجد میں آتے ہیں تو دیگر پنکھے بھی چالو ہوتے ہیں۔ مگر مجال ہے، وہ ان پنکھوں کے نیچے کھڑے ہو کر نماز ادا کریں۔ کیوں کہ ان پنکھوں کے نیچے پہلے سے کوئی موجود ہوتا ہے۔ حاجی صاحب یہ بالکل گوارہ نہیں کرتے کہ ان کے ساتھ کھڑے ہو کر ہی سنتیں اور نوافل ادا کرلیں۔ کیوں کہ اس طرح ان کو ہوا بھی کم لگ سکتی ہے۔ ساتھ ساتھ ان کی "سینوریٹی" کو بھی ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔ کوئی عام شخص آپ کو یہ بھی نہیں بتائے گا کہ وہ جہاں سے راشن خریدتا ہے، وہاں لال مرچ میں مرچ کم، لال رنگ زیادہ ہوتا ہے۔ نمک بھی ملاوٹ زدہ ہوتا ہے۔ آٹا بھی کچھ خاص نہیں ہوتا۔ کوئی عام سا شخص آپ کو یہ بتانے سے بھی گریز کرے گا کہ وہ جہاں سے دودھ خریدتا ہے، وہاں دودھ میں چالیس فی صد پانی ہوتا ہے۔

بے شک حکومت کی خامیاں ایسی ہیں، جو قابلِ صد تنقید ہیں۔ لیکن عوام بھی دودھ کی دھلی ہوئی نہیں ہے۔ پے در پے پیش آنے والے خوف ناک واقعات میں یہی "بے چاری" عوام ملوث ہے۔ بدین میں جو کچھ بارہ سالہ مقدس کے ساتھ ہوا، اس میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ عوام میں سے ہی کچھ لوگ تھے، جنھوں نے اس معصوم کو درندگی کا نشانہ بنایا۔ جعلی پیر کے کہنے پر 2 معصوم بھتیجوں کو ذبح کرنے والا چچا بھی اسی عوام میں سے تھا۔ بکھر سے پکڑے جانے والے دو آدم خور، جنھوں نے سو سے زیادہ لاشوں کا گوشت کھا رکھا تھا، اسی عوام میں سے تھے۔ سکرنڈ میں محض طالبِ علم کی سزا پر مشتعل ہو کر مدرسہ جلا دینے والے بھی عوام میں سے تھے۔ جوہی میں چائے نہ بنانے پر بیوی کو قتل کر دینے والا شوہر بھی اسی عوام میں سے تھا۔

کالم کے دامن کی کمی اور وقت کی قلت آڑے آ رہی ہے۔ ورنہ عوام کے کارناموں سے سیکڑوں صفحے کالے کیے جا سکتے ہیں۔ حالات کی درستی کے لیے میں کسی قسم کے انقلاب کا قائل نہیں ہوں۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اب کوئی ایسا مسیحا بھی نہیں آئے گا، جو یکسر ہمارے حالات بدل ڈالے۔ رب تعالیٰ نے بھی چودہ صدیاں قبل اس قانون کو مشتہر کر دیا کہ اس قوم کی حالت نہیں بدلی جا سکتی، جو خود اپنی حالت بدلنے کو کوشش نہ کرے۔ ہمارا مگر المیہ یہ ہے کہ ہم خود بدلنے کو تیار نہیں، لیکن زمانے کو بدلنے کے خواب دیکھنے کے ساتھ ساتھ

حکومتوں کو گرانے کے انقلابات کو ذہن نشین کیے ہوئے ہیں۔حالات کی درستی کی اولین شرط اپنی اصلاح ہے۔یاد رکھیے کہ فرد فرد مل کر قوم تشکیل دیتا ہے۔اگر ہر شخص انفرادی سطح پر ہی اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی اصلاح کرلے تو عجب نہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا،جب پوری قوم ہی ٹھیک ہو جائے گا۔تب ہمیں حکومت سے کوئی گلہ شکوہ نہیں ہوگا۔کیوں اس وقت تک حکومت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔

# ہمارا اجتماعی ضمیر

ہمارے اجتماعی ضمیر پر ,برائیوں کی صورت میں اتنے متعفن نا سور ہیں کہ جن کو دیکھتے ہی ابکائی آ جائے ۔ جب کبھی لکھنے بیٹھتا ہوں تو کسی مثبت خبر کی تلاش میں اخبارات اور ٹی وی چینلز کنگھالتا ہوں ، مگر مجال ہے کہ کوئی جان دار قسم کی مثبت خبر ملے ۔ جس اخبار کو اٹھاؤ، لہو زدہ اور وحشت ناک قسم کی خبروں سے بھری ہوئی ملتی ہے ۔
آج ہی ایک اخبار میں خبر چھپی ہے کہ سرگودھا میں ایک آدمی نے اپنی بیوی کی ٹانگیں کاٹ دیں ۔ وجہ گھریلو تنازعہ ٹھہری ۔ یہ کتنا الم ناک واقعہ ہے ۔ یہ اندوہ ناک واقعہ در اصل ہمارے اجتماعی ضمیر میں موجود ایک گہرے قسم کے گھاؤ کی نشان دہی کرتا ہے ۔ اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہم کس قدر عدم برداشت کا شکار ہو چکے ہیں ۔

ایک اور واقعہ بھی ملاحظہ ہو ۔ لاہور میں ایک شخص نے اپنی بیوی کے جسم میں ٹریکر لگوا دیا ۔ صغریٰ بی بی نے بتایا کہ اس کا شوہر اسے دو مرتبہ جلا کر مارنے کی کوشش بھی کر چکا ہے ۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر نے

اس کے جسم میں موجود ٹریکر ہٹانے کے لیے دو لاکھ روپے مانگے ہیں۔

ذرا تعلیمی پسماندگی ملاحظہ ہو۔ کراچی میں میٹرک کے امتحانات میں کلرک اور چپڑاسی نگران بنا دیے گئے۔ میٹرک کے امتحانات میں یہ پہلی بار نہیں ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی یوں ہی ہوتا آ رہا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ جہاں امتحان گاہوں میں دفعہ ایک سو چوالیس نافذ ہو، وہاں تعلیم کا معیار کیا ہوگا !

ایک اور دکھ بھری خبر یہ ہے کہ بدھ کو وقفۂ سوالات کے دوران وزیرِ مملکت.برائے داخلہ بلیغ الرحمان نے ایوان کو بتایا کہ 2008 سے 2014 ء کے دوران فرقہ وارانہ ہلاکتوں میں پنجاب میں 104 ، سندھ میں 252 ، خیبر پختون خوا میں 22 ، بلوچستان میں 737 ، فاٹا میں 867 ، گلگت بلتستان میں 103 ، اور اسلام آباد میں پانچ افراد جاں بہ حق ہوئے۔

اب ذرا ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی حالیہ رپورٹ کی طرف بھی نظر دوڑا لیجیے ۔ معلوم ہو جائے گا کہ ہم من حیث القوم انسانی حقوق کے ضمن میں کہاں کھڑے ہیں۔

رپورٹ کے مطابق 2013 ء کے دوران ملک بھر میں قتل کے 14 ہزار سے زائد مقدمات درج کیے گئے۔ 800 خواتین نے خود کشی کی۔ 56 خواتین کو بیٹی

پیدا کرنے کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔ 869 خواتین کو غیرت کے نام پر قتل کیا گیا۔ 227 افراد کو سزائے موت سنائی گئی۔ ملک بھر کی جیلوں میں 64 فی صد قیدی بغیر کسی عدالتی فیصلے کے بند رہے۔ 55 لاکھ بچے اسکول جانے سے محروم رہے۔ ملک میں 88 ہزار فرضی اسکول قائم ہیں، جب کہ ایک ہزار اسکولوں پر نا جائز قبضہ کیا جا چکا ہے۔ ایک ہزار 786 افراد کے لیے سرکاری ہسپتالوں میں صرف ایک بستر موجود ہے۔ ملک میں 40 فی صد اموات کا سبب آلودہ پانی کے باعث پھیلنے والی بیماریاں تھیں۔ 8 لاکھ بچوں میں سے 35 فی صد کی اموات کی وجہ ناقص خوراک تھی۔ بے روزگاروں کی تعداد 37 لاکھ 20 ہزار سے تجاوز کر گئی۔ پولیو ورکرز پر حملے میں 20 افراد جاں بہ حق ہو گئے۔

ذرا سوچیے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ یہ اندوہ ناک اعداد و شمار صرف ایک سال کے ہیں۔ مجھے " غیرت کے نام پر قتل " کے واقعات پر دکھ کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے۔ دکھ تو فطری ہے کہ ہر درد مند دل رکھنے والے کو ہوتا ہے۔ حیرت اس بات پر کہ ہم فقط عورت کے معاملے میں ہی غیرت مند کیوں ہے؟ غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر اس سانحے کی عملی طور پر بیخ کنی کی جائے جس نے ہماری انفرادی اور اجتماعی ساکھ کو دنیا بھر کی نظر میں بری طرح مجروح کر رکھا ہے۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے۔ نہ جانے ہمارا اجتماعی ضمیر کب جاگے گا؟ نہ جانے ہم کب سمجھیں گے؟

## اسکولوں پر بھی توجہ دی جائے

خبر ہے کہ بلدیہ عظمیٰ کراچی آئندہ تین ماہ میں انجینئرنگ کالج کا آغاز کرے گی۔
تفصیلات کے مطابق ایڈمنسٹر کراچی رؤف اختر فاروقی نے کہا ہے کہ بلدیہ عظمیٰ کراچی آئندہ تین ماہ کے اندر شہر میں ایک انجینئرنگ کالج کا آغاز کر رہی ہے۔ جو ملک بھر میں کسی بلدیاتی ادارے کے زیرِ انتظام پہلا انجینئرنگ کالج ہوگا۔ یہ کالج بلدیہ عظمیٰ کراچی کے کراچی میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج کی طرح معیاری اور ملک بھر میں بہترین کالج ثابت ہوگا۔ ملک کی معروف انجینئرنگ یونی ورسٹی این ای ڈی نے اس کالج کی اپنے ساتھ الحاق کی منظوری دے دی ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ کالج کی منظوری بنیادی چیز تھی۔ پہلے مرحلے میں اس کالج میں الیکٹرانک اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی کلاسوں کا اجرا ہوگا۔ جب کہ ائندہ سال سول اور ٹیکنکل شعبوں کی کلاسیں شروع کی جائیں گی اور مرحلہ وار اس میں اضافہ کیا جائے گا۔
ایک اور خبر کے مطابق ملائشیا، سندھ حکومت کے اشتراک سے ایک میڈیکل کالج قائم کرنا چاہتا ہے۔ کراچی میں قائم کیے جانے والے اس کالج کا نام

انٹرنیشنل میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج ہوگا۔ اس کالج کے دونوں شعبوں یعنی میڈیکل اور ڈینٹل میں نشستوں کی تعداد 100، 100 ہوگی۔ جن پر 70 فی صد سندھ کے طالبعلوں اور 30 فی صد ملائشین طالب علموں کو داخلے دیے جائیں گے۔ کالج کی فیکلٹی اور اسٹاف میں بھی 30 فی صد ملائیشین اور 70 فیصد پاکستانیوں کا تناسب رکھا جائے گا ۔ یہ کالج اگلے تین سالوں میں مکمل ہو جائے گا۔ منصوبے کی ابتدائی لاگت 200 ملین پاکستانی ہیں۔ اس کالج سے تعلیم حاصل کرکے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علموں کو دو اسناد ملیں گی۔ ایک سندھ، لیاقت یونی ورسٹی آف میڈیکل اینڈ ہیلتھ سائنسز جام شورو اور دوسری ملائشین یونی ورسٹی کی ہوگی۔ یہ طالبِ علم دونوں ممالک ( پاکستان اور ملائشیا ) کی میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسلوں سے رجسٹرڈ ہوں گے۔ جن کی وجہ سے یہ دونوں ملکوں میں میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم بغیر کوئی ٹیسٹ دیے حاصل کر سکیں گے۔ نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں گے، بلکہ پریکٹس بھی کر سکیں گے۔

یہ دونوں خبریں اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان خبروں سے معلوم ہوتا ہے ہمارے اعلیٰ حکام بہ صد خلوص اس بات کی سعی کر رہے ہیں کہ جہالت کی تاریکی دور ہو اور علم کی روشنی ہر سو پھیل جائے۔ یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ حکومتِ پاکستان کی طرف سے اس دفعہ 2 فی صد کی بجائے 4 فی صد بجٹ کا حصہ

تعلیم کے لیے مختص کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ خیبر پختون خواہ سے بھی تعلیم کے لحاظ سے مثبت خبریں سننے کو مل رہی ہیں۔ وفاق، سندھ حکومت اور کراچی کے اعلیٰ حکام کی تعلیم کے ضمن میں تشویش اور تعلیم کی شرح بلند کرنے کے لیے انجینئرنگ اور میڈیکل کالج کے قیام کی کوششیں اپنی جگہ اچھے اور لائقِ تحسین و تعریف اقدام ہیں، تاہم تعلیم کی حقیقی معنوں میں شرح بلند کرنے کے لیے گورنمنٹ پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں پر توجہ دینا بھی ناگزیر ہے۔ سندھ کے دیہی علاقوں میں کتنے ہی ایسے اسکول موجود ہیں، جن میں شاگرد تو کیا، استاذ بھی نہیں آتے۔ آئے روز گورنمنٹ اسکولوں کی حالتِ زار کے بارے میں قابلِ افسوس خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ گھوسٹ اسکولوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ابھی کل ہی ایک خبر آئی ہے کہ کھپرو میں 65 ء میں تعمیر کردہ گورنمنٹ اردو پرائمری اسکول کنڈرات میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یہ اسکول 11 کمروں پر مشتمل ہے، لیکن 6 کمروں کی چھت گرنے کی وجہ سے مذکورہ کمرے بند پڑے ہیں۔ باقی پانچ کمروں کی حالت بھی انتہائی مخدوش ہے۔ بارش کا پانی اسکول میں جمع ہو جاتا ہے، جب کہ اسکول میں بیت الخلا اور پینے کے پانی کا بندوبست بھی نہیں ہے۔

گرنمنٹ اسکولوں کی حالتِ زار دیکھ کر متوسط اور امیر طبقے کے لوگ تو اپنے بچوں کو پرائوٹیٹ اسکولوں میں داخل کرا دیتے ہیں۔ جب کہ غریب کا بچہ

اچھی تعلیم سے محروم رہ جاتا ہے۔ گورنمنٹ اسکولوں میں پڑھانے والے اساتذہ کی قابلیت میں میں کوئی شک نہیں ہے۔ اگر متعلقہ حکام گورنمنٹ اسکولوں کی جانب توجہ دیں اور استاذ بھی بہ صد خلوص اور محنت سے پڑھانا شروع کردیں تو عجب نہیں کہ پرائیویٹ اسکولوں کی طرح گورنمنٹ اسکول بھی بچوں سے بھر جائیں۔ اور غریب کا بچہ بھی امیر کے بچے کے مساوی تعلیم حاصل کرسکے۔ میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں کے قیام کے ساتھ ساتھ سندھ کے دیہی اور شہری علاقوں میں پھیلے سینکڑوں اسکولوں پر بھرپور توجہ دی جائے تو ہمارا تعلیمی نظام مزید بہتر ہو سکتا ہے۔

ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ تعلیم کو طبقاتی کش مکش سے نکالا جائے۔ ہمارے ہاں غریب کے بچے کو وہ تعلیمی مواقع حاصل نہیں ہوتے، جو امیر کے بچے کو ہوتے ہیں۔ یہ سراسر ناانصافی ہے۔ اگر حکامِ بالا نے اپنی توجہ فقط جدید کالج اور یونی ورسٹیاں بنانے میں صرف کردی اور سیکنڈری تک کی تعلیم کو پرائیویٹ اسکولوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تو پھر طبقاتی نظام یوں ہی غریب کے بچے کے تعلیم ارمانوں کا خون کرتا رہے گا۔

: نوٹ : میرا فیس بک رابطے کا ایڈریس یہ ہے )

https://www.facebook.com/naeemurrehmaan.shaaiq)

# جیوئل کاکس ، ریمنڈ ڈیوس ، ایف بی آئی وغیرہ

پچھلے دنوں خبر آئی کہ کراچی پولیس نے ایک امریکی شہری کو کراچی ایئرپورٹ سے گرفتار کیا۔ یہ شخص اسلام آباد جا رہا تھا۔ اس شخص کے بیگ سے اس وقت نائن ایم ایم پستول کی پندرہ گولیاں اور ایک میگزین برآمد ہوا۔ پاکستان کی فیڈرل انوسٹگیشن ایجنسی (ایف۔آئی۔اے) نے ایئرپورٹ پولیس اسٹیشن میں اس شخص پر سندھ آرمز ایکٹ کے سیکشن 23 اے تحت مقدمہ درج کر دیا۔ عدالت میں پیش کیے جانے پر مبینہ شخص کو دس مئی تک پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا۔

اس شخص کے گرفتار ہوتے ہی امریکی حکام حرکت میں آ گئے۔ بی بی سی اردو کے مطابق امریکی سرکاری ذرائع ابلاغ نے سرکاری ذرائع کے حوالے سے لکھا ہے کہ کراچی ایئر پورٹ سے گرفتار ہونے والے امریکی شہری ایف بی آئی کے ایجنٹ ہیں۔ جو عارضی طور پر پاکستان میں تعینات تھے۔

جیوئل کاکس نامی یہ شخص منگل کے روز گرفتار ہوا۔ اس سے اگلے دن ہی امریکی حکام نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ مبینہ شخص ایف بی آئی کا ایجنٹ ہے۔

امریکی محکمۂ خارجہ نے بھی اس شخص کے ایف بی آئی کے ایجنٹ ہونے کی تصدیق کر دی۔ امریکی حکام نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی تعیناتی امریکی ریاست میامی کے فیلڈ آفس سے کی گئی تھی۔ اسے پاکستانی پولیس کی تربیت کے لیے 3 ماہ کے لیے پاکستان بھیجا گیا تھا۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ مبینہ شخص اگرچہ پاکستانی پولیس کے تربیت کے لیے آیا تھا، لیکن اسے گرفتار بھی پاکستانی پولیس نے کیا۔ گویا یہ شخص آیا تو پولیس کی تربیت کے لیے تھا، لیکن پاکستانی پولیس کو معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص ان کی تربیت کے لیے آیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ دور کا میڈیا بہت تیز ہے۔ امریکا کی طرف سے پاکستان کے لیے چھوٹی چھوٹی " خدمات " بھی ہائی لائٹ ہو جاتی ہیں۔ مبینہ شخص اگر (امریکی حکام کے موقف کے مطابق) پاکستانی پولیس کی تربیت کے لیے آیا تھا تو اتنی اہم خبر کی بھنک پاکستانی میڈیا کو کیوں نہیں پڑی؟

بعد میں یہ خبر بھی پڑھنے کو ملی کہ ایف بی آئی کے اس ایجنٹ کے لیپ ٹاپ سے کراچی کی اہم معلومات امریکا کو بھیجنا کا انکشاف ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس شخص کے بیگ سے ایک چاقو اور ایک آہنی مکا بھی ملا ہے۔

لیکن اتنے خطرناک مجرم کو خصوصی پروٹوکول فراہم کیا گیا۔ اگلی صبح ہوتے ہی ملزم کو غیر ملکی ریسٹورینٹ کا ناشتا بھی پیش کیا گیا۔ ملزم کو لاک اپ کے بجائے علیحدہ کمرے میں رکھا گیا۔ یوں ایک بار پھر ریمنڈ ڈیوس کی یاد تازہ ہو گئی، جس نے لاہور کے دو شہریوں کو قتل کیا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔

بلا شبہ یہ امریکی حکام کی شدید فعالیت کا مظہر ہے کہ دس مئی سے پہلے پہلے ایف بی آئی کا یہ ایجنٹ رہا ہو گیا۔ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملیر محمد یامین نے گرفتار امریکی شہری جیوئل کاکس کی دس لاکھ روپے کی ضمانت منظور کرتے ہوئے اسے رہا کر دیا۔

ایف۔ بی۔ آئی کے اس ایجنٹ کے فوری رہا ہونے پر میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ہمارا کوئی آدمی امریکی ائیر پورٹ سے نائن ایم ایم گولیوں کے ساتھ گرفتار ہوتا تو کیا امریکا بھی اس شخص سے وہی سلوک کرتا، جو ہم نے کیا ہے؟ کیا وہ شخص بھی ضمانت پر رہا کر دیا جاتا؟ اور اگر اس شخص کے لیپ ٹاپ سے خفیہ معلومات پاکستان کو بھیجنے کا انکشاف ہوتا تو امریکا اس کو محض دس لاکھ روپے کی ضمانت پر رہا کر دیتا؟ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا اس شخص کی گرفتاری پر پاکستانی حکام کی وہی فعالیت نظر آتی، جو امریکی حکام نے اپنے

شخص کی گرفتاری پر دکھائی ؟ہر گز ایسا نہ ہوتا۔ اگر امریکا ایسا نہیں کرتا تو ہم کیوں ایسا کر رہے ہیں ؟

پاکستان کے حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے ہیں ۔ شہر قائد کی خونی ٹارگٹ کلنگ نے پورے پاکستان کی فضا سوگ وار کر رکھی ہے ۔ ایسا کوئی دن مشکل ہی آتا ہے ، جس دن کراچی میں کوئی لاشہ نہ گرے ۔ اس میں شک نہیں کہ فرقہ واریت ، زبان اور قوم کے نام پر گرائی جانے والی اکثر لاشوں میں وطنِ عزیز کے بھٹکے ہوئے باسیوں کا ہاتھ ہے ، لیکن جیوئل کاکس اور ریمنڈ ڈیوس جیسے امریکی باشندے سر عام پاکستان کے ائر پورٹوں اور گلیوں میں گھومیں پھریں اور ہمارے شہروں کی معلومات امریکا تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ ہمارے شہریوں کو بھی کھلم کھلا قتل کرتے جائیں ، تو اس صورت میں کراچی کی ٹارگٹ کلنگ ، بلوچستان کی علیحدگی پسند تحریکات اور خیبر پختون خوا کے بم دھماکوں میں ایف بی آئی اور بلیک واٹر کے ایجنٹوں کی کارفرمائی کا سرے سے انکار ہر گز ۔۔۔ہر گز قرینِ مصلحت نہیں ہے ۔

نہ جانے ہم امریکا سے اتنے خائف کیوں ہے ؟نہ جانے ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم صحیح ، غلط کی کی تفریق کے بغیر امریکا کی ہر بات ماننے پر مجبور ہو چکے ہیں ۔ اگر ہم یوں ہی رہے تو پھر پاکستان کی سلامتی کو لاحق خطرات سے کسی

صورت نہیں نمٹ سکیں گے۔ اگر امریکا ہمارا سو فیصد دشمن نہیں تو سو فی صد یار بھی نہیں ہے۔ یہ بات ہمارے حکام بالا کو سمجھنی چاہیے۔ ہمارے حکمرانوں کو اس بات کا بھی ادراک کرنا چاہیے کہ اگر امریکا ہماری مدد کر رہا ہے تو اسکا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ ہم امریکا کی ہر بات مانتے ہوئے " جی حضور، جی حضور" کرتے رہیں۔

یہ نازک وقت متقاضی ہے کہ پاکستان کی خود مختاری اور سلامتی کو لاحق خطرات سے نمٹنے کے لیے امریکا کی ہر بات ماننے کی پالیسی ترک کر دینی چاہیے۔

(نوٹ : میرا فیس بک رابطے کا ایڈریس یہ ہے :

https://www.facebook.com/naeemurrehmaan.shaaiq)

# کراچی آپریشن ـــــ ہنوز دلی دور است

گذشتہ روز وزیرِ اعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ کی زیرِ صدارت وزیرِ اعلیٰ ہاؤس میں سندھ کابینہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ کابینہ اجلاس میں تمام صوبائی وزراء، چیف سیکریٹری سندھاور سیکریٹری داخلہ سمیت اہم شخصیات نے شرکت کی۔ اس خصوصی اجلاس میں کابینہ نے سندھ پولیس کو جدید آلات سے آراستہ کرنے اور ٹارگٹ آپریشن کو کامیاب بنانے کے لیے وفاق سے 27 ارب روپے کے مالی پیکج کی فراہمی کی سفارش کی۔ کابینہ نے دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے علیحدہ سے "محکمہ انسدادِ دہشت گردی" (کاؤنٹر ٹیررازم کا محکمہ) قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ریپڈ رسپانس فورس کو جدید تربیت دینے اور پولیس کے محکمے سے کالی بھیڑوں کے صفائے جیسے اہم فیصلے بھی کیے گئے۔ اجلاس میں 26 پولیس اسٹیشنوں اور کراچی، حیدر آباد اور لاڑکانہ کی سینٹرل جیلوں کو حساس قرار دیا گیا۔ کابینہ نے حساس قرار دی گئ سینٹرل جیلوں پر اضافی فورس کی تعیناتی سمیت تمام تر حفاظتی اقدامات کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔

چیف سیکریٹری سندھ نے اجلاس کو بتایا کہ انسدادِ ہشت گردی کورٹس کی ملیر

کینٹ منتقلی کا کام جاری ہے۔ سنگین جرائم میں ملوث ملک سے بھاگے ہوئے مجرموں کی گرفتاری کے لیے ریڈ وارنٹس کے اجرا کے لیے وفاقی حکومت سے رجوع کیا گیا ہے، تاکہ انھیں انٹرپول کے ذریعے گرفتار کیا جا سکے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ 10 ہزار پولیس اہل کاروں، 2 ہزار ریٹائرڈ آرمی اہلکاروں اور 400 انویسٹی گیشن افسران کی بھرتیاں بھی جاری ہیں۔ انسدادِ دہشت گردوں کی عدالتوں میں بھیجے گئے 705 چالانوں میں سے 59 کے فیصلے ہو چکے ہیں۔ 5 سزا یافتہ قیدی صوبے سے باہر، جب کہ 77 کو کراچی سے باہر کی جیلوں میں منتقل کیا گیا ہے۔

قائم مقام آئی جی پولیس سندھ غلام حیدر جمالی نے کابینہ کو بتایا کہ ٹارگٹڈ آپریشن کے باعث قتل کیسز میں 33 فی صد، ٹارگٹ کلنگ میں 65 فی صد، اسٹریٹ کرائم میں فی صد اور بھتا خوری کے کیسز میں 9 فی صد تک کمی ہوئی ہے۔ 6

کراچی آپریشن کے سلسلے میں سندھ کابینہ کے اجلاس میں ہونے والے اہم فیصلے اللہ کرے مؤثر ثابت ہوں۔ لیکن یہ بات حقیقت ہے کہ فقط فیصلوں سے کام نہیں چلے گا۔ اصل بات ان فیصلوں پر عمل پیرا ہونا ہے۔ اس اجلاس میں ہونے والے فیصلوں میں سے اگر آدھے فیصلوں پر بھی عمل کر لیا جائے تو اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ستمبر 2013ء سے شروع ہونے والے اس آپریشن میں سندھ

حکومت (بہ قول ان کے اپنے) 20 ارب روپے خرچ کر چکی ہے۔ موجودہ وفاقی حکومت نے کراچی کے حالات کی بہتری کے لیے جو پالیسی اپنائی ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ مجموعی طور پر حالات میں واقعی تبدیلی آئی ہے۔ قائم مقام آئی جی کے پیش کردہ اعداد و شمار اس بات کا مظہر ہیں کہ حالیہ آپریشن سے واقعی بہت سی مثبت تبدیلیاں آئی ہیں۔ تاہم شہر قائد اب بھی مکمل طور پر سکھی نہیں ہوا۔ اپنے دامن میں بلا تفریقِ مذہب، مسلک و زبان ہر ایک کو پناہ دینے والا یہ پیارا شہر اور اس کے پیارے باسی اب بھی تشنۂ امن ہیں۔ روزانہ لاشوں کا گرنا اب بھی معمول ہے۔ اس لیے مزید محنت کی ضرورت ہے۔ میں اور میری طرح کے شہر قائد کے باسی اس دن سیاسی اور سیکورٹی حکام کے کارکردگی سے مطمئن ہوں گے، جس دن یہاں فرقہ واریت، لسانیت، صوبائیت، سیاست وغیرہ کے نام پر ہونے والے قتل کا سلسہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم جائے گا۔ جب یہاں بوری بند لاشوں کا ملنا قصہِ پارینہ بن جائے گا۔ جب یہاں بھتا خوری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ تب ہم سمجھیں گے کہ واقعی یہ شہر پر امن ہو گیا ہے۔ بہ صورتِ دیگر، سیاست کے شہ سواروں کے فیصلوں اور محافظین کے مثبت اعداد و شمار کے باوجود ہم ایسے دل جلے گاہے بہ گاہے اپنی تحریروں کے ذریعے شہر قائد کے ناگفتہ بہ حالات کا رونا روتے رہیں گے۔

یہ بات خوش آیند ہے کہ پاکستان کے سب سے اہم شہر کے حالات کی بہتری کے لیے

وفاقی اور صوبائی حکومتوں سمیت اہم سیاسی جماعتیں ایک ہی صفحے پر آ گئی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بدھ کو گورنر ہاؤس کراچی میں وزیرِ اعظم نواز شریف کی زیرِ صدارت کراچی کے حالات پر اہم اجلاس ہوا تو سابق صدر آصف علی زرداری، گورنر سندھ، صوبائی وزیرِ اعلیٰ، آرمی چیف، آئی ایس آئی کے سربراہ، ڈی جی انٹیلی جنس بیورو، سیکرٹری داخلہ سندھ، ڈی جی رینجرز، قائم مقام آئی جی سندھ، ایڈیشنل آئی جی کراچی کے علاوہ متحدہ قومی موومنٹ، جماعتِ اسلامی، اے این پی اور مسلم لیگ کے نمائندوں نے بھی شرکت کی ۔ ان سب نے اس اہم اجلاس میں شرکت کرکے یہ بات ثابت کردی کہ وہ سب کراچی کو جرائم سے پاک کرنے کے لیے حکومت کے ساتھ ہیں ۔ وزیرِ اعظم نے اس اجلاس میں اتفاقِ رائے کے بعد آپریشن کے تیسرے مرحلے کی اجازت بھی دے دی ۔ سیاسی اور فوجی قیادتوں نے اس امر پر اتفاق کیا کہ ٹارگٹڈ آپریشن کسی امتیاز اور دباؤ کے بغیر جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ پولیس کو فری ہینڈ دیا جائے گا ۔ آپریشن کے دوران عسکری اور انٹیلی جنس ادارے کراچی پولیس اور رینجرز کی مکمل معاونت کریں گے ۔ آپریشن کے دوران پیدا ہونے والی شکایات کے ازالے اور غیر قانونی سموں کی بندش کے لیے اعلیٰ سطحی کمیٹی قائم کی جائے گی ۔ اس کے علاوہ اور بھی اہم فیصلے کیے گئے۔

ایک خبر کے مطابق شہر قائد میں 2013 ء میں 20507 لوگ قتل کیے گئے۔ جب کہ

میں مختلف وجوہات کی بنا پر قتل ہونے والوں کی تعداد تقریبا 2000 رہی ۔ 2012
اب دیکھتے ہیں کہ 2014 ء کے اختتام پر اس ضمن میں اعداد و شمار کیا کہیں گے ۔ کیوں
کہ اس دفعہ شہر قائد کے حالات کی درستی کے لیے سب یک جا ہو گئے ہیں ۔ ہم امید
کرتے ہیں کہ برسوں سے لگی آگ ،حکامِ بالا کی کوششوں سے بجھ جائے گی ۔ مگر
!! ۔۔۔۔ ہنوز دلی دور است

## مسئلہِ شام ۔۔۔۔ کب حل ہوگا؟؟

شام میں پچھلے تین سالوں سے جاری خانہ جنگی پر امتِ مسلمہ کے ہر دردمند آدمی کو تشویش ہے۔ مارچ 2011 ء سے شروع ہونے والی اس جنگ میں اب تک قریباً ایک لاکھ ساٹھ ہزار سے زائد آدمی ہلاک ہو چکے ہیں۔ یہاں کی حالتِ زار کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت یہاں اوسطاً ایک ہفتے میں ایک ہزار سے زائد افراد ہلاک ہو رہے ہیں۔ ایک اور اندازے کے مطابق قریباً 5000 افراد روزانہ کی بنیاد پر یہاں سے ہجرت کر رہے ہیں۔ 2012 ء میں شام کی آبادی 2 کروڑ 25 لاکھ 30 ہزار 746 نفوس پر مشتمل تھی۔ جب کہ اس وقت یہاں کی آبادی قریباً 2 کروڑ 87 ہزار ہے۔

شام کے حالیہ بحران اور خانہ جنگی کی وجوہات کیا ہیں ؟ اس سوال کا جواب حسن عبد اللہ النوری کی درج ذیل باتوں سے بہ آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ حسن عبد اللہ النوری شام کے 3 جون کو ہونے والے صدارتی انتخابات کے امیدوار ہیں۔

" حالیہ دنوں میں ملک بد ترین خانہ جنگی کا شکار ہے اور اس میں زیادہ قصور

حکومت کا ہے، کیوں کہ شروع میں شامی عوام حکومت کی معاشی پالیسیوں خاص طور پر مہنگائی اور روز مرہ کی اشیا کی عدم دست یابی کے مسائل کی وجہ سے حکومت کے خلاف کھڑے ہوئے اور مظاہرے کیے، جسے حکومت نے انتہائی بے دردی سے روکنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں عوامی غیض و غضب کا لاوا ابل پڑا۔ ظاہر سی بات ہے کہ ایک ایسا ملک، جہاں 40 سال سے ایمرجنسی نافذ ہو اور حکومت کی اجازت کے بغیر پانچ افراد کہیں اکٹھے نہ ہو سکتے ہوں اور اس پر مستزاد یہ کہ مہنگائی میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہو تو حکومت کے خلاف عوام کا یہ ردِ عمل فطری تھا، جسے انتہائی بے ڈھنگے انداز سے کنٹرول کرنے کی کوشش کی گئی اور آج اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

ان کا مزید کہنا ہے کہ ملک میں احساسِ محرومی کی ایک بڑی وجہ دولت کا ارتکاز بھی " ہے، جو صرف 100 خاندانوں تک محدود ہے اور ان میں غالب اکثریت حکم ران طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ کہ حکم ران علوی فرقہ ملک میں ایک چھوٹی مذہبی اقلیت ہے، جو مک کے تمام وسائل پر قابض ہے۔ یہ بات بھی وہاں کی اکثریت کو اشتعال میں لانے کا ایک بڑا سبب ہے۔" (روز نامہ " جہان پاکستان "، 23 مئی 2014ء)

عرب ممالک، بہ شمول امریکا اور اقوام متحدہ کی مخالفت کے باوجود بشار

الاسد اپنی پوزیشن پر قائم ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ امریکا، اقوام متحدہ اور عرب ممالک بشار الاسد کی پالیسیوں کے زبردست مخالف ہیں۔ یہ سب حتی الامکان اس کوشش میں سرگرمِ عمل ہیں کہ کسی نہ کسی صورت میں بشار الاسد اپنے عہدے سے دست بردار ہو جائیں، تاکہ شام کی خانہ جنگی رک جائے، لیکن ان سب کی کوششیں رائیگاں جارہی ہیں، کیوں کہ بشارالاسد کو ایران، حزب اللہ کے ساتھ ساتھ روس اور چین جیسی عالمی طاقتیں بھی سپورٹ فراہم کر رہی ہیں۔ ایران کا اس ضمن میں موقف ہے کہ بشار کی حکومت اسرئیل کے لیے ایک بند کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ بشار کو سپورٹ کیا جائے۔ پھر روس اور چین ان پانچ ممالک میں شام ہیں، جنھیں ویٹو کا حق حاصل ہے۔ بشار کے خلاف اور شام کے عوام کے حق میں جو بھی قرار داد اقوامِ متحدہ میں پیش کی جاتی ہے، روس اور چین ان کو ویٹو کر دیتے ہیں۔ روس اور چین کی اسی سپورٹ کی وجہ سے بشار تین سال سے جاری خانہ جنگی کے با وجود اپنی مسند پر براجمان ہیں۔

شام کا حالیہ بحران اس وقت امتِ مسلمہ کے بڑے مسائل میں سے ایک بن چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ مسلم دنیا کا ہے۔ اس لیے اسے مسلمان ہی حل کر سکتے ہیں۔ عالمی افق پر سعودی عرب ( بہ شمول اس کے حامی ) اور ایران ( بہ شمول اس کے حامی ) کی باہمی مخاصمت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ شام کے

مسئلے کے پائدار حل کے لیے سعودی عرب اور ایران کا یک جا ہونا پڑے گا اور ایک ہی میز پر بیٹھ کر امت کے اس نئے، مگر مہلک ناسور کے جڑ سے خاتمے کے لیے پالیسیاں وضع کرنی ہوں گی۔ یہی اس مسئلے کا واحد حل ہے۔ بصورتِ دیگر شام اسی طرح عالمی طاقتوں کے بھینٹ چڑھتا رہے گا۔

شام کے عوام میں فرقہ واریت کے نام پر مزید قتل ہونے کی ہمت نہیں ہے۔ شام کے مضطرب لوگ پوری پوری امتِ مسلمہ سے سوال کر رہے ہیں کہ آخر کب ہمیں امن و سکون میسر آئے گا؟ آخر کب فرقہ واریت کے نام پر قتل ہونے کا سلسلہ تھمے گا؟ آخر کب مسلم دنیا کی بڑی طاقتیں ہمارے مسئلے کے حل کے لیے بہ صد خلوص، اپنے مفادت کو بالائے طاق رکھ کر، کوشاں ہوں گی؟

# بالآخر امریکا جارہا ہے

بالآخر امریکا افغانستان سے کوچ کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں امریکا کے صدر باراک اوباما نے افغانستان کے دارالحکومت کابل کے قریب بگرام فوجی اڈے کا غیر اعلانیہ دورہ کیا۔ وہاں انھوں نے فوجیوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ نوید سنائی کہ امریکا کی تاریخ کی طویل ترین جنگ 2014ء کے اختتام تک "ذمہ دارانہ" انجام تک پہنچ جائے گی۔

برطانوی نشریاتی ادارے کے مطابق: " افغانستان سے غیر ملکی فوجیوں نے 2014ء کے اختتام تک انخلا کرنا ہے۔ امریکا کی کوشش ہے کہ وہ افغانستان میں ایک چھوٹی سی فوج چھوڑ کر جائے۔ تاہم اس کا انحصار آئندہ ماہ ہونے والے افغان صدارتی انتخاب کے دوسرے مرحلے میں کام یابی پانے والے امیدوار پر ہوگا۔ (افغانستان کے دوسرے مرحلے کے انتخابات 14 جون سے ہوں گے۔) باہمی سکیورٹی کے معاہدے پر دستخط کرنے سے صدر حامد کرزئی انکار کر چکے ہیں۔"

صدر اوباما نے بدھ کو نیویارک میں ویسٹ پوائنٹ کے مقام پر امریکی ملٹری اکیڈمی سے خطاب کرتے ہوئے افغانستان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اب افغانستان میں امریکا کا کردار مشاورت اور تربیت تک محدود ہوگیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ 2009ء سے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں

ہماری حکمتِ عملی کا مرکزی نقطہ القاعدہ کی مرکزی قیادت تھی، لیکن ساڑھے چار برس میں میدان بدل چکا ہے اور اس دوران پاکستان اور افغانستان کی سرحدوں کے درمیان موجود القاعدہ کی قیادت کو مسمار کر دیا گیا ہے۔

امریکی صدر ایک اور موقع پر یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ وہ افغانستان میں فوجی مشن کے اختتام پر 2014ء کے بعد کے بعد 9800 امریکی فوجیوں کو وہاں رکھیں گے۔

2016ء کے بعد ان فوجیوں کی معمولی تعداد وہاں رہے گی۔

امریکا تو جا رہا ہے، لیکن دس سال سے زیادہ رہنے والی اس جنگ کے دوران جو زخم افغانستان اور پاکستان کو لگے ہیں، نہ جانے وہ کب بھریں گے۔ امریکا کی اسی جنگ کے ردِ عمل میں ہی افغانستان اور پاکستان میں مہلک اور جان لیوا دہشت گردی نے جنم لیا۔ 11/9 سے پہلے پاکستان کے حالات اس قدر شورش زدہ نہیں تھے، جتنے آج ہیں۔ پاکستان میں دہشت گردی کا سورج 11/9 کے بطن سے طلوع ہوا۔ اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ دہشت گردی ہے۔ کراچی سے لے کر خیبر تک، ہر جگہ دہشت گردی نے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ نہ جانے کتنے لوگ پاکستان میں جاری اس دہشت گردی کے بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ یعنی امریکی جنگ کا سب سے بڑا "فائدہ" افغانستان اور پاکستان کو یہ ہوا کہ یہاں ایک نہ ختم ہونے والی دہشت گردی نے جنم لیا۔

امریکا کی اس جنگ کا ایک " فائدہ" یہ بھی ہوا کہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کی فضا قائم ہو گئی۔ آج ہی ایک خبر آئی ہے کہ پاک فوج نے افغانستان سے چیک پوسٹ پر ہونے والے حملے کو ناکام بنا دیا ہے۔ پاکستان نے حملے پر افغان ناظم الامور کو دفتر خارجہ طلب کرکے افغان حکومت سے شدید احتجاج کیا۔ پاکستان اور افغنستان کے درمیان کشیدگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ افغان صدر حامد کرزئی جس طرح امریکا سے نالاں ہیں، اسی طرح وہ پاکستان سے بھی ناراض ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے دنوں جب وہ نریندر مودی کی تقریبِ حلف.برداری میں شرکت کے لیے بھارت گئے تو انھوں نے ہرات میں بھارتی قونصلیٹ پر حملے میں پاکستان کی ایک تنظیم کو موردِ الزام ٹھہرادیا۔

افغنستان اور پاکستان کے درمیان حالیہ کشیدگی کی بہت سی وجوہات ہیں۔ لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان نے امریکا کی نام نہاد جنگ میں امریکا کے " حریف " نہیں، بلکہ " حلیف" کا کردار ادا کیا۔ امریکا اب تک پاکستان کو اتحادی سپورٹ فنڈ کی مد میں مالی مدد فراہم کرتا ہے۔ اب تک پاکستان کو اس مد میں 11 ارب ڈالر مل چکے ہیں۔ مجھے اس بات کا حقیقی ادراک نہیں ہے کہ پاکستان نے 11/9 کے بعد امریکا کا " حلیف" بننا کیوں پسند کیا۔ البتہ میں

افغانستان اور پاکستان کے درمیان حالیہ کشیدگی کی سب سے بڑی وجہ یہی سمجھتا ہوں۔
اس بات کو امریکا تسلیم کرتا ہے کہ افغانستان اس وقت شورش زدہ ملک بن چکا ہے۔
امریکا اس بات کا بھی ادراک رکھتا ہے کہ اس کے مکمل انخلا سے افغانستان میں خانہ جنگی شروع ہو سکتی ہے۔امریکی صدر نے پچھلے دنوں اس بات کا کھلم کھلا اعتراف کیا کہ 2014ء کے بعد افغانستان مکمل طور پر پر امن نہیں ہوگا اور یہ امریکا کی زمہ داری بھی نہیں ہے کہ وہ اسے ایسا بنائے۔۔ واہ واہ۔۔۔ گویا امریکا کی " زمہ داری" صرف اور صرف افغانستان بہ شمول پاکستان کو ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں دھکیلنا تھا۔ اس کا یہ مقصد پورا ہو گیا ہے۔اس لیے اب وہ جا رہا ہے !!!

پچھلے دس سالوں سے زائد عرصے سے جاری اس جنگ میں افغانستان میں 2700 غیر ملکی فوجی ہلاک ہو چکے ہیں، جب کہ 14000 سے زائد امریکی فوجی زخمی ہو چکے ہیں۔
اس جنگ میں 8 لاکھ 31 ہزار 576 امریکیوں نے حصہ لیا۔اس جنگ میں امریکا کے 537.8 بلین ڈالر خرچ ہوئے۔ یہ بھی خبر ہے کہ غیر ملکی افواج اور ان کے زیرِ استعمال اسلحہ و دیگر جنگی سامان افغانستان سے باہر لے جانے کے لیے کم و بیش 218000 گاڑیاں اور کنٹینرز درکار ہیں۔امریکی فوج عراق سے تو

بہ آسانی نکل آئی تھی ، کیوں کہ وہاں اسے موٹر وے کی سہولت حاصل تھی ۔ جس کے ذریعے وہ کویت کے ساحل تک پہنچ گئی تھی ، لیکن اس کے مقابلے میں افغانستان سے انخلا کا عمل ایک بھیانک شکل اختیار کر سکتا ہے ۔ قصہ مختصر یہ کہ امریکا کو افغانستان سے نکلنے کے لیے بھی کئی ڈالرز خرچ کرنے ہوں گے ۔

سوچتا ہوں کہ 11/9 کے ردِ عمل میں امریکا نے جس طرح ایک جہادی تنظیم کے خاتمے کے لیے اپنے وسائل بروئے کار لائے ، کیا وہ اپنے مقصد کام یاب ہو سکے گا ؟؟ کیا اس کے بعد پھر کبھی 11/9 سے ملتا جلتا واقعہ انسانی تاریخ میں کبھی پیش نہیں آئے گا؟؟؟

## بتاؤ مجھے کیوں؟ "Tell Me Why?"

حالاتِ حاضرہ پر بہت سے کالم ہو گئے ۔ اب دل کرتا ہے، ذائقہ بدلنے کے لیے کوئی اور موضوع چھیڑوں ۔

پرانی کتابوں کی دوکان سے گزرتے ہوئے دل میں خیال آیا کہ اندر جا کر دیکھتا ہوں کہ کس قسم کی کتابیں رکھی ہیں ۔ اگر میرے مزاج کے مطابق کوئی کتاب ہوئی تو خرید لوں گا ۔ بوسیدہ سی اس دوکان میں جا بہ جا کتابیں بکھری پڑی تھیں ۔ وہ لوگ واقعی داد و تحسین کے مستحق ہیں، جو اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں بھی بڑی بے نیازی سے پرانی کتابیں بیچ رہے ہیں ۔ ایک کتاب مجھے اپنے مزاج کے مطابق مل گئی ۔ اس کتاب کا نام تھا "Tell Me Why". اس کتاب کے مصنف "Arkady Leokum" تھے ۔ 330 صفحات پر مشتمل یہ کتاب کئی اہم موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے تھی ۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد ان چھوٹے چھوٹے سوالات کا جواب دینا تھا، جو عام طور پر ہمارے ذہنوں میں اٹھتے ہیں یا اٹھ سکتے ہیں ۔ میں نے وہ "پرانی" کتاب خرید لی ۔ گھر آ کر اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا ۔ آج میں اسی کتاب کے چند موضوعات اپنے قارئین سے شیر کرنا چاہتا ہوں ۔

:۔کارٹونز کی ابتدا1

آج شاید ہی کوئی ایسا اخبار ہو، جس میں روزانہ کسی نہ کسی کارٹون کی اشاعت نہ ہوتی ہو۔اس کتاب کے مطابق جدید کارٹون کی بنیاد رکھنے والے (Father of Modern Cartoon) ولیم ہوگارتھ (1697-1764) تھے۔ولیم ہوگارتھ انسانی فطرت، کردار اور عادت سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ان کے بنائے ہوئے کارٹونز اگرچہ مزاحیہ ہوتے تھے، لیکن شراب خوری، ہر قسم کے جرائم اور الیکشنز میں ہونے والی دھاندلیوں جیسے تلخ موضوعات کا احاطہ کرتے تھے۔ہوگارتھ کے کام کو ایک اور کارٹونسٹ تھامس رولینڈسن نے جاری رکھا۔تھامس رولینڈسن کے کارٹونز کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بشری خصوصیات (Features) کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے،تاکہ لوگوں کی ہنسی کا سامان بن سکے۔19 ویں صدی کی ابتدا میں یورپی رسائل و جرائد نے کارٹون شائع کرنے شروع کیے۔جو کہ اس وقت کے حالات کے بارے میں ہوتے تھے۔یہیں سے سیاسی کارٹونز شایع کرنے کی ابتدا ہوئی اور یہ رسم اب تک جاری ہے۔سیاسی کارٹونسٹس میں سب سے مشہور ایک فرانسیسی کارٹونسٹ ہونور ڈاؤمیر (1879-1808) تھے۔انھوں نے گورنمنٹ کی کرپشن اور سیاسی لوگوں کو اپنے کارٹونز کا تھیم بنایا۔انھوں نے اپنے حاکم کے بارے میں ایک مزاحیہ کارٹون بنایا تو انھیں چھ مہینوں کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

:۔ حجامت کی ابتدا2

اس کتاب کے مطابق حجامت کی ابتدا مصر سے ہوئی۔ اس کے بعد قدیم یونان اور قدیم روم کی حجام کی دوکانیں لوگوں کی اہم نشست گاہیں ہوا کرتی تھیں، جہاں لوگ حالاتِ حاضرہ پر باہمی گفت و شنید کرتے۔ لفظ "باربر" لاطینی زبان کے لفظ "باربا" سے نکلا یعنی داڑھی ہے۔ اس نام کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ Beard ہے۔ جس کے معنی شاید لاطینی حجاموں کے لیے سر کے بال بنانے سے زیادہ اہم داڑھی کے بالوں کی تراش خراش اور درستی ہو۔ قدیم زمانے کے حجام نہ صرف حجام ہوتے تھے، بلکہ سرجن بھی ہوتے تھے۔

:۔ اپریل فول کی ابتدا3

اس کتاب کے مطابق اپریل فول کی ابتدا فرانس سے ہوئی۔ جب کیلنڈر کی اصلاح کی گئی تو فرانسیسیوں نے سب سے پہلے اصلاح شدہ کیلنڈر پر عمل درآمد کیا۔ چارلس نہم نے 1564ء میں حکم دیا کہ کیلنڈر یکم جنوری سے شروع کیا جائے۔ (اس سے پہلے کیلنڈر یکم اپریل سے شروع ہوتا تھا۔) چارلس کے اس حکم کے بعد نیا سال یکم جنوری سے تو شروع ہو گیا، لیکن وہ لوگ جو یکم اپریل کو سال کا پہلا دن قرار دیتے تھے، انھوں نے اس حکم پر اعتراض کیا۔ اور ردِ عمل کے طور پر اپریل فول کی ابتدا کی۔

4۔ ریاضی کی ابتدا:

اس کتاب کے مطابق ریاضی کو کسی نے "ایجاد" نہیں کیا۔ یہ لوگوں کی ضروریات کے مطابق نشونما پاتی گئی۔ ابتدا میں یہ "مقدار" پر مشتمل تھی، نہ کہ "اعداد" پر۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو "اعداد" کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس طرح آہستہ آہستہ نمبر ایجاد ہوتے رہے۔ پھر انسان کو 1 سے کم اعداد اور نمبروں کے درمیان کے نمبروں کی ضرورت محسوس ہوئی تو کسور (Fraction) نے نشونما پائی۔ اس کے بعد منفی اعداد ایجاد کیے گئے۔

قارئین کے قیمتی وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی پر انتہا کرتا ہوں۔

## کتابوں سے دوری

کتابیں شعور و آگہی بخشتی ہیں ۔کتابیں علم و عرفاں کے نئے دریچے وا کرتی ہیں ۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہیں کہ کتابوں سے ہی یہ جہاں منور ہے ۔ہر بڑے آدمی کو بڑا آدمی بنانے میں کتاب نے اہم کردار ادا کیا ہے ۔ دنیا کے ہر علم کا سب سے بڑا منبع کتاب ہی ہے ۔کتاب ہی سے علم پروان چڑھتا ہے ۔ کسی دانا نے خوب کہا: بغیر کتابوں کے گھر ایسا ہے، جیسے بغیر روح کے جسم ۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں کتابیں پڑھنے کا رجحان دن بہ دن کم ہوتا جا رہا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ بھی کتابوں سے دور بھاگتے ہیں، جنھیں کتابوں کے قریب ہونا چاہیے تھا۔ طالبِ علم اور استاذ نے اپنے آپ کو فقط نصابی کتابوں تک محدود کر دیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلومات کی کمی کا شکار ہوتے ہیں ۔ انھیں صرف وہی معلوم ہوتا ہے، جو یہ نصابی کتابوں میں پڑھتے ہیں ۔کتابوں سے دوری کا رجحان نہ استاذ اور شاگرد کے لیے مفید ہے، نہ عام لوگوں کے لیے ۔کتابیں نہ پڑھنے کی وجہ سے جہالت جنم لیتی ہے ۔ جہالت کا مطلب ہوتا ہے :

"جذبات کی رو میں

بہہ کر باوجود کم علم ہونے کے سب کچھ کہہ دینا۔ " یہ بات طے ہے کہ کم علم شخص ہی جذباتی ہوتا ہے۔ بہت زیادہ پڑھا لکھا اور باشعور شخص ہر بات تول تول کر بولتا ہے ۔ہمارے ہاں ہر دوسرا آدمی تبصرہ نگار ہے۔ جسے دیکھو، حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس تبصرے کی سب سے اہم خصوصیت "جذباتی رائے زنی" ہوتی ہے۔ یعنی " تبصرہ نگار" جس شخص کو پسند نہیں کرتا، وہ اس کے لیے دنیا کو سب سے مغضوب ترین شخص ہوتا ہے۔ یہ سطحی معلومات کا شاخسانہ ہوتا ہے۔ اور سطحی معلومات کی ایک وجہ کتابوں سے دوری بھی ہے۔

کتابوں کے رجحان میں کمی کی بہت سی وجوہات ہیں۔ موبائل، انٹرنیٹ اور جدید ٹیکنالوجی بھی اس کی ایک وجہ ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے فائدے تو بہت ہوئے، مگر اس کے نقصانات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہی کتابیں پڑھنے کے رجحان میں کمی آئی ہے۔ پہلے جن کے ہاتھوں میں کتابیں نظر آتی تھیں، اب ان کے ہاتھوں میں موبائل، آئی پیڈ اور لیپ ٹاپ وغیرہ نظر آتا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ انٹرنیٹ کتابوں کا نعم البدل ہے۔ اس لیے اب کتابوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ میں اس نظریے کی نفی کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں، کتابیں اس وقت بھی انٹرنیٹ سے زیادہ "مستند" ہیں۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ترقی یافتہ قومیں ٹیکنالوجی میں اگرچہ ہم سے

بہت آگے ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے کتابوں سے دامن نہیں چھڑایا۔ وہاں ہر سال کئی کتابیں چھپتی ہیں، جنھیں وسیع پیمانے پر پڑھا جاتا ہے۔

کتابوں سے دوری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اب وہ مصنفین نہیں رہے، جن کا اسلوب قارئین کو گرما دیتا تھا، یہ سچ ہے کہ لوگ دن بہ دن کتابوں سے دور ہوتے جارہے ہیں، لیکن احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، واصف علی واصف، مولانا مودودی، خواجہ حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزاد، چراغ حسن حسرت وغیرہ جیسے نثر نگار اور مرزا غالب، میر تقی میر، علامہ اقبال، فیض احمد فیض، ن۔م۔ راشد، ناصر کاظمی، قتیل شفائی وغیرہ جیسے شاعر بھی تو نہیں رہے، جن کی نثر اور شاعری پر سکون لہروں کو متلاطم کردیا کرتی تھی۔

آخر میں فقط اتنی گذارش ہے کہ کتابوں سے دوری کی اس عادت سے چھٹکارا پانا ہمارے لیے از حد ضروری ہے، کیوں کہ زندہ قوموں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ہر حال میں اپنا رشتہ کتابوں سے قائم رکھتی ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتیں کہ " کتابوں کا دور اب نہیں رہا۔"

# عراق۔۔۔ عرب و عجم کے نرغے میں

عراق، شام بنتا جا رہا ہے۔ شام کی طرح یہاں بھی فرقہ وارانہ جنگ چھڑ چکی ہے۔ یوں مسلم امہ مزید منقسم ہو گئی ہے۔ شام کی طرح عراق کی حالیہ صورت حال پر بھی مسلم دنیا میں بہت زیادہ تشویش پائی جاتی ہے۔ مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ تشویش فقط مسلم امہ کے عام لوگوں میں پائی جاتی ہے، کیوں کہ عراق کے حالیہ بحران کو ٹالنے کے لیے مسلم دنیا کا کوئی بھی ملک آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔

عراق میں ایک تنظیم "دولتِ اسلامیہ فی العراق والشام" (داعش)حکومت سے نبرد آزما ہے۔ اس تنظیم کی طاقت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ عراق کی امریکی تربیت یافتہ فوج بھی اس کے سامنے بے بس ہو گئی ہے۔ یہ تنظیم عراق کے ایک اہم شہر موصل پر بھی قبضہ کر چکی ہے۔ موصل، نینوا کا دارالحکومت ہے اور اس کی آبادی 18 لاکھ ہے۔ داعش کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس نے شمالی عراق میں بیجی کی آئل ریفائنری اور تل عفر کے ہوائی اڈے پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ تاہم عراقی حکومت اس بات کی تردید کرتی ہے۔ داعش نے موصل کے علاوہ عراق کے اور بھی کئی شہروں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ رواں سال جنوری سے داعش بغداد 30 کلومیٹر دور فلوجہ پر قابض ہے۔ حالیہ پیش رفت میں اس

تنظیم نے عراق اور شام کی اہم سرحدی کراسنگ کے ساتھ ساتھ دو قصبوں پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ عراقی حکام نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ شام کے سرحد کے قریب قائم قصبے کے ایک گاؤں پر داعش کا قبضہ ہو گیا ہے۔حکام کا کہنا ہے کہ داعش نے اس گاؤں پر عراقی فوج کے ساتھ ساتھ دن بھر لڑائی کے بعد کنٹرول حاصل کر لیا ہے، جس میں 30 عراقی فوجی ہلاک ہوئے۔

دولتِ اسلامیہ فی العراق والشام (داعش) ، جسے انگریزی میں اسلامک اسٹیٹ آف عراق اینڈ سیریا (آئی ایس آئی ایس) کہا جاتا ہے، 2013 ء میں وجود میں آئی۔ یہ تنظیم پہلے القاعدہ کے ساتھ تھی، مگر بعد میں القاعدہ نے اس تنظیم کے ساتھ اپنے تعلقات منقطع کر لیے۔ القاعدہ سے الگ ہونے کے بعد یہ تنظیم القاعدہ سے بھی زیادہ خطرناک ہو گئی ہے۔ اس تنظیم کے سربراہ ابوبکر بغدادی ہیں۔ یہ گوشہ نشین شخص ہیں۔ ان کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ابوبکر 1971 ء میں پیدا ہوئے اور 2003 ء میں امریکی حملے کے خلاف شروع ہونے والی مزاحمت میں شامل ہوئے۔ لندن کے ایک پروفیسر کے مطابق مغربی ملکوں سے شام کی جنگ میں شریک ہونے والے 80 فی صد جنگ جو اس گروپ میں شامل ہیں۔ شام میں دیگر باغی گروپوں کے برعکس آئی ایس آئی ایس عراق اور شام کے حصوں پر مشتمل ایک علیحدہ آزاد ریاست قائم کرنا چاہتی ہے۔اس تنظیم نے مارچ 2013ء شام کے شہر رقہ پر قبضہ کیا۔ جنوری 2014 ء میں اس نے عراق کے صوبے

انبار میں واقع فلوجہ شہر کا کنٹرول حاصل کر لیا۔
عراق اس وقت در حقیقت عرب و عجم کے نرغے میں ہے۔ گذشتہ دنوں عراق کے وزیرِ اعظم نوری المالکی نے ایک فرانسیسی ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ سعودی عرب اور قطر عراق میں باغی گروپوں کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مالی امداد بھی کرتے ہیں۔ حقیقت میں دونوں ممالک نے عراق کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہے۔ عرب اور افریقی معاملات کے ایرانی وزیر کہتے ہیں کہ عراق میں دہشت گردوں کے خلاف جنگ میں امریکا سنجیدہ دکھائی نہیں دیتا۔ انھوں نے اس عزم کا اظہار بھی کیا ہے کہ ایران، عراق کو دہشت گردی کے حلاف جنگ میں مضبوط مدد فراہم کرے گا۔ اس کے علاوہ ایران کے صدر حسن روحانی کا یہ بیان بھی میڈیا کی زینت بن چکا ہے کہ "اگر امریکا عراق میں کوئی کارروائی کرتا ہے تو ایران اس میں تعاون کے بارے میں غور کرے گا۔" نوری المالکی، ایرانی وزیر اور ایرانی صدر کے ان بیانات سے ہم یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کر سکتے ہیں کہ اس وقت عراق کی داعش کو "عرب" سپورٹ کر رہا ہے، اور خود عراق کو "عجم" سپورٹ کر رہا ہے۔
عراق میں داعش کے مقابلے میں جس طرح عراقی فوج ناکام ہوئی ہے، وہ باعث حیرت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکا کی تربیت یافتہ فوج، داعش کے

مقابلے میں کیوں کر ناکام ہو گئی۔ عراقی فوج کی ناکامی بتاتی ہے کہ 2014ء میں جب امریکا افغانستان سے رخصت ہوگا تو وہاں کے حالات بھی عراق جیسے ہو جائیں گے۔ پھر یہ بات بھی عجیب محسوس ہوتی ہے کہ عراق کی طرف سے مدد کی اپیل کے باوجود امریکا عراق میں کارروائی کرنے سے گریز برت رہا ہے۔ کیوں کہ امریکا اب بہ خوبی سمجھتا ہے کہ اس میں اب وہ کس بل اور جوش نہیں رہا، جو 2001ء اور 2003ء میں تھا۔ اس لیے دامن چھڑانے میں ہی عافیت ہے۔ وائے ناکامی !!!!

مسلم دنیا کے حکمرانوں، بالخصوص سعودی عرب کی خاموشی شکوک و شبہات جنم دے رہی ہے۔ ایران کو بھی جوش سے نہیں، ہوش سے کام لینا چاہیے۔ میرے مطابق عراق میں لگی آگ کو بجھانے میں سعودی عرب اور ایران اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک ایران کا رویہ بہت زیادہ جارحانہ ہے تو دوسری طرف سعودی عرب کی پراسرا خاموشی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ سعودی عرب، بہ شمول دیگر عرب ممالک اس بات کا خواہاں ہے کہ عراق یوں ہی عرب و عجم کی چکی میں پستا رہے۔ یہ صورت حال کسی صورت اسلامی دنیا کے لیے موزوں نہیں ہے۔

## بہارِ عرب کے بعد

"انقلاب" کا لفظ سنتے ہی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ رستے زخموں کی مسیحائی کی آس بندھ جاتی ہے۔ شبِ ظلمت کے سائے چھٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ پھر لگتا ہے، انقلاب کے خوف سے ہر سماجی برائی اپنی موت آپ مر جائے گی۔ نفرت کی بہ جائے محبت ہوگی۔ ظلم و بربریت کی بہ جائے امن و سکون ہوگا۔ قتل و غارت گری کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ یک بہ یک تھم جائے گا۔ وہ رسوم، جو انسان دشمن ہیں، اتنی انسان دشمن کہ محض پسند کی شادی پر دولھا اور دلھن کے سر کاٹ کر ان سے فٹ بال کھیلنے پر مجبور کرتی ہیں، "انقلاب" کی آگ میں جل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جائیں گی۔ "انقلاب" ظالموں کو ان کے کیے کی سخت سزا دے گا، یوں ظلم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسخر ہو جائے گا۔ مہنگائی نہیں ہوگی، غریب کا چولھا روزانہ تین بار روشن ہوگا۔

لیکن یاد رکھیے، انقلاب بپا کرنے سے زیادہ، انقلاب کے بعد کی صورت حال پر نظر رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ جوش میں آ کر انقلاب کے وہ نتائج اخذ نہ کیے جائیں، جو ہم نے درج بالا اقتباس میں تحریر کیے ہیں، بلکہ انقلاب کے بعد کی صورت حال کا مکمل ادراک دانش وری کی دلیل

ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اپنے ارد گرد روزانہ کئی ایسی سماجی برائیاں دیکھتے ہیں، جس سے بے چارے دل میں انقلاب کے جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔ دل چاہتا ہے، تخت اچھال دیے جائیں اور تاج گرا دیے جائیں۔ تاکہ خلقتِ خدا راج کرے۔۔۔۔ لیکن کون سا مسیحا اس بات کو سو فی صد یقین سے کہہ سکتا ہے کہ تخت اچھالنے اور تاج گرانے کے بعد واقعی دودھ کی نہریں بہنے لگیں گی۔ واقعی امن وسکون کے گیت گائے جائیں گے۔ واقعی عورتوں اور بچوں کے حقوق پامال نہیں ہوں گے۔ واقعی کرپشن ختم ہو جائے گی۔ واقعی دہشت گردی کی ظلمت چھٹ جائے گی۔ واقعی مہنگائی کا عفریت قابو میں آ جائے گا۔ حالات کی درستی کی پیشین گوئی تو بڑی بات ہے، کوئی اس بات کو ہی یقین کے ساتھ کہہ دے کہ حالات یوں ہی رہیں گے، یعنی مزید خراب نہیں ہوں گے، تو بڑی بات ہے۔

ہمارے سامنے اس وقت "بہارِ عرب" یا "عرب بہار" کی مثال ہے۔ جسے انگریزی میں "عرب اسپرنگ" کہا جاتا ہے۔ پاکستان کی اصطلاح میں اسے "عرب انقلاب" کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ پاکستان میں "بہار" سے زیادہ "انقلاب" کی مانگ ہے۔

بہارِ عرب کے بعد ہم نے دیکھا کہ عرب دنیا کے حالات مزید خراب ہو گئے۔ بہارِ عرب کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ عرب ممالک میں بہت زیادہ بعد آ گیا۔ آپس کی محبتیں اولاً رنجشوں، بعد ازاں نفرتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ بی بی سی کے ایک صحافی بہارِ عرب کے بعد عرب دنیا کی سچی منظر کشی کرتے ہوئے

کہتے ہیں : " میں گذشتہ چالیس برس سے مشرق وسطیٰ سے خبریں بھیج رہا ہوں، لیکن میں نے اس سے پہلے عرب دنیا کو اتنا منقسم اور ٹوٹا پھوٹا کبھی نہیں پایا جتنی یہ مجھے آج نظر آ رہی ہے۔ "

بہارِ عرب کا آغاز 2010 ء کے آخر میں ہوا۔ یہ ایک نوجوان کی خود سوزی سے پھوٹی ۔اس نوجوان کا نام محمد بو عزیزی تھا۔ محمد بو عزیزی 1984 ء میں تیونس کے ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ یہ نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس نوجوان نے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کیا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بے روزگار تھا۔ بے روزگاری سے تنگ آ کر اس اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان نے بازار میں سبزی کی ریڑھی لگا لی ۔ ایک دن پولیس والا پہنچ گیا اور اس سے ٹھیلے کا بلدیاتی اجازت نامہ طلب کیا۔ بو عزیزی کے پاس اجازت نامہ نہیں تھا۔ دونوں طرف سے سخت جملوں کا تبادلہ ہوا تو پولیس والا بو عزیزی پر غالب آ گیا۔ اس نے آؤ دیکھ نہ تاؤ۔پہلے نوجوان کو تھپڑ رسید کیا۔ پھر اس کا ٹھیلا ضبط کر لیا۔ نوجوان اعلیٰ حکام کے پاس جا کر گڑگڑایا، مگر کسی نے اس کی نہیں سنی ۔ سخت مایوسی کے شکار اس نوجوان نے فیس بک پر اپنی ماں کے لیے الوداعی پیغام چھوڑا اور خود کو بلدیاتی دفتر کے باہر آگ لگا دی ۔ یوں اس اندوہ ناک واقعے سے بہارِ عرب پھوٹی ۔ بہارِ عرب نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے مشرق وسطیٰ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بہارِ عرب سے کئی ممالک

متاثر ہوئے۔ جن میں تیونس، مصر، یمن، بحرین، لیبیا، کویت، شام وغیرہ سر فہرست ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بہارِ عرب سے عرب دنیا کو کوئی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ اس سے حالات مزید بگڑ گئے۔ تیونس، جہاں سے بہارِ عرب کا آغاز ہوا تھا،کے متعلق العربیہ کا یہ تبصرہ پوری پوری منظر کشی کرتا ہے: " سیدی بوزید میں 26 سالہ محمد بوعزیزی کی پولیس تشدد کے خلاف احتجاج کے طور پر خودسوزی کے بعد سے متعدد بے روزگار نوجوان خودکشی کر چکے ہیں حالانکہ انھی نوجوانوں نے عرب بہار کی بنیاد رکھی تھی اور تیونس کے بعد مصر، لیبیا، یمن اور شام میں بھی مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف عوامی احتجاجی تحریکیں شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن ان عرب بہاریہ انقلابات کے نتیجے میں تیونس اور دوسرے عرب ممالک کے عوام کی زندگیوں میں کوئی جوہری تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ وہ ماضی کی طرح گوناگوں مسائل سے دوچار ہیں اور غربت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ تیونس میں برپا شدہ انقلاب کے تین سال کے بعد بھی کل ایک کروڑ آبادی میں سے قریباً بیس لاکھ انتہائی غربت کا شکار ہیں جبکہ بے روزگاری کی شرح پندرہ فی صد ہے اور بے روزگار نوجوانوں کی تعداد سات لاکھ سے متجاوز ہے۔"

مصر کے حالات بھی ہم سب کے سامنے ہیں۔ ایک ہی سال میں وہاں کی منتخب

جمہوری حکومت کو ختم کر دیا گیا۔ ایک بار پھر وہاں آمرانہ حکومت قائم ہو گئی ہے۔
شام کی حالت تو سب کے سامنے ہے۔ جہاں گذشتہ تین سالوں سے مسلم امہ کا خون بہہ رہا ہے۔ جہاں اب تک ڈیڑھ لاکھ سے زائد لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔

بہارِ عرب سے متاثر ممالک کی موجودہ حالتِ زار دیکھ کر بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انقلاب کے بعد ضروری نہیں کہ حالات مکمل طور درست ہو جائیں۔ حالات مزید خراب بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے انقلاب کی جانب پھونک پھونک کر قدم اٹھانے چاہئیں۔

# رمضان المبارک اور مسلمان

رمضان المبارک کا مقدس مہینا شروع ہو چکا ہے۔ رب تعالیٰ کی رحمتوں کے نزول کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ مساجد، جہاں پہلے دو سے تین صفیں نمازیوں کی ہوتی تھیں، اب بھری بھری نظر آتی ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو وغیرہ کے چینلز پر مذہبی پروگراموں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ نعت خواں نعتیں پڑھ رہے ہیں۔ واعظ وعظ کر رہے ہیں۔ تراویح میں قرآن مجید پڑھا جا رہا ہے۔

لیکن پچھلے ہفتے کچھ ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں، جو نہیں ہونے چاہیے تھے۔ رمضان المبارک کا آغاز ہوتے ہی مسلمانوں کا برا چاہنے والوں نے ان پر سختیوں کا آغاز کر دیا ہے۔

ذکر کرتے ہیں فلسطین کا، جہاں اسرائیل نے ایک بار پھر جارحانہ رویے کا آغاز کر دیا ہے۔ ان دنوں فلسطین کی حریت پسند تنظیم حماس اور اسرائیل کے مابین حالات بہت کشیدہ ہیں۔ حالات کی کشیدگی کا سبب وہ تین اسرائیلی نوجوان ہیں، جنھیں قتل کر دیا گیا۔ اگرچہ مصدقہ ذرائع سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوئی کہ ان نوجوانوں کی ہلاکت کی ذمہ دار حماس ہے، لیکن اس کے باوجود

اسرائیل نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان نوجوانوں کو حماس نے قتل کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اسرائیلی وزیرِ اعظم نے حماس کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ حماس کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔ اسرائیلی وزیرِ اعظم نے گویا اس امر کے سگنلز دے دیے کہ آنے والا وقت حماس کے لیے برا ہوگا۔ اسرائیل نے اپنی جارحیت کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہوئے غزہ کی پٹی کے ساتھ اپنی سرحد پر اضافی فوج تعینات کر دی ہے، یہ امر اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ عن قریب اسرائیلی فوج اور حماس کے درمیان ایک خونیں جنگ کا آغاز ہونے والا ہے۔ اسرائیل نے اپنے تین نوجوانوں کی ہلاکت کے انتقام کا اغاز کرتے ہوئے یروشلم میں ایک 16 سالہ نوجوان ابو حضیر کو بھی زندہ جلا دیا۔

فرانس نے 2010 ء میں ایک قانون پاس کیا تھا۔ جس کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ عوامی مقامات پر پورے چہرے کا پردہ کرنے والی 150 یورو تک جرمانے کیا جا سکتا ہے ۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اس قانون کی انسانی حقوق کی یورپی عدالت نے توثیق بھی رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں کی۔ العربیہ کے مطابق:

"عدالت نے یہ فیصلہ ایک چوبیس سالہ دوشیزہ کی اس درخواست کو نمٹاتے ہوئے صادر کیا جس میں عوامی مقامات پر چہرہ ڈھانپنے پر پابندی کو 'مذہبی آزادی' کے خلاف قرار دیتے ہوئے چیلنج کیا گیا تھا۔ عدالت نے خاتون کی درخواست مسترد کرتے ہوئے نقاب پر پابندی کو برقرار رکھا ہے۔"

: ذکر کرتے ہیں چین کا، جو کہ پاکستان کا بہترین دوست بھی ہے۔ بی بی سی کے مطابق چین کے مغربی صوبے سنکیانگ میں کئی سرکاری دفاتر نے رمضان کے دوران مسلمان" عملے کے روزہ رکھنے پر پابندی عائد کر دی ہے۔
ایک سرکاری ہسپتال نے مسلمان ملازمین سے تحریری طور پر روزہ نہ رکھنے کا حلف نامہ لیا ہے۔ سرکاری اخبارات میں بھی روزے سے جسمانی خطرے کے بارے میں اداریے "بھی شائع کیے جا رہے ہیں۔
چین کا ایسا رویہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں تھا۔ چین میں ایسا پہلی بار ہوا ہے۔ کسی کے مذہبی فریضے پر قدغن لگانا کسی طور پر مناسب نہیں ہے۔ یہ بھی شدت پسندی کے زمرے میں آتا ہے۔ رمضان المبارک کے روزے اسلام میں فرض ہیں، جو کسی طرح معاف نہیں ہوتے۔ چینی حکام کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ وہ اپنے ملک کے مسلمانوں کو ان کے ایک اہم مذہبی فریضے سے محروم کرکے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ان کے دل میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔
آخر میں رب تعالٰی سے دعا ہے کہ وہ اس رمضان المبارک کی برکت سے مسلم امہ کے

سارے مسائل حل کر دے۔

# غزہ کا لہو

رمضان المبارک کا مقدس مہینا پوری آن ، بان ، شان سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ارادہ تھا، کسی اصلاحی موضوع پر لکھوں ۔ اس مہینے کے شب و روز اصلاحی تحریر کا ہی تقاضا کرتے ہیں ۔ پھر یک سر ارادہ ملتوی ہو گیا۔ وجہ غزہ کی حالیہ مخدوش حالت ہے۔ کوئی طاقت اس شہر بے اماں اور اس کے حرماں نصیب باسیوں کا حقیقی سہارا نہیں بن رہی ۔ غزہ کی کشیدہ صورت حال نے خصوصا مسلم دنیا اور عموما پوری دنیا کو پریشان اور مبہوت کر دیا ہے۔ اتنا مبہوت کہ اقوامِ متحدہ کے جنرل سکریٹری کو کہنا پڑا کہ غزہ میں صورت حال تباہی کے دہانے پر ہے۔ یہ خطہ ایک اور جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بگڑتی ہوئی صورت حال تیزی سے قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے اور تشدد پھیلنے کا خطرہ اب بھی حقیقی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے جنرل سیکریٹری کے یہ الفاظ غزہ کی حقیقی صورت حال کی صحیح نشان دہی کرتے ہیں ۔

میں اپنے پچھلے کالم میں اس امر کی نشاندہی کر چکا ہوں کہ عن قریب اسرائیل اور حماس کے درمیان ایک خونی جنگ ہونے والی ہے، جس کا آغاز منگل سے ہوا۔ اگرچہ اس سے پہلے اسرائیل کی طرف سے دو ایسی خوش گوار خبریں سننے کو ملیں

جس سے بہ ظاہر لگتا تھا کہ یہ خونی جنگ ٹل جائے گی ، مگر پھر حالات اچانک تبدیل ہو ، گئے اور غزہ کو انسانیت کے خون سے نہلا دیا گیا۔ دو خوش گوار خبریں یہ ہیں :

۔ اسرائیل کے وزیرِ اعظم بنجمن نیتن یاہو نے پیر کے روز شہید کیے جانے والے 116 سالہ ابو خضیر کے والد کو فون کیا اور اس بات کا وعدہ کیا کہ فلسطین کے اس نوجوان کے قاتلوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی ۔ واضح رہے کہ 16 سالہ ابو خضیر کو ان تین نوجوانوں کے قتل کے بدلے میں شہید کیا گیا ، جن کا تعلق اسرائیل سے تھا اور ان نوجوانوں کے قتل کے بعد اسرائیل نے ان کے قتل کا ذمہ دار حماس کو ٹھہراتے ہوئے بہ بانگِ دہل کہا تھا کہ ان نوجوانوں کا بدلہ لیا جائے گا اور حماس کو اس کی قیمت چکانی پڑے گی ۔

۔ ابو خضیر کے قتل کی پاداش میں اسرائیلی حکام نے کئی یہودیوں کو گرفتار کر لیا۔ 2 اسرائیل کا یہ اقدام بھی قابلِ تعریف ہے ۔

پھر یکایک 8 جولائی بروز منگل سے اسرائیل کی جانب سے بمباری شروع کر دی گئی ۔ وائس آف امریکا کے مطابق اب تک کی کارروائیوں میں 160 سے زائد افراد شہید ہو چکے ہیں ۔ تازہ کارروائیوں میں پولیس سربراہ کے گھر کو نشانہ بنا کر مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ جس میں کم از کم 18 افراد شہید ہوئے ۔ تازہ اطلاعات یہ بھی ہیں کہ اسرائیل جو پہلے فضائی کارروائیوں تک محدود ،

تھا، اب زمینی کارروائیاں بھی شروع کر چکا ہے۔ (وائس آف امریکا نے "شہید" کی جگہ "ہلاک" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ )اب ذرا اسرائیلی جارحیت کے متعلق العربیہ کی یہ رپورٹ پڑھیے:

"اتوار کے روز اسرائیلی فوج کے ایک ترجمان نے بتایا کہ ان کے لڑاکا طیاروں نے ہفتہ اور اتوار کی شب غزہ کی پٹی پر تقریبا 20 فضائی حملے کئے جس کے بعد گذشتہ منگل سے جاری اسرائیلی حملوں میں شہید ہونے والوں کی تعداد 200 ہو گئی جبکہ 1329 افراد زخمی ہیں۔"

(ترجمان نے فلسطینی مزاحمت کے بارے میں کچھ یوں بتایا:)

"ترجمان کے مطابق گذشتہ 24 گھنٹوں کے دوران 53 میزائل اسرائیلی علاقے پر داغے جا چکے ہیں، اس طرح ابتک فلسطینی مزاحمتی تنظیمیں اسرائیل پر 800 راکٹ داغ چکی ہیں، جن میں 127 کو امریکی میزائل شکن دفاعی سسٹم 'آئرن ڈوم' نے فضا ہی میں تباہ کر دیا۔"

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ غزہ کی صورت حال پر مسلم دنیا کے جس ردِ عمل کی توقع تھی ، وہ نظر نہیں آیا۔ پاکستان سمیت کئی ملکوں نے غزہ میں اسرائیلی جارحیت کی مذمت کی۔ لیکن ۔۔۔۔ مذمت سے کیا ہوتا ہے۔ مذمت تو اقوامِ متحدہ نے بھی کی ہے۔ باراک اوباما نے بھی کی ہے۔ ہاں۔۔۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم مذمت کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ہم اگرچہ 1 ارب

کروڑ ہیں ، دنیا کی دوسری بڑی قوم ہیں ، اور ہمارے کئی ملک تیل کے ذخائر سے 60 مالامال ہیں۔ یعنی ہم معاشی لحاظ سے بھی پسماندہ نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہم بہت کم زور ہیں۔ بہت زیادہ کم زور۔۔۔۔ اتنے کم زور کہ ایک چھوٹے سے ملک اسرائیل کو ترکی بہ ترکی جواب دینے ، اور اپنے بھائیوں کے لیے کوئی چھوٹا سا عملی کام کرنے سے بھی مکمل طور پر قاصر ہیں۔ سوچتا ہوں اسرائیل کو اپنے شہریوں سے کتنی محبت ہے کہ تین شہریوں کے بدلے میں اس نے پورے فلسطین کا نظام تہس نہس کر دیاہے۔ اور ہمیں اسرائیل کے مقابلے میں اپنے بھائیوں سے کتنی محبت ہے ، اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے 50 سے زائد ملکوں پر نظر دوڑاتا ہوں۔ او آئی سی کو دیکھتا ہوں ، عرب لیگ کا مشاہدہ کرتا ہوں۔ ملکوں ملکوں شریعت اور خلافت کی علم بردار تنظیموں کا معائنہ کرتا ہوں۔۔۔۔ تو سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ کاش !!! ہم بھی اسرائیل کی طرح اپنے بھائیوں سے محبت کرتے۔ غزہ کے سلسلے میں مسلمانوں کا کردار دیکھ کر پہلے بار مسلمانوں کی "طاقت" کا حقیقی ادراک ہوا ہے۔

میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں غزہ کے سلسلے میں کسی بھی قسم کا عملی کام کرنے سے قاصر ہوں۔ ہاں ۔۔۔ فیس بک پر غزہ کے معصوم بچوں ، لہولہان نوجوانوں ، سسکتی بلکتی عورتوں کی چند تصویریں رکھ سکتا ہوں۔ ٹویٹر پر چند سخت جملوں سے مسلم حکمرانوں کو کوس سکتا ہوں۔ ہماری ویب پر غزہ کے

بہتے لہو کا نوحہ لکھ سکتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ غزہ کے مسلمانوں کے بارے میں دعا بھی کر سکتا ہوں۔ آیئے دعا کرتے ہیں :

یارب ! ! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس امتِ مرحومہ کے ہر زخم کی چارہ جوئی فرما کہ یہ امت مزید زخم سہنے کی سکت نہیں رکھتی۔

یارب ! ! ! میرے غزہ کے دامن پر لگے انسانیت کے لہو کے چھینٹے جلد از جلد سکھا دے (اور اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا دے۔ (آمین

## !! نہ جانے مسلمان کب متحد ہوں گے

لہو زدہ غزہ کے حوالے سے تازہ ترین خبر یہ ہے کہ فلسطینی مندوب اقوامِ متحدہ کے سکیورٹی کونسل کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے رو پڑے۔ العربیہ نیوز کی رپورٹ کے مطابق فلسطین کے مندوب ریاض منصور نے غزہ پر اسرائیلی حملے کو بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی قرار دیا۔ انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے استفسار کیا : "اپنے دفاع کا یہ کیسا حق ہے کہ جو اہالیانِ غزہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر پورا کیا جا رہا ہے ؟"

جولائی.بروزِ منگل 2014ء سے شروع ہونے والے اس خوں ریز معرکے میں 8 فلسطینی شہید ہو چکے ہیں۔جب کہ اسرائیل کے صرف دو شخص ہلاک ہوئے ہیں 300 ۔اسرائیل اب فضائی حملوں کے ساتھ ساتھ غزہ پر زمینی حملے بھی کر رہا ہے۔ اسرائیل کی اب تک کی زمینی کارروائیوں میں 60 فلسطینی شہید ہو چکے ہیں۔ اسرائیل کا موقف یہ ہے کہ اس کی کارروائیوں میں حماس کے لوگ ہلاک ہو رہے ہیں۔ لیکن اقوامِ متحدہ کا موقف اس کے.برعکس ہے۔ اقوامِ متحدہ کے مطابق ہلاک ہونے والوں میں 77 فی صد عام شہری ہیں۔

قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ غزہ میں جاری کشیدگی پر مسلم دنیا کا ردِ عمل کچھ زیادہ قابلِ ستائش نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مصر باقی مسلم ممالک سے کچھ بہتر رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصر نے کچھ عملی کام کیا۔ باقی مسلم ممالک صرف مذمت کرتے رہے۔ ترکی نے اسرائیل کی موجودہ جارحیت کے ردِ عمل میں کچھ سخت بیانات ضرور جاری کیے۔

لیکن اس کی عملی کارکردگی صفر رہی۔ اسی طرح پاکستان کے دفتر خارجہ سے بھی اسرائیلی جارحیت کی مذمت کا بیان نظر سے گزرا ہے۔ کچھ دنوں قبل مصر کی وجہ سے، یوں لگتا تھا جیسے یہ جنگ ٹل جائے گی۔ کیوں کہ غزہ میں جاری کشیدگی کے خاتمے کے لیے مصری، تجویز کو اسرائیل نے تسلیم کر لیا تھا۔ تاہم حماس نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ تجویز اس وقت قابلِ عمل ہوگی، جب تک کوئی سیاسی معاعدہ نہ کیا جائے۔ جس کی وجہ سے ایک بار پھر کشیدگی شروع ہو گئی۔

حماس بھی اس وقت سخت جارحانہ موڈ میں ہے۔ حالاں کہ اس وقت حماس کو جذبات سے نہیں، عقل و حواس سے کام لینا چاہیے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ او۔ آئی۔ سی اسرائیل کی سخت مذمت کرتی اور فی الفور تمام مسلم ممالک کے سربراہان کا اجلاس بلاتی۔ تاکہ اسرائیلی جارحیت کا منہ توڑ جواب دیا جا سکتا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سب مذمتی بیان دے

کرچپ سادھے اپنے ہی ملکوں میں بیٹھے رہے۔ او آئی سی کی طرف سے ایک آدھ قرارداد اقوامِ متحدہ میں ضرور پیش کی گئی۔ لیکن مجموعی طور پر دنیا کی دوسری بڑی تنظیم کی کارکردگی سخت مایوس کن رہی۔ ضروری نہیں کہ اسرائیلی جارحیت کے خاتمے کے لیے لڑائی شروع کردی جاتی۔ 50 سے زائد اسلامی ممالک کے سربراہ مل بیٹھ کر سوچ و بچار کرتے تو کوئی نہ کوئی طریقہ نکل ہی آتا۔ لیکن اس درد کی کیا دوا کی جائے کہ مسلم ممالک متحد ہوتے ہی نہیں ہوتے۔ فرقہ واریت نے اس امتِ مرحومہ کو اتنا منتشر کر دیا ہے کہ یہ اپنے بڑے بڑے مسائل حل کرنے سے مکمل طور پر قاصر ہے۔

غزہ کی موجودہ حالتِ زار اس بات کی شدید متقاضی ہے کہ پوری مسلم دنیا متحد ہو جائے۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ مسئلہ فلسطین کا تعلق مسلم دنیا سے ہے اور وہی اس مسئلے کو حل کر سکتی ہے۔ اقوامِ متحدہ سے آس لگائے بیٹھے رہنا بے کار ہے۔ اگر اقوامِ متحدہ مخلص ہوتی تو آج غزہ میں اتنی شہادتیں نہ ہوتیں !! نہ جانے مسلم دنیا کے حکمران کب غفلت کی نیند سے بیدار ہوں گے !!! نہ جانے مسلمان کب متحد ہوں گے !!

# عورتوں کی حالتِ زار اور جاگیردارانہ نظام

اس وقت میرے سامنے بہت سی ایسی خبریں ہیں ، جن سے عورت کی بے بسی اور مرد کی بے حسی ٹپکتی ہے۔ اگر ان خبروں کا تعلق دنیا کے کسی اور ملک سے ہوتا تو شاید مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی ، جتنی ابھی ہو رہی ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ ان سب خبروں کا تعلق وطنِ عزیز سے ہے۔ ہم پہلے صنفِ نازک کے معاملے میں پڑوسی ملک بھارت کو دوش دیتے تھے کہ وہ عورت کے معاملے مں بہت پسماندہ ہے۔ لیکن اب پاکستان بھی اس معاملے میں کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ عرصے سے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ غرملکی میڈیا پاکستان کے پیچھے یوں ہی لگا ہوا ہے۔اور پاکستان کو خواہ مخواہ عورت کے معاملے میں پسماندہ ترین ملک ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن پے درپے پیش آنے والے واقعات ، جن سے عورت کی بے بسی اور مرد کی بے حسی جھلکتی ہے، نے مری سوچ کو بھی بدل دیا ہے اور میں اس بات اور سوچ کا قائل ہو گیا ہوں کہ وطنِ عزیز مں واقعی عورت کی حالتِ زار پر قابو پانے کے لے چند سخت اصلاحات کی ضرورت ہے۔نوٹن نے کہا تھا: ہر عمل کا برابر اور مخالف ردِ عمل ہوتا ہے۔
انھوں نے تو یہ اصول صرف سائنسی نقطۂ نظر کے لحاظ سے وضع کیا تھا، لیکن میں اس اصول کو ہر جگہ پاتا ہوں۔ یہ جو خواتین کے حقوق کے لیے سرگرم بہت سی تنظیمیں ہیں ، یہ دراصل ردِ

عمل ہی ہیں۔ اس ظلم کا جو پاکستان میں عورت پر روا رکھا جاتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے وطنِ عزیز پوری دنیا ہیں س عورت کے معاملے میں پسماندہ ترین ملکوں میں سے شمار ہونے لگا ہے۔

پاکستان میں صنفِ نازک کئی مسائل کا شکار ہے۔ کبھی ونی کے نام پر اس پر ظلم کیا جاتا ہے۔ کبھی اس کے چہرے پر تیزاب پھینک کر مرد اپنے حسد کا کھلم کھلا اظہار کرتا ہے۔ کبھی اس پر جنسی تشدد کرکے مرد اپنی بے حسی کا اعلان کرتا ہے۔ کبھی اسے دفتروں میں ہراساں کیا جاتا ہے۔ کبھی اس گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کبھی پسند کی شادی پر اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ کبھی محض شک کی بنا پر اسے مار دیا جاتا ہے۔ کبھی اسے نام نہاد جرگے کے حکم پر بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کبھی عورت وڈیروں کا جیلوں سے ملتی ہے تو کبھی اس کی لاش درخت سے لٹکی ہوئی ملتی ہے۔
کبھی کبھی پیش آنے والے ظلم سے چور واقعات پڑھتا ہوں تو ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔
سوچتا ہوں، کیا ہم انھی روایات کے امین تھے۔ ارے ہم تو عورت کو دیکھ کر نظریں جھکا لیا کرتے تھے۔ دوکان دار عورت کو "ماں"، "بہن" اور "بیٹی" کہہ کر پکارتے تھے۔ ہم ہر جگہ، ہر گھڑی عورت کی عزت اور ناموس کی حفاظت کو

اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتے تھے۔ ہمیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ اگر ہم نے کسی عورت سے بد تمیزی کی یا کوئی دوسری اخلاق سے گری حرکت کی، تو ہماری ماں، بہن، بیٹی اور بیوی سے بھی کوئی ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ لیکن اب ۔۔۔ 3 سالہ معصوم سی بچی کو بھی نہیں چھوڑا جاتا۔ نام نہاد وڈیروں کے جرگوں نے الگ سے عذاب بپا کر رکھا ہے۔ مجھے وڈیروں کے جرگوں پر کوئی اعتراض نہیں اگر وہ غیر انسانی فیصلے نہ کریں۔ لیکن اگر وہ اپنے فیصلوں میں نا بالغ بچیوں کو ونی کے بھینٹ چڑھا دیں تو پھر میں ان کے وجود کو کبھی برداشت نہیں کروں گا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب وطنِ عزیز میں عدالتیں اور پولیس وغیرہ موجود ہے تو ان جرگوں سے کیوں فیصلہ کرایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اب بھی وڈیروں اور جاگیر داروں والا نظام موجود ہے۔اس نظام کو ہم اتنے سال گزرنے کے باوجود ختم نہیں کر سکے ہیں۔ ابھی دو دن پہلے ایک روح فرسا خبر نے پریشان کر دیا۔ خبر ملاحظہ ہو:

"تھانہ صدر گجرات کے نواحی گاؤں چک بھوالا کے محنت کش نصر اقبال کی گاؤں کے زمیندار غلام مصطفیٰ کے ساتھ بجلی کا میٹر ڈیرے پر لگوانے کے دوران 5 ہزار روپے کے تنازع پر تلخ کلامی ہوئی جس کی رنجش پر غلام مصطفیٰ نے ڈیرے پر نہانے آئے نصر اقبال کے 10 سالہ بیٹے تبسم کو بوتلوں کے ساتھ تشدد کا نشانہ بنایا اور اُس پر گرم پانی انڈیل دیا جس پر تبسم کھیتوں میں چھپ گیا، تاہم

سفاک درندے نے اُسے پکڑ کر رسیوں اور کپڑے سے اُس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے اور پیٹر انجن کی مدد سے اُس کے دونوں بازو تن سے جدا کر دیئے۔" (ایکسپریس ڈاٹ پی کے)

بعد میں بچے کے باپ نے اس سانحے کی ایف آئی آر درج کرانے کی کوشش کی تو ایس ایچ او تین روز تک معاملے کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ تو بھلا ہو وزیرِ اعلیٰ پنجاب کا۔ کہ انھوں نے فوری طور پر قانونی کارروائی کا پولیس کو حکم دیا۔ اب غریب کہاں جائے؟ وڈیرے ناانصافی پر مبنی فیصلے کرتے ہیں تو پولیس کارروائی ہی نہیں کرتی۔ اس طرح کے واقعات آئے روز پیش آتے رہتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں اب تک جاگیر دارانہ نظام جاری و ساری ہے۔ جاگیردار اور وڈیرے جو چاہیں، کرتے پھریں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔

بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ ایسا نہیں کہ ہم سب فرسودہ رسموں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ الحمد للہ! آج بھی ہمارے ہاں اکثریت اچھے لوگوں کی پائی جاتی ہے۔ ہم بہ حیثیتِ قوم اچھے لوگ ہی ہیں۔ لیکن یہ معاشرے میں کچھ کالی بھیڑیں ہیں، ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ جاگیرداروں کی نجی جیلیں، جن میں عورتوں پر ہی نہیں بلکہ بچوں پر بھی ظلم روا رکھا جاتا ہے، ان کا خاتمہ از حد ضروری ہے۔ جن کے خاتمے کے لیے سخت سے سخت کارروائی کرنی پڑے تو کی جائے

۔ پولیس کو بھی کسی کے زیرِ نگیں نہیں آنا چاہیے ۔ سرعام حق و انصاف کا بول بالا کرنا پولیس کا اولین فرض ہے ۔ انصاف کے معاملے میں کسی کو ترجیح دینا سب سے بڑا ظلم ہے ۔

ارادہ تھا کہ آج کا پورا کالم عورت کی حالتِ زار پر لکھوں ۔ درمیان میں تبسم کا واقعہ آگیا ۔ جس نے کالم کا تسلسل معطل کر دیا ۔ لیکن کیا کروں اس اندوہ ناک سانحے کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا ۔ اب کالم بھی طویل ہو گیا ہے ۔ قارئین کے وقت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے ۔ عورت کے معاملے میں ایک مکمل اور جامع کالم پھر کبھی ۔۔۔ ان شاء اللہ !!

## غزہ کے بچے

ایک مہینے سے دو دن اوپر ہوگئے، مگر ابھی تک اسرائیل کے انتقام کی آگ نہیں بجھی ۔ اسرائیل کے دوش پر 1960 فلسطینیوں کی شہادت کا بوجھ ہے۔ اسرائیل نے غزہ میں 9000 لوگوں کو زخمی بھی کردیا ہے۔ جن میں سے کتنے ایسے ہوں گے ، جو ہمیشہ کے لیے لاچار ہو جائیں گے ، معلوم نہیں۔ اسرائیل نے غزہ میں 142 اسکولوں کو بھی تباہ کردیا ہے، جن میں سے 89 اقوامِ متحدہ کے زیرِ تحت چل رہے تھے۔ اسرائیل کے اس خونیں کھیل نے 5 لاکھ لوگوں دربدر بھی کر دیا ہے۔ دوسری طرف اسرائیل کے صرف 67 لوگ ہلاک ہوئے ہیں، جن میں سے 3 عام شہری تھے۔ صدیوں بعد، جب ہم میں سے کوئی نہیں ہوگا، وقت کا مؤرخ اسرائیل کے اس "کارنامے" کو اتنی داد دے گا کہ اس کی پوری کتاب ایک نوحہ بن جائے گی۔ ہاں ! وقت کا مؤرخ یہ بھی ضرور زیرِ قلم لائے گا کہ اسرائیل کے مٹھی بھر لوگوں نے دنیا کی دوسری بڑی قوم کے باشندوں کو خون میں نہلایا تھا، مگر دنیا کی دوسری بڑی قوم کے حکمران اپنے لوگوں کو مرتا دیکھ کر بھی خاموش رہے۔ اب مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ مؤرخ کی کتاب کے قارئین اسرائیل کے "کارنامے" کی زیادہ "تعریف" کریں گے یا مسلم حکمرانوں کے "قابلِ ستائش" کردار کو سراہیں گے ۔

غزہ کی حالیہ جنگ کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ اس میں 415 بچے شہید اور 2700 زخمی ہوئے۔ بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ چاہے وہ پاکستان کے ہوں یا غزہ کے۔ کیا کوئی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بچہ حماس سے تعلق رکھتا تھا۔ نہیں ناں! تو پھر اسرائیل کی اس درندگی کو میں کیا نام دوں؟ کم از کم مسلم حکم ران تو غزہ کے ان معصوم بچوں کے لہو کی لاج رکھ لیتے۔ یہاں اسرائیل کی ایک سابقہ وزیرِ اعظم گولڈا میئر کے وہ الفاظ، جو انھوں نے 1968ء میں لندن کی ایک نیوز کانفرنس میں کہے تھے، لکھنا مناسب سمجھتا ہوں۔ انھوں نے کہا تھا:

"We can forgive the Arabs for killing our children. We cannot forgive them for forcing us to kill their children. We will have peace with the Arabs if they love their children more than they hate us."

یعنی ہم عربیوں کو اپنے بچوں کے قتل پر تو معاف کر سکتے ہیں، مگر ہم انھیں اس بات پر معاف نہیں کر سکتے کہ وہ ہمیں اپنے (عربیوں کے) بچوں کے قتل پر مجبور کریں۔ اس دن ہم میں امن قائم ہو جائے گا، جس دن ان کے دلوں میں اپنے بچوں کی محبت ہماری نفرت پر غالب آ جائے گی۔

غزہ کے معصوم بچوں کی شہادت نے فٹ بالر میسی کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ وہ بھی اپنے فیس بک پیج پر لکھ بیٹھے:

"ایک باپ اور یونی سیف کے سفیر ہونے کے ناطے میں غزہ پر اسرائیلی بم باری کے بعد سامنے آنی والی تصاویر دیکھ کر سخت خوف زدہ ہوں۔ اسرائیل اور حماس کا تنازعہ بچوں نے کھڑا نہیں کیا، لیکن اس کی سب سے بھاری قیمت بچوں کو ہی ادا کرنی پڑی۔ یہ احمقانہ تشدد ضرور رکنا چاہیے۔ ہمیں جنگی مضمرات کے حوالے سے بچوں کے تحفظ کے لیے ضرور اہتمام کرنا چاہیے۔"

غزہ کی خونیں جنگ نے وہاں کے بچوں کی نفسیات کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ یونی سیف کے مطابق ایک ماہ تک جاری رہنے والے فضائی حملوں اور بم باری کے باعث غزہ کے بچے شدید خوف اور ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ جس سے بچنے کے لیے لگ بھگ چار لاکھ بچوں کو فری کونسلنگ اور نفسیاتی مدد کی ضرورت ہے۔ غزہ میں یونیسیف کی فیلڈ آفس کی سربراہ کے مطابق اس شہر کی 18 لاکھ کی آبادی کا نصف بچوں پر مشتمل ہے۔ جن کی صحت اور نفسیات پر اسرائیلی حملوں نے انتہائی برے اثرات مرتب کیے ہیں۔ بی بی سی کے مطابق غزہ میں شہید ہونے والے سب سے کم عمر بچے کی عمر محض دس دن تھی۔ سوچتا ہوں کہ 18 ماہ کے محمد وجدان کا کیا ہوگا، جو اگرچہ معجزاتی طور پر بچ گیا، لیکن اس کی ماں کے ساتھ ساتھ اس کے خاندان کے 12 افراد اسرائیلی بربریت کا شکار ہوگئے۔ سوچتا ہوں کہ اس 11 سالہ یاسمین کا

کیا بنے گا، جو الشفا اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ جو اسرائیلی حملے کے وقت اپنی ماں کے ساتھ بریڈ پیک کر رہی تھی۔ اس ظالمانہ حملے میں اس کی ماں کے ساتھ ساتھ اس کی دو بہنیں بھی شہید ہو گئیں۔ جن میں سے ایک بہن کی عمر محض 3 ماہ تھی۔ اور وہ خود بری طرح زخمی ہے۔ یاسمین کہتی ہے کہ اس کی ماں اور بہنیں جنت میں چلی گئی ہیں۔ محمد وجدان اور یاسمین جیسے کئی بچے ہیں جن کے زخم اور جن کے جسم سے رستا ہوا لہو پکار پکار کر مسلم حکم رانوں سے۔۔۔ اسرائیل سے نہیں۔۔۔۔ رحم کی بھیک مانگ رہا ہے۔ اور مسلم حکم ران۔۔۔۔ نہ جانے کب ان معصوموں کے زخموں کا حساب لیں گے۔ اب تک مسلم حکمرانوں نے صرف تین کام کیے ہیں۔ وہ تین کام انھوں نے بھی کیے ہیں، جو مسلمان نہیں ہیں۔

۔ غزہ کے متاثرین کے لیے امداد1

۔ اسرائیل کے خلاف جارحانہ بیان بازی2

۔ اقوامِ متحدہ میں اسرائیل کے خلاف ایک آدھ قرار داد3

میسی کی غزہ کے لیے امداد اور غزہ کے سلسلے میں بان کی مون کی مختلف اجلاس میں شرکت۔۔۔ یہ دونوں امور ثابت کرتے ہیں کہ اس وقت غزہ کی حمایت میں مسلم اور غیر مسلم، دونوں کی خدمات برابر ہیں۔ بلکہ میڈیا کی رپورٹوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ غیر مسلم غزہ کے حق میں، مسلمانوں سے زیادہ سرگرمِ عمل

ہیں۔ جو کہ مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

غزہ کے معصوم بچوں کا لہو نہ جانے کب مسلم امہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرے گا؟

کاش کہ یہ معصوم اور بے گناہ لہو مسلم امہ کے اتحاد پر منتج ہو !!

# مسلم امہ۔۔۔ نااتفاقی کی زد میں

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ مسلم امہ کا سب سے بڑا مسئلہ نااتفاقی ہے۔ اگر ہم اس عفریت پر قابو پالیتے ہیں تو ہمارے سارے مسائل چٹکیوں میں حل ہو سکتے ہیں۔ ورنہ ہم جہاں ہیں، وہیں رہیں گے۔ اکیسویں صدی کے مسلمان کئی قسم کی نااتفاقیوں میں جی رہے ہیں۔ کہیں وطنیت اس امتِ مرحومہ کا شیرازہ بکھیر رہی ہے تو کہیں فرقہ واریت نے اس کا جینا عذاب کیا ہوا ہے۔ کہیں عدم برداشت ہے تو کہیں متشددانہ نظریاتی اختلاف۔ صورت حال گمبھیر سے گمبھیر ہوتی جارہی ہے، مگر کوئی بھی اس امتِ مرحومہ کی حالتِ زار پر رحم کھانے کو تیار نہیں۔ ہر ایک نااتفاقی کو بڑھاوا دینے کی ہمہ تن کوششوں میں مصروف ہے۔ کفر اور گمراہی کے فتوؤں نے الگ سے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ امت کے ہر ہر ٹولے کا الگ الگ "نظریاتی پیمانہ" ہے۔ جس کی مدد سے وہ دن رات ۔۔۔ دن رات کیا، ساری زندگی، مومن وکافر کا پتا لگانے میں لگا رہتا ہے۔ جو نظریاتی سوچ پر پورا اترا، وہ مومن۔ جو ذرا سا ادھر ادھر ہوا، وہ گمراہ اور کافر۔ حسد کی آگ نے پوری مسلم امہ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ تعصب ہے کہ تھمتا نہیں۔

عالمی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر ذرا سوچیے۔ کیا ہم اس نازک صورت حال میں کسی قسم کی نااتفاقی کے متحمل ہو سکتے ہیں ؟ کیا یہ وقت عصبیت کو بڑھاوا دینے کا ہے ؟ کیا یہ وقت کفر اور گم راہی کے فتوؤں کے پرچار کا ہے ؟ کیا یہ وقت نظریاتی اختلاف کو تشہیر دینے کا ہے ؟ جب نہیں ہے تو ہم کیوں ایسا کر رہے ہیں ؟ ہم کیوں مسلم امہ کو یک جا کرنے میں اپنی توانائیاں صرف نہیں کر رہے ؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام سرگرمیوں کو عالمی سطح پر ترک کر دیا جائے، جو کسی بھی طرح مسلم امہ میں نا اتفاقی کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔

اس وقت پورا عالمِ اسلام فرقہ واریت کے بھینٹ چڑھا ہوا ہے۔ شام اور عراق کے شیعہ سنی فسادات اسی فرقہ واریت کا شاخسانہ ہیں۔ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ مسلمانوں کی توانائیاں مسلمانوں کے خلاف ہی استعمال ہو رہی ہیں۔ مسلمان طیش میں آکر اپنے آپ سے بدلہ لے رہا ہے۔ ابھی آج ہی ایک خبر نظر سے گزری کہ سعودی عرب کے نوجوان جہاد کے لیے عراق اور شام کا رخ کرتے ہیں، تاکہ اپنے مخالف فرقے کی بیخ کنی کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیں۔ یہاں تک کہ جان بھی ! ذرا سوچیے، اس طرح نا تفاقی پھوٹے گی یا نہیں ؟ جہاد ایک مذہبی عبادت ہے۔ قرآن مجید کی کئی آیات جہاد کے حکم پر مشتمل ہیں۔ اس سے انکار ممکن نہیں۔ مگر میرا سوال یہ ہے کہ یہ جہاد ان ممالک میں کیوں نہیں کی جاتا، جہاں در حقیقت جہاد کی ضرورت ہے ؟ مثلا: اسرائیل اور فلسطین

کی حالیہ جنگ کو ہی دیکھ لیجیے ۔ مجھے اسرائیل کے خلاف صرف ایک جہادی تنظیم یعنی حماس لڑتی ہوئی نظر آئی ۔ وہاں حقیقت میں جہاد ہو رہا ہے ۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسلامی ممالک کی ساری جہادی تنظیمیں اسرائیل پر ٹوٹ پڑتیں ۔ کیا داعش ۔۔ کیا حزب اللہ ۔۔ کیا تحریکِ طالبان ۔۔۔ کیا الشباب ۔۔۔ کیا امارتِ اسلامیہ ۔۔ کیا بوکو حرام ۔۔۔ اس طرح ان کو عام لوگوں کی ہم دردی بھی حاصل ہو جاتی ۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ یہ ساری تنظیمیں ، اسرائیل اور فلسطینی جنگ سے دور رہیں ۔ البتہ اپنے اپنے ملکوں میں اسلامی شریعت " کے نفاذ میں مصروف رہیں ۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس نازک صورت " حال میں حزب اللہ اور داعش اپنے فرقہ وارانہ اختلافات بھلا دیتی ۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا ۔ یہ دونوں تنظیمیں فرقہ واریت کی آگ میں اپنے لوگوں کی جانیں نچھاور کرتی رہیں ۔ اور دوسری طرف اسرائیل ان کے اپنے لوگوں کو شہید کرتا رہا ۔

اگر آج مسلمان متحد ہوتے تو اسرائیل کو یہ جراء ت کبھی نہ ہوتی کہ وہ فلسطین کے معصوم لوگوں بہ شمول بچوں اور عورتوں کے یوں بے دردی سے شہید کرتا ۔ ایک ارب ساٹھ کروڑ مسلمانوں کے مقابلے میں اسرائیل کی کیا حیثیت ہے ! او آئی سی اسرائیل کی ظالمانہ جراء ت کے سامنے کچھ نہ کر سکی ۔ اقوامِ متحدہ کے بعد دنیا کی دوسری بڑی تنظیم اپنے تمام ممبر ممالک کا مشترکہ اجلاس بلانے میں ناکام رہی ۔ وجہ نا اتفاقی ٹھہری ۔ یعنی صورت حال بہ ایں

جا رسید کہ تمام مسلم ممالک کے سربرہ ایک ساتھ بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ جب حالات اتنے پیچیدہ ہو جائیں گے، تو کیوں کر ہمارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

آخر میں، میں قرآن مجید کی چند آیات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں، جو مسلم امہ کے اتحاد کے الہامی حکم پر مشتمل ہیں۔ کاش! نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر ہر ہر مسلمان ان الہامی احکامات پر عمل پیرا ہو جائے۔ تاکہ ہم سکھ سے جی سکیں۔

"اللہ کی رسی کو سب مضبوطی سے تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو۔ اور اللہ کی اس وقت کی نعمت کو یاد کرو، جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ پس تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے تو اس نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اللہ اسی طرح تمھارے لیا اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔" (103:3)

"بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ بن گئے، آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ بس ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ پھر وہ ان کو بتلا دے گا، جو کچھ وہ (دنیا میں) کرتے رہے۔" (159:6)

یاد رکھو) سارے مسلمان بھائی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں میں ملاپ کرا دیا)"
(کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔" (10:49)

مندرجہ بالا آیات آپ کی نظروں سے کئی بار گزری ہوں گی۔ آپ نے پڑھی بھی ہوں گی اور سنی بھی ہوں گی۔ ان آیات کو پڑھ کر ضرور سوچیے گا کہ کیا آج کے مسلمان میرے رب کے ساڑھے چودہ سو سال پہلے دیے ہوئے ان احکامات پر عمل پیرا ہیں ؟؟؟

## 9/11 سے داعش تک

11 ستمبر 2001 کو امریکا میں 4 فضائی حملے ہوئے۔ ان میں سے دو حملے نیویارک کی بلند وبالا عمارت ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ہوئے۔ ان حملوں کے نتیجے میں 2974 لوگ ہلاک ہوئے۔ یہ سانحہ امریکی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ سمجھا جاتا ہے۔ امریکا نے ان حملوں کا ذمہ دار القاعدہ کو ٹھہرایا۔

9/11 کے حادثات نے امریکا کو پورے عالم میں اپنی بالادستی قائم کرنے کا جواز فراہم کیا۔ امریکا نے "وار آن ٹیرر" کی ابتدا کردی۔ اس وقت صدر جاج بش کے غیض و غضب سے بھرپور آراء نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ جارج بش ایک موقع پر یہ بھی کہہ بیٹھے کہ جو ملک امریکی پالیسیوں کو سپورٹ نہیں کرے گا، اس کے ساتھ امریکا اپنے دشمنوں جیسا سلوک کرے گا۔ جارج بش کے اس طرح کے سخت احکامات کے سامنے سارے ملک دم بہ خود ہوگئے۔ اس طرح جو ملک امریکا کی وار آن ٹیرر کے خلاف تھے، وہ بھی اس کے حامی بن گئے۔ 11/9 کے بعد دنیا کا جو ملک سب سے پہلے امریکی بربریت کا نشان بنا، وہ افغانستان تھا۔ افغانستان میں اس وقت طالبان کی حکومت تھی۔ اور القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن بھی افغانستان میں تھے۔ امریکا اور برطانیہ نے افغانستان کی

طالبان حکومت کو اسامہ کو حوالے کرنے کا کہا۔ طالبان نہیں مانے۔ بالآخر 7 اکتوبر 2001 کو وہاں بم باری شروع کر دی گئی۔ امریکا کو افغانستان میں اسامہ تو نہیں مل سکا۔ البتہ افغانستان کو تہس نہس کرنے کا موقع ضرور مل گیا۔ ایک معتبر ویب سائٹ کے مطابق افغانستان میں امریکا نے اکیس ہزار عام شہریوں کو شہید کر دیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا امریکا "وار آن ٹیرر" کے نام پر افغانستان میں شروع کی جانے والی جنگ میں مکمل طور پر کام یاب ہو چکا ہے؟ کیا اب افغانستان میں دہشت گردی کے خطرات ٹل گئے ہیں؟ کیا امریکا کے جانے کے بعد یہ ملک مکمل طور پر پر امن ہو جائے گا؟ اگر ان سب سوالات کا جواب "نہیں" ہے، تو میں امریکا کی اس نام نہاد "وار ان ٹیرر کو کیا نام دوں، جس میں میرے ملک کے پچاس ہزار لوگ جان کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں؟

امریکا نے افغانستان پر حملے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس نے عراق کو بھی خون میں نہلا دیا۔ عراق پر حملے کا بہانہ یہ بنایا گیا کہ اس کے پاس خطرناک ہتھیار ہیں۔ حالاں کہ ہینس بلکس نے، جو اس وقت اقوامِ متحدہ کے ویپن انسپکٹر تھے، 14 فروری 2003 کو اقوامِ متحدہ کی سکیورٹی کونسل میں عراق میں "مطلوب" ہتھیاروں کے نہ ہونے کا اعتراف کر دیا تھا، اس کے باوجود امریکا اور برطانیہ اپنے غرور کے ساتھ 20 مارچ 2003 کو عراق پر چڑھ دوڑا اور اس وقت تک بس نہیں کیا، جب تک عراق کو مکمل طور پر تہس نہس نہیں کر

دیا۔ نیشنل جغرافیہ کے ایک سروے کے مطابق، جو اس ادارے نے 2003 میں کیا تھا عراق میں 2003 سے 2011 تک رہنے والی جنگ میں پانچ لاکھ لوگ شہید ہوئے۔ ۔ وائس آف امریکا کے مطابق اس جنگ میں 4500 امریکی ہلاک ہوئے۔

اب جب کہ 2014 ہے، بہت کچھ بدل گیا ہے۔ امریکا عراق سے نکل چکا ہے۔ افغانستان سے جانے والا ہے۔ لیکن سوال وہی کہ کیا امریکا کام یاب ہو چکا؟ اس کا جواب بلاشبہ " نہیں " ہے۔ اگر امریکا کی نام نہاد "وار آن ٹیرر" کا نقصان صرف اسی کو ہوتا تو آج شاید میں کچھ اور لکھ رہا ہوتا۔ لیکن کیا کروں کہ امریکا کی اس جنگ نے پوری مسلم کمیونٹی پر انتہائی منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس وقت مسلم دنیا کا بڑا حصہ دہشت گردی اور فرقہ واریت جیسے خطرناک مسائل کا شکا ہے۔ جس میں بالواسطہ امریکا کا ہاتھ ہے۔

امریکا نے جب یہ نام نہاد جنگ شروع کی تھی، اس وقت اسے لگ رہا تھا کہ وہ پوری مسلم دنیا سے مزاحمتی تنظیموں کو ختم کر دے گا۔ یوں اس کے تسلط کے خلاف کوئی بولنے والا نہیں ہوگا۔ اور وہ بغیر کسی مزاحمت کے خصوصا پوری مسلم دنیا پر اور عموما پوری دنیا پر اپنا تسلط قائم کر لے گا۔ لیکن 2014 کے واقعات یہ ثابت کر رہے ہیں کہ یہ امریکا کی بھول تھی۔ شاید امریکی تاریخ کی سب سے بڑی بھول تھی۔ القاعدہ بھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی، اور

اس کے بطن سے اس جیسی کئی دیگر تنظیمیں جنم لے چکی ہیں۔ جن میں سر فہرست "داعش" ہے۔ اس تنظیم نے جس تیزی سے شہرت حاصل کی ہے، اس پر امریکا خود بھی حیران ہے۔ پچھلے دنوں اس تنظیم نے جیمز فولی (ایک امریکی صحافی) کی زبح ہونے کی ویڈیو جاری کی، جس پر امریکا بھی ششدر ہے۔ اس ویڈیو سے اس تنظیم کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جیمز فولی کی گردن اڑنے والا اگرچہ داعش سے وابستہ ہے، لیکن اس کا تعلق برطانیہ سے ہے۔

9/11 سے داعش تک کا سفر، خاک و خون سے لتھڑا ہوا۔ افسوس اس بات کا بھی ہے کہ کئی لوگ اس سفر میں جانیں گنوا بیٹھے۔ مگر اس سے بھی زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اب دنیا پہلے سے زیادہ دہشت گردی کا شکار ہو چکی ہے۔ نہ جانے کیا ہوگا!!

## لیبیا۔۔۔قذافی کے بعد

بی بی سی کے مطابق، "اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے لیبیا میں جاری لڑائی کو فوری طور پر روکنے کی قراداد منظور کرتے ہوئے لیبیا کے حریف ملیشیا گروپوں کے درمیان تشدد کے واقعات میں ملوث افراد کے خلاف پابندی عائد کرنے کی تجویز دی ہے۔ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے لیبیا کے ملیشیا گروپوں اور فوج کے دھڑوں کے درمیان تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات پر تشویش ظاہر کی ہے۔ سلامتی کونسل نے بدھ کو متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی، جس میں ان لوگوں اور گروہوں پر پابندی کی دھمکی دی گئی، جو لیبیا کی سلامتی کے لیے خطرہ پیدا کر رہے ہیں یا سیاسی تبدیلی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ایسے افراد یا گروہوں کے کی جائداد فروخت کی جا سکتی ہے یا ان پر سفری پابندی عائد کی جا سکتی ہے۔
"

اس وقت لیبیا کی صورت حال یہ ہے کہ وہاں 2011 ء میں معمر قذافی کے خلاف بغاوت کرنے والے گروہ آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ 2011ء سے اب تک سیکڑوں لوگ آپس کی لڑائی میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ لیبیا کے دارالحکومت طرابلس

کا ہوائی اڈہ ان دنوں "فجر لیبیا" نامی ایک گروہ کے قبضے میں ہے۔ پچھلے کئی دنوں سے اس ہوائی اڈے پر قبضہ کرنے کے لیے متعدد گروہ آپس میں برسرپیکار تھے۔ تاہم جیت فجر لیبیا کی ہوئی۔ العربیہ کے مطابق: "طرابلس کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر قبضے کے لیے اسلامی جنگجوؤں اور حکومت نواز ملیشیاکے درمیان 13 جولائی سے لڑائی جاری تھی۔ دونوں متحارب جنگجو گروپ ایک دوسرے کے ٹھکانوں پر راکٹ گرینیڈوں اور "توپوں سے حملے کرتے رہے ہیں۔

ایک خبر کے مطابق لیبیا میں عبوری حکومت نے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ یوں دو پارلیمانی اداروں کے درمیان سیاسی کش مکش زور پکڑ رہی ہے۔ وائس آف جرمنی کے مطابق: "دیکھا جائے تو اس عبوری حکومت کو لیبیا میں ویسے بھی کوئی حقیقی طاقت حاصل نہیں تھی۔ اس حکومت کا ہیڈ کوارٹر ملک کے مشرقی حصے میں واقع ہے کیونکہ یہ ادارہ طرابلس میں اسلام پسند ملیشیا گروہوں کے دائرہ اثر سے بچنا چاہتا تھا۔ خود پارلیمان کا ہیڈکوارٹر بھی دارالحکومت طرابلس سے سولہ سو کلومیٹر مشرق کی جانب شہر طبروق میں ہے۔ یہ پارلیمان اس سال جون میں منعقدہ انتخابات کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی اور تب اس نے فوری طور پر لیبیا کی قومی کانگریس کے اختیارات سنبھال لیے تھے۔ "اس وقت لیبیا میں پارلیمان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ملک پر ملیشیاز کا راج ہے۔ جو کسی طرح بھی حکومت کے زیرِ تسلط نہیں آ رہے۔

2011ء میں تیونس اور مصر کے بعد لیبیا متاثر ہوا۔ بہارِ عرب کی لہر نے 40 سال سے شاہی کرسی پر متمکن معمر قذافی کو اُس جہان پہنچا دیا۔ معمر قذافی 1942ء میں سرت کے نزدیک ایک صحرائی علاقے میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں وہ مصر کے سابق صدر اور قوم پرست جمال عبدالناصر سے کافی متاثر تھے۔ 1969 ء میں انھوں نے بن غازی کو مرکز بنا کر اس وقت کے لیبین حکم ران شاہ ادریس کے خلاف بغاوت کردی۔ جس میں وہ کام یاب ہوگئے۔ یوں وہ لیبیا کے مطلق العنان بادشاہ بن گئے۔ ابتدا میں وہ عرب قوم پرستی کے علمبردار تھے۔ 1990ء میں وہ انھوں نے اپنی توجہ کا محور براعظم افریقہ کو بنا دیا۔ انھوں نے متحدہ افریقہ کا تصور بھی پیش کیا۔ انھوں نے سوشلزم، سرمایہ داری اور اسلام کے کچھ پہلوؤں کو ملا کر اپنی سبز کتاب پر مبنی سیاسی نظریات بھی پیش کیے۔ انھوں نے اپنے پورے دورِ اقتدار میں اپنے خلاف کی گئی ہر مخالفت کو بری طرح کچل دیا۔ لیکن 2011ء میں نہ جانے کیا ہوا کہ یکایک پورا لیبیا ان کے خلاف ہو گیا۔ یہ دنیا واقعی عبرت کدہ ہے۔ یہاں، کبھی کبھی، ان کو بھی نشانِ عبرت بننا پڑتا ہے، جو تخت و تاج کے وارث ہوتے ہیں۔ جو انسانیت پر ظلم کرتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں کہ وہ عوام کو ڈرا دھمکا کر، جتنا چاہیں، اپنے تسلط کو طول دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی بھول ہوتی ہے، زمانے کا کیمرہ ان کی گلیوں میں گھسیٹنے کی فوٹیج اپنی آنکھوں میں محفوظ کرلیتا ہے

۔ لیکن اس کے باوجود اقتدار کے نشے میں چور حکم ران اور بادشاہ عبرت نہیں پکڑتے اور اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔

قذافی بہت سخت گیر حکم ران تھے۔ ان کے دور میں اگر کوئی ان کے خلاف نہیں بول سکتا تھا تو اس کے ساتھ ساتھ کسی کو یہ ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ ملک میں انتشار پھیلائے ۔ لیکن اب تو پارلیمان اور لیبیا کی حکومت اتنی کم زہور ہو چکی ہے کہ وہ اپنے ملک کا ہوائی اڈا بھی جنگ جو گروہوں سے نہیں چھڑا سکی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قذافی کے دور کا لیبیا ان کے دور کے بعد کے لیبیا سے اچھا تھا!

# پاکستان کی سیاسی صورت حال

ان دنوں وطنِ عزیز کی سیاسی صورت حال ناگفتہ بہ ہے۔ اسی سیاسی صورت حال کے باعث چینی صدر کا دورہِ پاکستان ملتوی ہوا ہے۔ حکومت کے مطابق چینی صدر کے نہ آنے سے پاکستان کو 34 ارب ڈالر کا نقصان ہوا ہے۔ کیوں کہ چینی صدر نے 34 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری سے متعلق معاہدوں پر دست خط کرنے تھے۔ بی بی سی کے مطابق : "گذشتہ ماہ ہی وزیرِاعظم پاکستان نواز شریف کے دفتر سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا تھا کہ چین نے پاکستان میں بجلی کے بحران پر قابو پانے کے لیے آئندہ چار برس کے دوران ملک میں دس ہزار میگاواٹ سے زیادہ کے بجلی گھروں کی تعمیر کو ترجیحی بنیادوں پر مدد فراہم کرنے کا اعلان کیا ہے۔" سبھی جانتے ہیں کہ چین پاکستان کا ایک اچھا دوست ہے۔ لیکن ہم اپنی سیاست کے باعث اسے بھی خود سے دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ایک قابلِ ستائش امر ہے کہ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی جماعتیں چینی صدر کے دورہِ پاکستان کے لیے سرگرم ہو گئی ہیں۔ پاکستان کے دفترِ خارجہ کے مطابق چینی صدر کے دورہِ پاکستان کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ پاکستان تحریکِ انصاف کے وائس چیئرمین شاہ محمود قریشی نے کہا ہے کہ ہم چینی صدر کے دورے کی اہمیت کو بہ خوبی سمجھتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اسلام آباد میں چینی سفیر سے ملاقات کریں

گے اور چینی صدر کے دورے کو یقینی بنانے کے لیے بات چیت کریں گے۔

ملک کا دارالحکومت بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ غیر ملکی میڈیا کی نظر سب سے پہلے دارالحکومت پر ہی پڑتی ہے۔ پاکستان کا دارالحکومت ان دنوں "آزادی اور انقلاب مارچوں" کے حوالے سے غیر ملکی میڈیا میں بہت شہرت حاصل کر چکا ہے۔ یہ مارچ 14 اگست سے شروع ہوئے اور ہنوز جاری ہیں۔ ان کے رہنماؤں کے مطالبات کی صحیح طور پر شنوائی ابھی تک نہیں ہوئی۔ حزبِ اقتدار کی جماعت نے سمجھا تھا کہ یہ مارچ چند دنوں تک جاری رہیں گے۔ پھر یکایک تھم جائیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ مظاہرین زور پکڑتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ ڈی چوک سے پارلیمنٹ ہاؤس تک پہنچ گئے۔ بغیر کسی لے دے کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مارچ کے رہنماؤں کے بہت سے مطالبات قابلِ غور ہیں۔ اور حکومتی توجہ کے مستحق ہیں۔ بہر حال ہم ایسے امن پسند لوگ تو امن ہی چاہتے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا ملک انارکی کا شکار ہو۔ ہمارے پیارے ملک کے لوگوں میں انتشار پھیلے۔ نفرتیں پروان چڑھیں۔ مخالف جماعتوں کے کارکن ایک دوسرے کو سر عام گالیاں دیں۔ عدم برداشت کی فضا اس حد تک پروان چڑھے کہ اپنے رہنما پر جائز اور اصلاحی تنقید بھی عام کارکن کو سیخ پا کر دے۔ جی ہاں! سوشل میڈیا پر ایسا ہی ہو رہا ہے۔ سر عام گالیاں دی جا رہی ہیں۔ نہ عزت کا پاس، نہ مرتبے کا لحاظ۔ یہ صورتِ حال سراسر قابلِ فکر ہے۔ ایک طرف

غیر ملکی میڈیا ہمارا مذاق اڑا رہا ہے تو دوسری جانب عوام میں بھی پاکستان کی ابتر سیاسی صورت حال کے باعث نفرتیں پروان چڑھ رہی ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کی موجودہ سیاسی صورت حال کے تین بڑے نقصانات ہوئے :

چینی صدر کا دورہِ پاکستان ملتوی ہو گیا۔

غیر ملکی میڈیا پر پاکستان کے بارے میں منفی خبریں آنے لگیں۔

سوشل میڈیا پر سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کے درمیان لفظی جنگ شروع ہو گئ۔

ایک طرف اسلام آباد میں لانگ مارچوں کا سلسلہ جاری ہے تو دوسری جانب حکمران جماعت اور حزب اختلاف کی سب سے بڑی جماعت کی دو معزز شخصیات کے درمیان لفظی جنگ شروع ہو گئ۔ جو کہ ابھی ختم ہو گئ ہے۔ لیکن اس کے اثرات زائل نہیں ہوئے۔ میرا اشارہ وفاقی وزیرِ داخلہ اور سینٹر اعتزاز احسن کے درمیان ہونے والی تلخ کلامی کی طرف ہے۔ 2 ستمبر کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس کے پہلے دن اعتزاز احسن نے اپنی تقریر میں وزیرِ اعظم اوران کے قریبی رفقاء پر خاصی تنقید کی۔ جس پر وزیرِ داخلہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک دن بعد انھوں نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے اعتزاز احسن پر سخت تنقید کی۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اعتزاز احسن حسین رضی اللہ عنہ ) کا نام بھی لیتے ہیں اور یزید کا بھی دم بھرتے ہیں۔ جمعے کو پارلیمنٹ کے ) مشترکہ

اجلاس میں قائدِ حزبِ اختلاف نے چوہدری نثار سے ایوان میں معافی مانگنے کا مطالبہ کر دیا۔ چوہدری نثار نے تو معافی نہیں مانگی، لیکن وزیرِ اعظم نے مانگ لی، جو وزیرِ اعظم کی بالغ نظری کا ثبوت ہے۔ غالباً وزیرِ اعظم کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ ملک کی نازک سیاسی صورت حال میں مصالحت کی پالیسی اپنانا از حد ضروری ہے۔ وزیرِ اعظم کی معذرت کے باوجود اعتزاز احسن نے پارلیمنٹ میں بڑا تنقیدی اور سخت بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں چاہوں تو دھرنے کے خلاف تمام مزاحمت ختم کر کے اس پارلیمان کو ختم کردوں۔ بی بی سی کے مطابق: "وزیرِ اعظم نواز شریف کے خطاب کے بعد چوہدری اعتزاز احسن نے پارلیمان کے مشترکہ ایوان سے خطاب کے دوران حکومتی بینچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دو بار پہلے آپ کا یہی انجام ہو چکا ہے جسے ہم روک کر بیٹھے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں اس وقت ایوان سے واک آؤٹ کروں تو تمام حزبِ اختلاف میرے ساتھ واک آؤٹ کرے گا، صرف شاید محمود اچکزئی رہ جائیں! انھوں نے وزیرِ اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جب دھرنوں کا آغاز ہوا تھا تو آپ کے وزیروں کے چہروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے ان پر آسمان ٹوٹنے والا ہو۔ لیکن اب وہ عمران خان اور قادری کی نقلیں اتارتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سب ایوان کی طاقت ہے، اور پارلیمنٹ آپ کے پیچھے کھڑی ہے۔"

میرے خیال میں وزیرِ اعظم کی پارلیمنٹ میں معذرت کے بعد اعتزاز احسن کو

اتنی سخت زبان استعمال نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کیوں کہ وہ سخت تنقید کے بغیر بھی اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کا جواب دے سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے "محفوظ" کے بجائے غیر محفوظ" طریقہ اختیار کیا۔ دوسرے دن یعنی ہفتے کو وزیرِ داخلہ نے اپنی زندگی کی" مختصر ترین کانفرنس کے دوران اعتزاز احسن کو "در گزر" کر دیا۔ لیکن وہ اس بات کے خواہاں ہیں کہ قوم کے سامنے سچ آنا چاہیے۔ چوہدری نثار نے اس کانفرنس کے دوران یہ بھی کہا کہ اگر ان پر لگائے گئے الزامات سچ ثابت ہو گئے تو وہ وزارت سے ہی کیا سیاست سے ہی استعفیٰ دے دیں گے۔ وزیرِ داخلہ کے مصالحانہ کانفرنس کے جواب میں، اعتزاز احسن نے بھی بڑا حوصلہ افزا جواب دیا۔ یوں مصالحت کام آ گئی۔ اور آپس کی دوریاں ایک بار پھر ختم ہو گئیں۔

پاکستان کی نازک سیاسی صورت حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے سیاست دانوں کو بالغ نظری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ہمارا پیارا ملک ان دنوں "مشتعل سیاست" کا متحمل نہیں ہے۔ میرے خیال میں اب احتجاج کرنے والوں اور حکومت کے درمیان مصالحت ہو جانی چاہیے۔ خبریں یہ بھی آ رہی ہیں کہ اسلام آباد کے احتجاج کی وجہ سے پاکستانی معیشت کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ سیاست میں مصالحت اہم چیز ہے۔ حکومت کو "کچھ ان کی مانو کچھ اپنی مانو" کی پالیسی اپنانی چاہیے۔ تاکہ مزید انتشار نہ پھیلے۔ کیوں کہ ہمارا پیارا ملک

کسی صورت ۔۔۔ کسی صورت انتشار کا متحمل نہیں ہے۔

# عجیب و غریب خبریں

آج کوشش ہوگی کہ کچھ عجیب و غریب خبریں آپ کے سامنے لاؤں ۔ حالاتِ حاضرہ پر بہت کچھ لکھ لیا۔ ہمارے ہاں عجیب و غریب خبریں پڑھنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اخبارات اور ہماری نیوز ویب سائیٹیں اس طرح کی خبریں بھی آئے روز شائع کرتی رہتی ہیں ۔ یہ بڑی اچھی بات ہے ۔ کیوں کہ لوگ سیاسی اور حالاتِ حاضرہ پر خبریں پڑھتے پڑھتے بور ہو جاتے ہیں ۔اور بعض لوگ تو ایسے بھی ہوتے ہیں ، جو خبریں پڑھتے ہی محض اس لیے ہیں ، تاکہ وہ عجیب و غریب اور حیرت انگیز خبریں پڑھ کر لطف اندوز ہو سکیں ۔ وہ اس بات کے جاننے کے بالکل شائق نہیں ہوتے کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ سیلاب نے کتنی تباہی مچائی ہے ؟ دھرنوں کا کیا بنا؟ ہمارے وزیرِ اعظم کب ، کس ملک میں اپنا نیا دورہ کریں گے ؟اس ہفتے کتنے لوگ فرقہ واریت کے بھینٹ چڑھے ؟ کراچی کی ٹارگٹ کلنگ نے کتنے لوگوں کی جان لی ؟ عالمی افق پر کیا تبدیلیاں آئی ہیں ؟ امریکا کا اگلا ہدف کیا ہے ؟ اسرائیل اور فلسطین کے درمیان صلح ہوئی یا نہیں ؟ یا ابھی تک جنگ جاری ہے ؟ سعید اجمل کلئیر ہوا یا نہیں ؟ کیا واقعی آفریدی کو ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ کا کپتان بنادیا گیا ہے ؟ وغیرہ وغیرہ ۔ بہر حال ہم کسی پر تنقید نہیں کر سکتے ۔ کیوں کہ ہر ایک اپنے شوق کے مطابق خبریں پڑھتا ہے ۔ کوئی دینی اور مذہبی

خبریں پڑھتا ہے تو کوئی تعلیمی۔ کوئی سیاسی خبروں سے لطف اندوز ہوتا ہے تو کسی کی ٹیبل پر کھلاڑیوں کی تصویروں سے مزین جریدے دھرے ہوتے ہیں۔ کوئی تعلیمی خبروں کے پیچھے لگا ہوتا ہے تو کسی کو اپنے ملک کے علاوہ ہر ملک کی خبر ہوتی ہے۔ ہاں ! مگر یہ حقیقت ہے کہ آج کل زیادہ تر لوگ سیاسی اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق خبریں پڑھتے ہیں۔

اب آتے ہیں اصل موضوع کی جانب۔ معلوم ہوا ہے کہ ہانگ کانگ کی گلیوں میں خوبصورت رنگوں سے مزین ہاتھیوں نے مارچ کیا۔ ہمارے ملک میں تو عوام مارچ کرتے ہیں۔ مارچ نہیں بلکہ لانگ مارچ کرتے ہیں۔ لیکن ہانگ کانگ میں ہاتھی لانگ مارچ کرنے لگے ہیں۔ اور وہ بھی خوبصورت اور دل موہ لینے والے رنگوں سے سج دھج کر۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہاتھیوں کی اس پریڈ کا مقصد ہاتھیوں کی بقا اور بہتری کے لیے فنڈز جمع کرنا ہے۔ ایکسپریس ڈاٹ پی کے کے مطابق : "ایشیا ایلیفینٹ فاؤنڈیشن اور پریڈ کے کوآرڈی نیٹر مارک کا کہنا تھا کہ ہاتھیوں کی حفاظت کرنے کا آئیڈیا اس وقت سامنے آیا جب تھائی لینڈ میں ایک بے بی ہاتھی اپنی ایک ٹانگ سے اس وقت محروم ہوگیا جب اس کا پاؤں بارودی سرنگ پر پڑ گیا۔ اسپتال انتظامیہ کا کہنا تھا کہ ہاتھی کو مصنوعی ٹانگ لگائی جاسکتی ہے لیکن اس کے لیے فنڈز دستیاب نہیں اس کے بعد سے ہی ہاتھیوں کی پریڈ کا آئیڈیا سامنے آیا اور 2006 میں ہالینڈ کے شہر ہیرلان سے اس کا

آغاز کیا گیا اور اب تک دنیا کے کئی مقامات پر پریڈ منعقد ہو چکی ہے جو اپنے شاندار ڈیزائن کی وجہ سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔"ہمیں مغرب کی اس اچھی بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ جانوروں کے سلسلے میں کافی حساس ہیں۔

ریکارڈ بنانا بھی کوئی مغرب سے سیکھے۔ یہ لوگ عجیب و غریب ریکارڈ بناتے ہیں۔ جو ان کے مختتی ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک عجیب و غریب خبر یہ ہے کہ ایک برطانوی باغبان نے آٹھ کلو وزنی پیاز اگا کر عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ یہ واقعی حیرت انگیز خبر ہے۔ اس مختتی مالی نے اتنا بڑا پیاز اگا کر کم از کم مجھے تو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ نہ جانے اس شخص نے اتنا بڑا پیاز اگانے والا بیج کہاں سے لیا ہوگا۔ روزنامہ جنگ کی ویب سائٹ کے مطابق: "برطانیہ سے تعلق رکھنے والے ٹونی گلوور نامی باغبان نے 8 کلو سے زائد وزنی پیاز اگا کر اپنا نام عالمی ریکارڈ قائم کرنے والوں کی فہرست میں درج کرا لیا ہے۔32 انچ کی چوڑائی پر مشتمل اس پیاز کا وزن مارکیٹ میں دستیاب عام پیاز سے 25 گنا زیادہ ہے۔گلوور کا کہنا ہے کہ وہ نو عمری سے ہی اپنے باغ میں سبزیاں کاشت کرتے آرہے ہیں اور یہ پیاز انہوں نے گذشتہ برس اکتوبر کے مہینے میں کاشت کی تھی۔"

کچھ ریکارڈ خود بہ خود بھی بن جاتے ہیں ۔ یعنی ان کے لیے انسان کو کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی ۔کچھ لوگ گینز بک آف دی ورلڈ میں اپنا نام شامل کرانے کے لیے عمریں کھپا دیتے ہیں ۔ اور کچھ لوگ گھر میں بیٹھے بیٹھے اس کتاب میں نام لکھوا دیتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ممبئی کے کرن سنگھ کو لے لیجیے ۔ اس بچے کی عمر محض 5 سال ہے ۔ مگر اس کا قد پانچ فٹ ، سات انچ کا ہے ۔ روزنامہ پاکستان کی ویب سائٹ کے مطابق: "کیا یہ حیران کن نہیں ہے کہ 5 سالہ کرن سنگھ 5 فٹ اور 7 انچ قامت کا ہے۔ اس غیر معمولی قد کی وجہ سے سر سنگھ کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں 2008ء میں شامل ہوا ۔ وہ اس وقت دنیا کا طویل قامت کا واحد بچہ تھا۔ اس کا وزن 7 کلو گرام تھا لیکن نشو و نما کا عمل رکا نہیں۔ کرن سنگھ کے والد کا قد 6 فٹ اور 6 انچ تھا جبکہ والدہ شویتا لان 7 فٹ 2 انچ کی حامل خاتون تھی وہ بھارت کی طویل القامت خاتون ہیں۔ کرن سنگھ باسکٹ بال کا کھلاڑی بننا چاہتا ہے اور ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ وہ دنیا کا طویل القامت شخص بن سکتا ہے اگر اسے کبھی صحت کے دیگر مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

پچھلے دنوں بی بی سی اردو نے اپنی ویب سائٹ پر "دس چیزیں جن سے ہم لاعلم تھے" کے نام سے ایک مضمون شائع کیا۔ یہ مضمون دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلوماتی بھی ہے ۔ ان دس چیزوں میں سے چند چیزیں درج ذیل ہیں :

1 ۔ بی بی سی نے نیوز وائر کے حوالے سے بتایا کہ موسمِ گرما میں پیدا ہونے

والے بچے موسم سرما میں پیدا ہونے والوں کے مقابلے میں زیادہ جلدی گھٹنوں کے بل چلتے ہیں۔

2۔ نیند میں بھی ہمارا دماغ جاگ رہا ہوتا ہے۔سائنسدان کہتے ہیں کہ دورانِ غنودگی، لوگ الفاظ کی شناخت کر سکتے ہیں۔

3۔ سب سے بڑا شکاری ڈائنوسار ممکنہ طور پر پوری مچھلی کھا جاتا تھا۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈائنوسار کتنا بڑا ہو گا۔

4۔ دی ٹائمز کے مطابق بابل کے ایک نسخے میں دی گئی ہدایت کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جس رسی سے بنی گئی تھی اس کی لمبائی لندن سے ایڈنبرا کے فاصلے کے برابر تھی۔

5۔ دنیا میں پہلی بار ڈی این اے فنگر پرنٹ کا استعمال ایک نوجوان تارکِ وطن کو واپس گھانا بھیجنے سے بچانے کے لیے کیا گیا تھا۔

6۔ اگر ہر ایک کو اس کے صحیح ساتھی کی تلاش ہو تو دنیا میں سچا پیار دس ہزار زندگیوں میں سے صرف ایک میں مل سکے گا۔

ذرا تصور کیجیے کہ اگر کسی ٹی وی شو میں چمگادڑ آ جائے تو کیا ہوگا۔ظاہر ہے، یہ ٹی وی شو خبروں کے حوالے سے نہیں، بلکہ "چمگادڑ" کے حوالے سے یادگار بن جائے گا۔ایسا ہی ایک واقعہ امریکا میں پیش آیا، جہاں آن کی آن میں

ایک چمگادڑ بن بلائے مہمان کی طرح آ ٹپکا۔ اب تک ڈاٹ ٹی وی کے مطابق: "امریکی ٹی وی پر "گڈ مارننگ شو ٹینیسی" جاری تھا اور اسے 3 اینکرز بو ولیم، ٹیئر سا اور ماہر موسمیات جولیا جونسن پیش کر رہے تھے۔ تینوں اینکرز بڑے انہماک سے پروگرام کو جاری رکھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک چمگادڑ اسٹوڈیو میں داخل ہو گئی اور یہ جانے بغیر کہ پروگرام براہ راست نشر کیا جا رہا ہے، اسٹوڈیو میں اپنی پرواز کی مہارت دکھانی شروع کر دی، اب کیا تھا چمگادڑ کی یہ اچانک آمد ان کے لیے کسی مصیبت سے کم نہیں تھی، چمگادڑ کبھی ایک اینکر کے اوپر سے پرواز کرتی ہوئی ایک کونے سے دوسرے کونے پہنچ جاتی اور کبھی دوسرے اینکر کے کان کے قریب اپنی میٹھی آواز میں گانا سنانے کی کوشش کرتی۔"

کالم بہت طویل ہو گیا۔ اسی پر اکتفا ہے۔

## نو عادتیں، جن کو چھوڑ دینا چاہیے

کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ تحریر معلوماتی ہو۔ اور وہ معلومات سود مند بھی ہوں۔ اصلاح اسی کا نام ہے۔ یاد رکھیے کہ اصلاح پر کسی جماعت یا قوم کی اجارہ داری نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو اچھی باتیں سامنے لاتا ہے، مصلح ہے۔ چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ یوں ہر شخص اپنے اپنے دائرہِ کار میں رہتے ہوئے یہ فرض انجام دے سکتا ہے۔ ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اچھی بات جو بھی کرے، سن لینی چاہیے۔ پھر اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ یہ بات کس نے کہی ہے۔ اس کا کس مذہب، ملک یا قوم سے تعلق ہے۔ بہ صورتِ دیگر اصلاح کا عمل رک جائے گا۔

گذشتہ دنوں انٹرنیٹ سرفنگ کے دوران ایک دلچسپ، معلوماتی اور فائدہ مند مضمون پڑھنے کو ملا۔ ہو سکتا ہے، آپ میں سے اکثر نے وہ مضمون پڑھا ہو۔ لیکن اچھی بات کو دہرانے میں کیا حرج ہے۔ پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ میں سے بہت سوں نے وہ نہ پڑھا ہو۔

انک ڈاٹ کام ایک مشہور ویب سائٹ ہے۔ یہ ویب سائٹ سرمایہ داروں اور کاروباری حضرات کے لیے سود مند اور کارآمد نصیحتوں پر مشتمل مضامین شائع کرتی ہے ۔ انک کا ادارہ ایک میگزین بھی شائع کرتا ہے۔ یہ میگزین بھی سرمایہ داروں اور کاروباری حضرات کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارے کی اس حوالے سے اور بھی بہت ساری خدمات ہیں۔ کچھ دنوں پہلے امریکا کے مشہور جریدے "ٹائم" نے اپنی ویب سائٹ پر انک ڈاٹ کام کی شراکت سے ایک مضمون شائع کیا۔ جس کا عنوان تھا: "نو خطرناک عادتیں، جو آپ کو جلد چھوڑ دینی چاہییں"۔ ان نو خطرناک" عادتوں کو چھوڑ دینے کا مشورہ ٹم فیرس نے اپنی ایک پوڈکاسٹ ( ڈیجیٹل" آڈیو فائل ) میں دیا ہے۔ ٹم فیرس ایک امریکن بیسٹ سیلنگ مصنف ہیں۔ مغربی دنیا انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ہم سے کئی گنا آگے ہے، لیکن وہاں اب بھی کتابیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور کئی کتابیں اس انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں بھی بہترین خریداری کا ریکارڈ بنالیتی ہیں۔ اس معاملے میں ہمارے لیے مغرب واقعی قابلِ تقلید ہے ۔

ٹم فیرس نے جن نو خطرناک عادتوں کو چھوڑنے کا مشورہ دیا ہے، ان میں سے اکثر انفارمیشن ٹیکنالوجی یا کمیونیکیشن سے متعلق ہیں۔ یہ امر اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی ہماری زندگیوں میں خطرناک حد تک جا

گزیں ہو چکی ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں بنا دیا ہے۔ ہم گھر میں بیٹھے بیٹھے منٹوں میں دنیا کے کسی بھی ملک کی خبر پڑھ لیتے ہیں۔ نقصان، مگر اس کا یہ ہوا کہ ہم خاندانی زندگی سے مکمل طور پر نہیں تو بہت حد تک کٹ چکے ہیں۔ حالت بہ ایں جا رسید کہ ہمیں دنیا کے آخری ملک کی خبر بھی معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ساتھ والے گھر کی حالت کیا ہے۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی جانب آتے ہیں۔ ٹم فیرس نے جن نو خطرناک عادتوں سے چھٹکارے کا مشورہ دیا، وہ یہ ہیں:

1۔ نا معلوم کال کا جواب نہ دیں۔

فیرس اپنے اس سود مند مشورے کے حق میں دو دلائل دیتے ہیں۔ اول نا معلوم کال کی دخل اندازی آپ کی توجہ میں مخل ہوگی۔ یوں آپ اپنی ساری توجہ، جو آپ نے کسی نکتے پر مرکوز رکھی ہوگی، آن کی آن میں کھو دیں گے۔ دوم یہ کہ آپ نا معلوم کال پر بات کرتے ہوئے کمزور پوزیشن پر ہوں گے۔ بہ نسبت کال کرنے والے کے۔ کیوں کہ وہ تو آپ سے بات کرنے سے پہلے اچھی طرح تیار ہوگا، لیکن آپ نہیں ہوں گے۔ ایسی صورت حال میں کالر سے گوگل وائس، فون ٹیگ یا معمولات کے کاموں میں سے کم از کم ایک کام کرکے یہ "کارِ خیر" کریں۔

3۔ واضح مقصد کے بغیر میٹنگ نہ کریں۔ ای میل کی درخواست کیجیے۔

2۔ دن کی ابتدا یا انتہا میں "ای میل" پہلا یا آخری کام نہیں ہونا چاہیے ۔

فیرس کے مطابق یہ عمل آپ کی دن کی ترجیحات کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو بے خوابی یعنی نیند نہ آنے کی بیماری میں بھی بتملا کر سکتا ہے۔ فیرس مشورہ دیتے ہیں کہ صبح دس بجے تک ای میل نہ دیکھیں یا پھر اپنے

فیرس کہتے ہیں کہ اگر مطلوبہ ملاقات کا نتیجہ واضح ہو تو ملاقات یا میٹنگ کی جا سکتی ہے۔ فیرس اس پر بھی ایک کڑی شرط لگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ملاقات صرف آدھے گھنٹے کی ہونی چاہیے۔ ملاقاتیوں سے پہلے ہی ملاقات کے موضوع کے حوالے سے بات کر لینی چاہیے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اگر میٹنگ کا ایجنڈا طے نہیں ہو پا رہا تو پھر اس سے گریز ہی بہتر ہے۔

4۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے والوں سے بچیے۔

فیرس کہتے ہیں کہ کبھی کبھی چھوٹی بات.بڑا وقت بھی لے لیتی ہے۔ وہ مشورہ دیتے ہیں کہ جب لوگ باتوں کے دوران ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں تو تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے ان سے بات کرنا ختم کر دیجیے۔ یہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔ فیرس اس ضمن میں کچھ شرائط بھی عائد کرتے ہیں۔

5۔ بار بار ای میل چیک نہ کریں۔

فیرس کہتے ہیں کہ ای میل چیکنگ کا ایک وقت متعین کر لیجیے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ آپ کا ان باکس کوکین کی ایک گولی کی طرح ہے۔ اس نشے کے عادی نہ ہو

جائیے۔ ای میل کا جواب دینے کے لیے خود بہ خود جواب دینے والے ٹولز کا استعمال کیجیے
۔

۔ کم منافع بخش گفتگو میں خود کو نہ الجھائیں۔ 6

فیرس کہتے ہیں کہ آپ 20-80 کی ایک فہرست بنالیں۔ جو 20 فی صد لوگ آپ کی کمپنی کو 80 فی صد منافع دیتے ہیں، انھیں ان 80 فی صد لوگوں سے الگ کر لیجیے، جو ان سے کم منافع دیتے ہیں۔

۔ بہت زیادہ مصروف لگنے کے لیے زیادہ کام نہ کریں۔ 7

فیرس کہتے ہیں کہ زیاد کام کرنے کے بہ جائے آرام سے بیٹھ کر اپنے ترجیحی کام کریں۔ اگر آپ کام سے مغلوب ہو جائیں گے تو بے سکونی سے کام کرتے ہوئے آپ بہت زیادہ غلطیاں کریں گے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ آرام سے بیٹھیں اور پہلے سوچیں کہ آپ کے لیے کون سا کام کرنا ضروری ہے۔ اس صورت میں اگر آپ کے پاس وقت کی کمی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی ترجیحات درست نہیں اس لیے زیادہ کام کرنے سے پہلے زیادہ سوچنا بہتر ہے۔

۔ ہفتے میں ایک دن فون کی جان چھوڑ دیں۔ 8

فیرس کہتے ہیں کم از کم ہفتے میں ایک دن اپنا اسمارٹ فون کسی ایسی جگہ رکھ دیں، جہاں آسانی سے رسائی محال ہو۔ اگر آپ یہ پڑھ کر ہانپنے لگے ہیں تو غالباً آپ ہی وہ آدمی ہیں، جنھیں خصوصاً یہ عادت ترک کر دینی چاہیے۔

۔ صرف کام ہی زندگی نہیں ہے۔ 9

فیرس کہتے ہیں کہ صرف کام ہی زندگی نہیں ہے۔ کام ضروری ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کام سے کچھ اصولوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ مصروف زندگی میں ان لوگوں کے لیے بھی کچھ وقت بچایئے، جو آپ کے پیارے اور عزیز ہیں۔

مضمون طویل ہوگیا۔ اسی پر اکتفا ہے۔

## سانحۂ پشاور۔۔۔مذمتیں اور اسلامی تعلیمات

سانحۂ پشاور نے سب کو سوگ وار کردیا ہے۔ دیسی بدیسی، ہر ایک غم گین ہوگیا۔ سب نے مذمت کی۔ سب نے افسوس کیا۔ باراک اوباما نے کہا کہ ان کی دعائیں بچوں کے خاندانوں کے لیے ہیں۔ پریشانی کے اس لمحے میں امریکا پاکستانی قوم کے ساتھ ہے۔ انتہا پسندی اور دہشت گردی کی جنگ میں پاکستانی حکومت کی حمایت کرتے ہیں۔ تاکہ سارے خطے میں امن واستحکام کا قیام ممکن ہوسکے۔ انجیلا مرکل نے کہا ہے کہ پشاور میں اسکول پر حملے نے ان کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بچوں کا قتل اور انھیں یرغمال بنانے کا فعل ایسی بربریت ہے کہ اس کی مثال ممکن نہیں۔ بان کی مون نے کہا ہے کہ اس بربریت کو کسی طور پر بھی درست کہنے کا جواز موجود نہیں ہے اور کوئی بھی شکوہ شکایت بچوں کو ہلاک کرنے کا بہانہ نہیں بتایا جاسکتا۔ یہ حملہ ایک خوف کی علامت ہونے کے علاوہ ایک بزدلانہ فعل ہے۔ تعلیمی اداروں کو محفوظ بنانا از حد ضروری ہے۔ تاکہ طلبا آزادی سے علم کا حصول جاری رکھ سکیں۔ کیوں کہ تعلیم حاصل کرنا ہر بچے کا بنیادی حق ہے۔ اسٹریلیا کے وزیرِ اعظم ٹونی ایبٹ نے کہا ہے کہ اس المیے پر افسوس کے لیے الفاظ میسر نہیں۔ پاکستانی قوم میں جو دکھ اور غضب پایا جارہا ہے، اس کا ادراک ساری دنیا کرسکتی ہے۔ دنیا بھر میں وہ ایسے افراد کے ساتھ ہیں،

جو چاہتے ہیں کہ ایسا دردناک واقعہ دوبارہ رونما نہ ہو۔ ڈیوڈ کیمرون نے کہا ہے کہ جو کچھ پاکستان میں رونما ہوا ہے، وہ نا قابلِ یقین ہے۔ اس بہیمانہ فعل کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ نہ ہی اسے کسی طور پر صحیح کہا جاسکتا ہے۔ یہ فعل کسی طور پر بھی دنیا کے ایک عظیم مذہب اسلام کے تحت نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ جب کہ یہ عمل اس کے الٹ ہے۔ جان کیری نے کہا ہے کہ یہ قابلِ افسوس ہے کہ علم کے حصول کی جگہ کو خوف و دہشت کا گھر بنا دیا گیا۔ افغان طالبان نے کہا ہے کہ پشاور میں حملہ غیر اسلامی فعل ہے اور افغان طالبان نے معصوم افراد کو ہلاک کرنے کی ہمیشہ مذمت کی ہے۔ وزیرِ اعظم پاکستان نے اسکول پر حملے کو "قومی سانحہ" قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اس حملے کے بعد دہشت گردی کے خلاف جنگ آخری مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔

ان 132 معصوموں کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ آرمی کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کوئی قصور نہیں تھا۔ ایسی بربریت کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اس حملے کی جتنی مذمت کی جائے، کم ہے۔ ایسے وقعات متقاضی ہیں کہ ہم سب متحد ہو جائیں۔ اولاً اپنے دشمن کو تلاش کریں۔ ثانیاً اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ اور اسے پاش پاش کر دیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔ دشمن ہمارے تعلیمی اداروں تک آن پہنچے ہیں۔ یعنی اب ہمارے تعلیمی ادارے بھی محفوظ نہیں

رہے۔ پاکستان اس حد تک دہشت گردی کا شکار پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے رہ رہ کر وہ معصوم بچے یاد آرہے ہیں، جو نہ جانے کتنی امنگوں کے ساتھ گھر سے نکلے ہوں گے ۔ان کے والدین کو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ ان کے بچوں کے ساتھ ان کی آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے بچوں کو کبھی زندہ نہیں دیکھ پائیں گے۔ زیادہ تر بچوں کی عمریں 9 اور 16 سال کے درمیان تھیں۔ کل شہادتیں 142 ہوئیں۔ جن میں سے 132 بچے تھے۔

امن کے مذہب اسلام کے پیروکار یہ قبیح فعل کیوں کر کر سکتے ہیں، یہ سوچ کر میرا دماغ پھٹا جارہا۔ یہ فعل سراسر اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ اسلام معصوم بچوں کے قتل کے حق میں نہیں ہے۔ خلیفہِ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب شام پر لشکر کشی ہوئی تو آپ نے سپہ سالار سے فرمایا: " تم ایک ایسی قوم کو پاؤ گے، جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے، ان کو چھوڑ دینا۔ کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا۔ پھلدار درخت کو نہ کاٹنا۔ کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا۔ بکری اور اونٹ کو کھانے کے سوا بے کار ذبح نہ کرنا۔ نخلستان نہ جلانا۔ مالِ غنیمت میں غبن نہ کرنا اور بزدل نہ ہو جانا۔ قرآنِ مجید کی ایک خوب صورت آیت ملحوظ ہو: "ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی کو بغیر اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد مچانے والا ہو،

قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جو شخص کسی ایک کی جان بچا لے، اس نے گویا تمام لوگوں کو زندہ کر دیا۔" (سورۃ المائدہ، آیت نمبر 32) اس آیت کی تفسیر میں علماء لکھتے ہیں کہ یہ اصول صرف بنی اسرائیل کے لیے نہیں تھا۔ اسلام کی تعلیمات کے مطابق بھی یہ اصول ہمیشہ کے لیے ہے۔ سلیمان بن ربعی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن (بصری) سے پوچھا: یہ آیت ہمارے لیے بھی ہے، جس طرح بنی اسرائیل کے لیے تھی؟ انھوں نے فرمایا کہ ہاں، قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں! بنی اسرائیل کے خون اللہ کے ہاں ہمارے خونوں سے زیادہ قابلِ احترام نہیں تھے۔ (تفسیر احسن البیان بہ حوالہ تفسیر ابن کثیر

اس آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اسلام میں قتل کی اجازت صرف دو صورتوں میں ہے:

1۔ اگر کوئی شخص قتل کا مرتکب ہوا ہو۔

2۔ اگر کوئی شخص فساد فی الارض کا مرتکب ہوا ہو۔

لیکن آرمی پبلک اسکول کے بچے تو ان دونوں جرموں کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ اس اسکول کے عملے کا بھی ان دونوں جرموں سے دور دور کا واسطہ نہیں تھا۔ پھر انھیں اتنی بڑی سزا کیوں دی گئی؟ نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ اس حملے میں ملوث افراد کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیوں کہ درج

بالا پیراگراف میں دی گئی آیتِ مبارکہ کے ترجمے اور تفسیر اور امتِ مسلمہ کی ایک عظیم شخصیت کے اقوال کی روشنی میں ہم مدلل انداز میں یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ اسلام اس طرح کے حملوں کی کسی صورت ۔۔۔ کسی صورت اجازت نہیں دیتا۔

اسلام امن کے مذہب ہے ۔

سانحہِ پشاور کے بعد قومی رہنماؤں کے سخت بیانات سننے میں آ رہے ہیں ۔ لگتا ہے، اب بہت کچھ بدلنے والا ہے۔ لیکن یہ نازک وقت تقاضا کرتا ہے کہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے ۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس وقت پورا ملک غم وغصے میں مبتلا ہے اور غصے میں کیے گئے اکثر فیصلے صحیح نہیں ہوتے ۔ اس لیے غصہ بجا ہے۔ مگر قیامِ امن کے لیے فیصلے سوچ سمجھ کر کرنے چاہئیں ۔ تاکہ دیرپا اثرات مرتب ہوں ۔ اور اس طرح کے واقعات کبھی وقوع پزیر نہ ہوں ۔

# ذکر حبیب ﷺ، بہ زبانِ قرآنِ حکیم

ہمارے پیارے نبی ﷺ کا ذکرِ خیر ہر ایک نے اپنے طریقے سے کیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور سے لے کر آج تک رسول اللہ ﷺ کا ذکرِ خیر اپنے اپنے طریقوں سے ہو رہا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مختلف طریقوں سے رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا ہے۔ کہیں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا تو کہیں آپ ﷺ کی صفتِ رحمت کا تذکرہ کیا ہے۔ ذیل میں، میں چند آیات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کا ذکر کیا ہے:

1۔ آج کا دور بڑا نازک دور ہے۔ اس نازک دور میں اسوہِ محمدی ﷺ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ رحمتِ عالم ﷺ کی سیرت سے ہر ایک روشنی لے سکتا ہے۔ کیا مسلم، کیا غیر مسلم۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا:

"یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (ﷺ) میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے۔ ہر اس شخص کے لیے جو اللہ کی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ کی یاد کرتا ہے۔

(سورۃ الاحزاب، آیت نمبر 21)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے اسوہِ حسنہ یعنی سنتوں پر عمل کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے بھی دیا ہے۔ جس سے سنت کی اہمیت کا اندازہ بہ خوبی

لگایا جا سکتا ہے۔

۔ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے نبی کی اتباع کو اپنی محبت قرار دیا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ 2

: ہے

اے نبی ﷺ ) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو، ) "

خود اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ معاف کردے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان

(ہے۔ " ( سورہِ آلِ عمران، آیت نمبر31

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اتباعِ رسول ﷺ سے دو بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں

:

۔اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے۔1

۔گناہوں کی بخشش ہوتی ہے۔2

یقینا یہ دونوں بہت بڑے فائدے ہیں۔ جن سے نہ صرف دنیا سنور سکتی ہے، بلکہ

آخرت بھی بن جاتی ہے۔ایک سچے مسلمان کے لیے ان دو فائدوں سے بڑے کون سے

! فائدے ہو سکتے ہیں

۔ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔چنانچہ 3

: ارشاد ہوتا ہے

جو اس رسول کی اطاعت کرے، اس نے اللہ کی فرماں برداری کی اور جو فرماں "

" برداری نہ کرے تو ہم نے آپ کو کچھ ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔

(سورۃ النساء، آیت نمبر 80)

۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت کیوں 4
:قرار دیا۔ اس کا جواب بھی ہمیں قرآن مجید سے ہی ملتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے۔ کہ تمھارے ساتھی نے (یعنی نبی کریم ﷺ نے) "
نہ راہ گم کی ہے اور نہ وہ ٹیڑھی راہ پر ہیں۔ نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں۔
(وہ تو صرف وحی ہے، جو اتاری جاتی ہے۔ " (سورۃ النجم، آیت نمبر 1 تا 4

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا قول و فعل بھی احکامِ الٰہی سے مزین
ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اسی راہ پر ہیں، جس راہ پر انھیں اللہ تعالیٰ نے چلایا ہے
۔اسی طرح آپ ﷺ وہی بات ارشاد فرماتے ہیں، جو آپ ﷺ کی وحی کی جاتی ہے
: ۔ایک اور جگہ ارشاد ہے

جو کچھ میرے پاس (یعنی رسول اللہ ﷺ کے پاس) وحی آتی ہے، میں تو صرف اس کا "
(اتباع کرتا ہوں۔ " (سورۂ الانعام، آیت نمبر 50

رسول اللہ ﷺ کے اوصاف و اخلاق کے حوالے سے بھی قرآنِ مجید میں متعدد آیات

نازل ہوئیں ہیں۔ یہاں ان تمام آیات کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ چند آیات کا ترجمہ لکھنے کو کوشش کرتا ہوں۔

5۔ "اللہ کی رحمت کے باعث آپ ان پر نرم دل ہیں اور اگر آپ ترش رو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔ سو آپ ان سے در گزر کریں اور ان کے لیے استغفار کریں۔" (سورہِ آلِ عمران، آیت نمبر 159)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف نرم دل بنایا گیا تھا۔ نیز اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سخت مزاج لوگوں کے سامنے لاگ نہیں ٹکتے اور انھیں دل سے پسند نہیں کرتے۔ اس لیے ہمیں بھی اپنے نبی ﷺ کی طرح نرم مزاج ہونا چاہیے۔ تاکہ لوگ ہمیں پسند کریں۔

6۔ "اے اہلِ کتاب! یقیناً تمھارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے۔ جو تمھارے سامنے کتاب اللہ کی بکثرت ایسی باتیں ظاہر کر رہا ہے، جنھیں تم چھپا رہے تھے اور بہت سی باتوں سے در گزر کرتا ہے۔" (سورۃ المائدہ، آیت نمبر 15)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ عفو و در گزر سے کام لیتے تھے۔ عفو و در گزر کی سب سے بڑی مثال فتحِ مکہ کے موقع پر نظر آتی ہے۔ جب ہمارے نبی ﷺ نے اپنے تمام سابقہ دشمنوں کو بہ دل و جان معاف کر دیا تھا۔ کاش! آج ہم بھی ایسے ہوتے۔ کاش! ہم منتقم مزاج نہ ہوتے!

۔ " تمھارے پاس ایک ایسے پیغمبر (ﷺ) تشریف لائے ہیں، جن کو تمھاری 7
مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے ۔ جو تمھاری منفعت کے بڑے خواہش مند
رہتے ہیں ۔ ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق او مہربان ہیں ۔ " (سورہِ التوبہ،
(آیت نمبر128

۔ "پس اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائیں تو کیا آپ ان کے پیچھے اسی رنج میں 8
(اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے ۔" (سورۃ الکہف، آیت نمبر 6

طٰہٰ! ہم نے آپ پر یہ قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں "
(۔" (سورہِ طٰہٰ، آیت 1۔2

آپ (ﷺ) ان کے ایمان نہ لانے پر شاید آپ تو اپنی جان کھو دیں گے ۔" (سورۃ"
(الشعراء، آیت نمبر 2

ان تینوں آیات سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے پیارے پیغمبر ﷺ ایمان نہ لانے والوں کے بارے میں کتنے متفکر اور غم زدہ تھے ۔ خصوصاً تیسری آیت، جس میں اللہ تعالیٰ نے بڑے عجیب انداز میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی فکر مندی اور غمزدگی کی !! تصویر کھینچی ہے ۔ ہم کتنے رحیم و کریم پیغمبر کی امت میں سے ہیں

۔ "اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے ۔9

(سورۃ الانبیاء، آیت نمبر 107)"

اوپر دی گئی آیات پر اگر آپ غور کریں تو تقریبا ساری آیات رسول اللہ ﷺ کی صفت رحمت سے متعلق ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ میں صفتِ رحمت بدرجہِ اتم موجود تھی۔ آج کا مغضوب زمانہ متقاضی ہے کہ ہم صرف رسول اللہ ﷺ کی رحمت والی سنت پر ہی عمل پیرا ہو جائیں تو بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں ۔ ہر طرف آگ ہے، نفرتیں ہیں۔ محبت معدوم ہے۔ دل کینہ زدہ ہیں۔ انسانیت کا قتل ہو رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم اپنے پیارے نبی ﷺ کی صفتِ رحمت پر تادمِ مرگ عمل پیرا ہو جائیں۔

باتیں اور بھی بہت سی لکھنے کو ہیں۔ لیکن طوالت کا خوف ہے۔ سو اسی پر اکتفا ہے۔

## اگر کوئی محمد ﷺ سے جلتا ہے۔۔۔۔۔۔

بدھ کو پیرس سے شائع ہونے والے مزاحیہ سیاسی جریدے "چالی ہیبدو" کے دفتر پر حملہ ہوا۔ جس میں 10 صحافیوں اور دو پولیس اہلکاروں سمیت 12 یا 14 افراد ہلاک ہوئے۔ جب کہ 10 افراد زخمی ہوگئے۔ ہلاک شدگان میں چیف ایڈیٹر اسٹیفن کاربوئیر سمیت تین کارٹونسٹ بھی شامل ہیں۔ تفصیلات کے مطابق تین مسلح افراد صبح گیارہ یا ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میگزین کے دفتر میں داخل ہوئے اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ سکیورٹی گارڈز کی جوابی فائرنگ پر وہ ایک کار چھین کر بھاگنے لگے تو ایک راہگیر کچلا گیا۔ حملہ آوروں اور پولیس کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ تاہم وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ اس طرح وہ سکیورٹی گارڈز کے ساتھ ساتھ پولیس کو بھی چکمہ دینے میں کام یاب ہوگئے۔ پولیس کے مطابق عینی شاہدین نے بتایا کہ حملہ آور راکٹ لانچر اور کلاشنکوف سے لیس تھے۔ ان کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا: ہم نے پیغمبرِ اسلام کی شان میں گستاخی کا بدلہ لے لیا۔ یہ اللہ اکبر کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔ جائے وقوعہ پر موجود لوگوں کا کہنا تھا کہ انھوں نے نہایت اطمینان سے کاراوئی کی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ عام لوگ نہیں، بلکہ تربیت یافتہ لوگ تھے۔ "چالی ہیبڈو" کے دفتر پر ہونے والا یہ حملہ فرانس میں گذشتہ چار دہائیوں

میں ہونے والا سب سے بڑا حملہ تھا۔

فرانسیسی صدر فرانسوا اولاند حملے کے بعد فوراً جائے وقوعہ پر پہنچے اور حملے کو سفاکانہ کارروائی قرار دیا۔ امریکی صدر باراک اوباما، برطانوی وزیرِ اعظم ڈیوڈ کیمرون، جرمن چانسلر انجیلا مرکل، روسی صدر ولادیمیر پیوٹن، اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون، اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل، یورپی یونین اور یہاں تک کہ عرب لیگ، مصر کی جامعہ الازہر، فرانسیسی مسلم کونسل، ترکی، پاکستان اور دیگر نے بھی اس واقعے کی مذمت کی ہے۔ سب نے اپنے اپنے الفاظ میں اظہارِ افسوس کیا۔ ترکی نے واقعے کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ انقرہ ہر قسم کی دہشت گردی کی مذمت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا کہ یورپی یونین اسلام مخالفین کے خلاف بھی کارروائی کرے۔ جب کہ پاکستان کی دفتر خارجہ کی ترجمان تسنیم اسلم نے اپنی ہفتہ وار میڈیا بریفنگ میں کہا کہ پیرس میں میگزین کے دفتر پر ہونے والے حملے کی مذمت کرتے ہیں۔ لیکن توہینِ رسالت پر پاکستان کا موقف بہت واضح ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے مذاہب اور عقائد کا احترام کرنا چاہیے۔

یہ ابتدائی اطلاعات تھیں۔ بعد کی اطلاعات بتاتی ہیں کہ "چارلی ہیبڈو" پر ہونے والے حملے کے بعد سرچ آپریشن کیا گیا۔ جس میں 7 مشتبہ افراد کو حراست

میں لے لیا گیا اور میگزین کے دفتر پر حملہ کرنے والے تین افراد میں سے ایک نے گرفتاری دے دی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ میگزین کے دفتر پر حملہ کرنے والے تین لوگوں میں سے دو بھائی تھے۔ جن میں سے ایک کا نام شریف کوشی اور دوسرے کا نام سعید کوشی تھا۔ جب کہ تیسرے کا نام حمید مراد تھا۔ حمید مراد نے جب دیکھا کہ اس کا نام مشتبہ حملہ آور کے طور میڈیا پر آ رہا ہے تو اس نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ کل (بروز ہفتہ) کی اخبارات میں خبر چھپی کہ شریف اور سعید کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ یہ دونوں بھائی پیرس کے شمال مشرقی علاقے ڈامارٹن آن گوئل میں ایک پرنٹنگ پریس کے دفتر میں پناہ گزین تھے۔

چالی ہیبڈو" اور اس کا عملہ کچھ زیادہ اچھی شہرت کا حامل نہیں تھا۔ یہ ایک مزاحیہ" میگزین تھا۔ جس کی ابتدا 1970ء میں ہوئی۔ یہ میگزین سیاست دانوں وغیرہ کی تضحیک کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف مذاہب اور ان مذاہب کی مقدس و محترم شخصیات کو بھی مشقِ طنز و مزاح بناتا تھا۔ اس رسالے کا عملہ تین بار رسول اللہ ﷺ کی توہین کا مرتکب ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے اس رسالے میں 2006ء میں گستاخانہ خاکے شائع کیے گئے۔ جس پر پوری دنیا کے مسلمان سراپا احتجاج بن گئے، لیکن میگزین کے عملے پر اس کا کچھ خاص اثر نہیں ہوا۔ پھر اس رسالے میں نومبر 2011ء اور ستمبر 2012ء میں دوبارہ گستاخانہ خاکے شائع

ہوئے۔

اہلِ مغرب "آزدیِ اظہارِ رائے" کے نام پر اکثر توہینِ رسالت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ اس طرح کی حرکتوں سے پوری دنیا کا امن برباد کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے، جب کسی کے عقیدے، مذہب، مقدس و محترم ہستیوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا جائے گا تو خود بہ خود بے امنی کی فضا پیدا ہو جائے گی اور اس بد امنی کی اصل وجہ کچھ اور نہیں، بلکہ "آزادیِ اظہارِ رائے" کا غلط استعمال ہو گا۔ جب تک دوسروں کے عقائد، مذہب اور مقدس و محترم ہستیوں کو "آزدیِ اظہارِ رائے" کے نشتر سے نشانہ بنایا جاتا رہے گا، اس وقت تک اس طرح کے واقعات ہوتے رہیں گے۔ چاہے اس پر جتنا شور و غوغا کیا جائے۔

ہر چیز کی کچھ حدود و قیود ہوتی ہیں۔ اگر وہ چیز حدود و قیود کی سرحدوں کو توڑ دے تو نقصان ہوتا ہے۔ اہلِ مغرب کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی آزادی خیالی اور آزادیِ اظہارِ رائے کے زعم اور شوق کی کچھ حدود تعین کر لیں۔ تاکہ تصادم سے بچا جا سکے۔ ورنہ تصادم سے کیا کیا ہوتا ہے، سب جانتے ہیں۔

پیرس کے مزاحیہ سیاسی جریدے پر ہونے والے حملے کو کسی طرح مستحسن نہیں کہا

جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ مغرب کے ساتھ ساتھ کچھ مسلمان ملکوں اور تنظیموں نے بھی اس حملے کی بھرپور مذمت کی ہے۔ لیکن اس کے محرکات اور اسباب و علل کے بارے میں سوچا جائے تو یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ پیرس کے سیاسی جریدے کے عملے نے اپنی موت کو خود آواز دی ہے۔ اگر اس رسالے کا عملہ توہینِ رسالت کا مرتکب نہ ہوتا یا ایسی حرکت کرکے معذرت کرلیتا تو آج اس جریدے کا سارا عملہ زندہ اور سلامت ہوتا ۔ نہ جانے اہلِ مغرب کو تصادم اور نفرت کی فضا پیدا کرنے میں کیا مزہ آتا ہے۔

مغربی دنیا کے بہت سے مفکرین ایسے ہیں، جنھوں نے پیغمبرِ اسلام ﷺ کی تعریف و توصیف کی ہے۔ آزاد خیال مغربی لوگ کم سے کم انھی سے کچھ سیکھ لیں۔ کئی کتابیں ہیں، جن کا موضوع پیغمبرِ اسلام ﷺ کے ضمن میں "غیروں کا اعتراف" ہے۔ فی الحال میرے پاس اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں ہے۔ ورنہ آج کی اپنی پوری تحریر ہی اس موضوع پر قربان کر دیتا۔ انشاء اللہ جب بھی مجھے اس موضوع پر کوئی مستند کتاب دست یاب ہوگی تو اپنے قارئین کو ضرور مخصوص کروں گا۔ فی الوقت صرف رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نپولین بونا پارٹ کے خیالات زیرِ غور لایئے :

محمد ﷺ کی تعلیمات سے پندرہ برس کی عمر میں عرب کے لوگوں نے جھوٹے خداؤں" کی پرستش سے توبہ کر لی۔ یہ حیرت انگیز کارنامہ ان کی تعلیمات پر عمل کرنے

" کے سبب ہوا۔

اس ضمن میں میں نے نپولین بوناپارٹ کے الفاظ اس لیے تحریر کیے، کیوں کہ اس بادشاہ کا تعلق اسی فرانس سے تھا، جس کے ایک مزاحیہ جریدے کے عملے نے پیغمبرِ اسلام ﷺ کی شان میں ایک بار نہیں، تین بار گستاخی کی۔

اقوامِ متحدہ کو چاہیے کہ وہ ایسے اصول و ضوابط وضع کرے، جس سے "آزادیِ اظہار رائے" کی حدود کا تعین کیا جاسکے۔تاکہ "آزادیِ اظہارِ رائے" کے مبلغین اور داعی بھی دوسرے عام انسانوں کی طرح دوسروں کے عقائد، مذاہب اور مقدس و محترم ہستیوں کے بارے میں ایسی گستاخیاں نہ کریں، جس سے پوری دنیا کا امن برباد ہو۔ کیوں کہ اس دنیا کو پرامن بنانے کے لیے عقائد و مذاہب اور ان سے منسلک محترم ہستیوں کا احترام ناگزیر امر ہے۔

آخر میں رسول اللہ ﷺ کی شان میں جرمن شاعر گوئٹے کی ایک نظم، جو مجھ بہت پسند آئی، پڑھیے:

اگر کوئی اس بات سے جلتا ہے
کہ اللہ محمد ﷺ کا حامی کیوں ہے
تو اسے چاہیے کہ رسی کا ایک ٹکڑا لے
اس کا ایک سرا اپنے اونچے ستون سے باندھے

اور اس کا دوسرا سرا اپنے گلے میں باندھے
اور اس سے لٹک جائے
اور حاسدوں کا اس سے بہتر انجام کوئی نہیں
نوٹ: اس نظم کو ڈاکٹر ناظر حسین نے ترجمہ کیا ہے، اور روزنامہ ایکسپریس،بروز (
جمعہ کو شایع ہوئی۔ )

## چارلی ہیبڈو کی نئی جسارت

فرانسیسی مزاحیہ جریدے کا عملہ اتنا بڑا نقصان اٹھانے کے باوجود باز نہ آیا۔ ایک بار پھر اس نے گستاخانہ خاکے شائع کر دیے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ گستاخانہ خاکوں پر مبنی یہ جریدہ 7 لاکھ کی تعداد میں شائع ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس جریدے کے عملے نے 50 لاکھ کاپیاں شائع کرنے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ عام جریدہ اگرچہ صرف فرانسیسی زبان میں ہوتا تھا، لیکن گستاخانہ خاکوں پر مشتمل یہ جریدہ انگریزی اور عربی سمیت 16 زبانوں میں شائع کیا جائے گا، جو دنیا بھر کے 25 ممالک میں فروخت ہوگا ۔

یہ ہے چارلی ہیبڈو کا نیا "کارنامہ" ، جس پر پوری مسلم دنیا سراپا احتجاج ہے۔ گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کے بعد تقریباً پوری مسلم دنیا غم اور غصے میں مبتلا ہے۔ مسلم دنیا کے تمام بڑے بڑے ادارے اپنے اپنے انداز میں ان گستاخانہ خاکوں کی مذمت کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ احتجاجات کا سلسلہ بھی جاری و ساری ہے۔ پاکستان میں قومی اسمبلی میں گستاخانہ خاکوں کے بارے میں مذمتی قرارداد منظور ہو گئی ہے۔ اس قرارداد میں اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) اور یورپی یونین سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس طرح کے مواد

کی اشاعت کے خلاف کار روائی کرے۔ العربیہ کے مطابق : "قرارداد میں مزید کہا گیا ہے کہ ''یہ توہین آمیز کارٹونز تہذیبوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی ایک سازش ہیں۔ چارلی ہیبڈو میں توہین آمیز خاکوں کی دوبارہ اشاعت اظہار رائے کی آزادی کے منافی ہے اور دین کا مضحکہ اڑانے کے لیے شائع کیا جانے والا مواد قابل مذمت ہے''۔ قومی اسمبلی میں موجود ارکان نے اس قرارداد کی اتفاق رائے سے منظوری دی ہے۔" وزیرِ اعظم نے اس ضمن میں کہا ہے کہ عالمی برادری اشتعال انگیز مواد کی حوصلہ شکنی کرے۔ کہا جا رہا ہے کہ اس مذمتی قرار داد کی کاپیاں ملک میں موجود تمام غیر ملکی سفارت خانوں، اقوامِ متحدہ، او آئی سی اور فورن مشنز کو بھیجی جائیں گی۔

اس کے ساتھ ساتھ ارکان اسمبلی نے گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کے خلاف احتجاجی مارچ بھی کیا۔ جس کی قیادت وزیرِ مذہبی امور اور ڈپٹی اسپیکر نے کی۔ اس موقع پر سردار یوسف نے مختصر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ توہین آمیز خاکوں کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ یہ اظہارِ رائے کا غلط استعمال ہے۔ عالمِ اسلام کے تمام ممالک اپنی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔

اگرچہ مسلمانوں کے دانشور، علماء اور دیگر لوگ اپنے اپنے انداز میں مذمتی بیان دے رہے ہیں، لیکن جس بیان نے سب سے زیادہ لوگوں کی توجہ اپنی جانب

کھینچی ہے، وہ پوپ فرانسس کا آزادیِ اظہارِ رائے کے بارے میں بیان ہے۔ کیتھولک عیسائیوں کے مذہبی پیشوا پوپ فرانسس نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہہ دیا کہ آزادیِ رائے کی بھی کچھ حدیں ہوتی ہیں۔ دوسروں کے مذہب کی توہین نہیں کی جا سکتی۔ روزنامہ ڈان کی افیشل ویب سائٹ کے مطابق : "سری لنکا سے فلپائن جاتے ہوئے ہوائی جہاز کے اندر صحافیوں سے بات کرتے ہوئے پوپ فرانسس کا کہنا تھا کہ ہر مذہب کی ایک عزت اور تکریم ہوتی ہے اور آزادی اظہار رائے کی بھی کچھ حدیں متعین ہیں۔ انہوں نے کہا کہ 'آپ کسی کو بھی اشتعال نہیں دلا سکتے، آپ کسی کے ایمان کی توہین نہیں کر سکتے۔' انہوں نے مثال دی تھی کہ 'اگر میرا بہترین دوست ڈاکٹر گیسپری میری ماں کے بارے میں برے جملہ کہے تو وہ جواباً مکے کی توقع کر سکتا ہے'۔
"

حیرت انگیز طور پر امریکا اور اسٹریلیا نے چارلی ہیبڈو کے عملے کی طرف سے گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کے عمل کی حمایت کی ہے۔ امریکا کے محکمہ خارجہ نے چارلی ہیبڈو کی طرف سے شائع ہونے والے گستاخانہ خاکوں کی مذمت یا تنقید کرنے سے سراسر انکار کر دیا ہے۔ امریکا کی محکمۂ خارجہ کی ترجمان میری ہرف نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہہ دیا : کسی کی ذاتی رائے سے قطعِ نظر ہم چارلی ہیبڈو کے اس طرح کی چیزوں کو شایع" کرنے کے حق کی حمایت کرتے ہیں۔" اسٹریلوی وزیرِ اعظم ٹونی ایبٹ نے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ اس کارٹون کی

اشاعت کی حمایت کرتے ہیں۔ انھوں نے اس حمایت کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ اس کارٹون میں معاف کرنے کی اہمیت اجاگر کی گئ ہے۔ اسٹریلوی وزیرِ اعظم نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ اگرچہ مذکورہ جریدے کی ہر اشاعت کو پسند نہیں کرتے۔ البتہ اس کارٹون کی اشاعت کی حمایت ضرور کرتے ہیں۔

یورپ میں کلیسا کا عمل دخل بہت محدود ہے۔ چارلی ہیبڈو کا عملہ پوپ فرانسس، جو بلا شبہہ عیسائیت کی دنیا میں ایک اتھارٹی رکھتے ہیں، کی بات کو یکسر نہیں مانے گا۔ البتہ امریکا اور اسٹریلیا کی حمایت اس عملے کے جذبات کو ضرور جلا بخشے گا۔ اس لیے وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ اور اس طرح کی سرگرمیاں جاری رکھے گا۔ جس سے امنِ عالم کے تہہ و بالا ہونے کا اندیشہ ہے۔ حالاں کہ اسے یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ہر انسان کے عقائد کا احترام اس کا بنیادی حق ہوتا ہے۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کے عقائد کا احترام ہر دم ملحوظ رکھا جائے۔ ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شخصیت کے ساتھ اس کا جذباتی لگاؤ ہے، اس کے بارے میں کوئی غلط بات نہ کرے۔

چارلی ہیبڈو کے دفتر پر حملہ ہوا تو پیرس میں ایک ملین مارچ ہوا۔ جس میں 40 ممالک کے مسلم، عیسائی اور یہودی رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس ریلی میں فرانسیسی صدر فرانسوا اولانڈ، برطانوی وزیرِ اعظم ڈیوڈ کیمرون، جرمن

چانسلر انجیلا مرکل، اسرائیلی وزیرِ اعظم بنیامین نیتن یاہو، اور حیرت انگیز طور پر فلسطینی صدر محمود عباس، اردن کے شاہ عبد اللہ دوئم اور ترک وزیرِ اعظم احمد داؤد دوغلو نے شرکت کی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مراکش کے وزیرِ خارجہ صلاح الدین میزور نے اس مارچ میں اس وجہ سے شرکت نہیں کی کہ ریلی کے کچھ شرکاء نے گستاخانہ خاکوں کے پوسٹرز اٹھا رکھے تھے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ مسلم دنیا کے تمام حکمران بھی ایک ایسی ریلی کا انعقاد کریں۔ جس میں اقوامِ عالم سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ تمام پیغمبرانِ کرام علیہم السلام اور تمام مذاہب کے احترام کو یقینی بنانے کے لیے سخت سے سخت قوانین بنائے جائیں۔ تاکہ کوئی بھی آزادیِ اظہارِ رائے کے نام پر گستاخی کا مرتکب نہ ہو اور تہذیبوں کے تصادم سے بچا جا سکے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ پیغام بھی دیا جائے کہ مسلمان، چاہے جیسے بھی ہوں، اپنے آقا علیہ السلام کی شان میں گستاخی کا ایک بول، کجا گستاخانہ خاکے، بھی برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس لیے مسلمانوں کے جذبات کے احترام کو یقینی بنایا جائے۔

میرے خیال میں مسلم دنیا کے حکمرانوں کے لیے اس طرح کی ایک ریلی کا انعقاد ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا اور ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمان یورپی اقوام سے یہ مطالبہ بہ آسانی منوا سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے اتحاد شرط ہے۔

# شاہ عبد اللہ بھی رخصت ہوئے

یہ خبر پوری مسلم دنیا میں غم اور افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ خادمِ حرمین الشریفین اور سعودی عرب کے فرماں روا شاہ عبد اللہ 90 برس کی عمر میں طویل علالت کے بعد جمعرات اور جمعۃ المبارک کی درمیانی شب خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ ایک عرصے سے پھیپھڑوں کے عارضے میں مبتلا تھے۔ پھیپھڑوں کے انفیکشن کے باعث انھیں پچھلے کئی دنوں سے مصنوعی طریقے سے سانس دیا جا رہا تھا۔ان کی نمازِ جنازہ پرنس ترکی بن عبد اللہ جامع مسجد میں ادا کی گئی۔جس میں کئی مسلم ممالک کی اعلیٰ شخصیات نے شرکت کی۔ پاکستان کے وزیرِ اعظم اور ترک صدر رجب طیب اردوان نے بھی نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ سعودی عرب کی تمام مساجد میں بھی شاہ کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی ۔دنیا بھر کے مسلم و غیر مسلم رہنماؤں نے شاہ کی وفات پر گہرے رنج اور افسوس کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ اسرائیلی سابق صدر شمعون پیریز بھی کہہ اٹھے کہ شاہ عبد اللہ کی موت مشرقِ وسطیٰ کے امن کے لیے حقیقی نقصان ہے، جس کی تلافی نا ممکن ہے۔ شاہ عبد اللہ کی وفات سے پوری مسلم دنیا کی فضا سوگ وار ہے۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر پوری مسلم دنیا غم میں ڈوب گئی۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب میں

تین ، مصر میں سات ، پاکستان میں ایک اور اردن میں چالیس روزہ سوگ کا اعلان کیا گیا۔ معلوم نہیں ، نئے سعودی فرماں روا شاہ سلمان بن عبد العزیز کس حد تک اپنے ملک کی باگ ڈور سنبھالنے اور مسلم امہ کے مسائل کے حل میں کام یاب ہو سکیں گے ۔ کیوں کہ اس وقت پوری مسلم دنیا اضطراب کی شکار ہے۔ سعودی عرب سے مسلم دنیا کا قلبی ، مذہبی اور روحانی لگاؤ ہے۔اس لیے سعودی عرب کے نئے بادشاہ پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مسلم دنیا کے لیے شاہ عبداللہ سے زیادہ موثر کردار ادا کریں۔

شاہ عبداللہ یکم اگست 1924ء کو ریاض میں پیدا ہوئے ۔ابتدائی تعلیم شاہی محل میں حاصل کی ۔ کچھ سال صحرائی قبائل کے ساتھ رہے ، جنھوں نے عرب کی مخصوص اقدار وروایات سے انھیں متعارف کرایا۔ 1961ء میں مکہ مکرمہ کے میئر بنے ۔ 1962 ء میں سعودی نیشنل گارڈ کے کمانڈر منتخب ہوئے ۔ 1975 ء میں نائب وزیرِ اعظم دوم مقرر ہوئے۔ 1982 ء میں شاہ فہد کی طرف سے ولی عہد نامزد کیے گئے ۔ آخر کار شاہ فہد کی وفات کے بعد یکم اگست 2005 ء کو سعودی عرب کے چھٹے بادشاہ بن گئے ۔ ان کو مذہب ، تاریخ اور عرب ثقافت کے موضوعات سے خاص دلچسپی تھی ۔ وہ شاہ عبدالعزیز السعود کے 37 بیٹوں میں سے 13 ویں نمبر پر تھے ۔بدو نسل سے تعلق رکھنے والی ان کی والدہ فہدہ ، شاہ عبد العزیز کی 16 بیویوں میں سے 8 ویں بیوی تھیں ۔ شاہ عبد اللہ 18 ارب ڈالر کے اثاثوں کے

ساتھ دنیا کے چوتھے امیر ترین سربراہِ مملکت تھے۔

شاہ عبداللہ کی کئی پالیسیوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے کارناموں کی ایک خاصی طویل فہرست ہے۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سعودی عرب کو بہارِ عرب کی لپیٹ میں آنے سے بچا لیا۔اگر وہ باغیوں کے سلسلے میں ذرا سی بھی نرمی برتتے تو آج سعودی عرب کا بھی وہی حال ہوتا، جو ان دنوں بہارِ عرب کی لپیٹ میں آنے والے ملکوں کا ہے۔ جہاں روز روز باغیوں کی شورشیں بپا ہوتی ہیں اور کوئی حکم ران سنبھل کر حکومت نہیں کر پاتا۔یہ شاہ کی سخت پالیسیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کا ملک بہارِ عرب کے اثرات سے بالکل بچا رہا۔

2005ء میں اقتدار میں آنے کے بعد انھوں نے دہشت گردی کے خلاف مؤثر اقدامات اٹھائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے انسدادِ دہشت گردی کا عالمی مرکز قائم کیا۔ 2005 ئے۔ میں انھوں نے دہشت گردی کے خلاف ریاض میں عالمی کانفرنس بلائی اور خود اس کی میزبانی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سعودی عرب میں دہشت گردوں کی فنڈنگ روکنے اور غیر قانونی طور پر اسلحہ اور بیرون رقم منتقلی کے خلاف بھی ایک ادارہ قائم کیا۔ ان کے دور میں دہشت گردوں کی ہر قسم کی مالی معاونت کرنے والوں کو کڑی سزائیں دی گئیں۔

شاہ عبداللہ نے اپنے دور میں سعودی عرب کی ترقی پر خاص توجہ مرکوز رکھی ۔ تعلیم ، صحت ، انفرااسٹرکچر اور معیشت کے شعبوں میں کئی بڑے منصوبے شروع کیے ۔ انھوں نے معاشی ترقی کے لیے چار بڑے شہر قائم کروائے ۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے کئی ادارے قائم کروائے ۔ جن میں شاہ عبداللہ یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی اور شہزادی نورہ بنت عبدالرحمان یونی ورسٹی برائے خواتین قابلِ ذکر ہیں ۔مذہب سے گہرا لگاؤ ہونے کی وجہ سے انھوں نے حرمین پاک کی توسیع کے منصوبے شروع کیے ۔انھوں نے سعودی عدالتی نظام کی تاریخی تشکیلِ نو کی منظوری دی ۔

قیامِ پاکستان کے بعد سے ہی سعودی عرب کے ساتھ پاکستان کے گہرے اور مخلصانہ تعلقات ہیں ۔ 1998 ء میں جب پاکستان ایٹمی طاقت بنا تو یہ سعودی عرب ہی تھا ، جس نے کھل کر پاکستان کی حمایت کی تھی ۔ نہ صرف حمایت کی تھی ، بلکہ پاکستان کی کمزور معیشت کو سہارا دینے کے لیے مالی مدد کے ساتھ ساتھ کئی ہزار ٹن مفت تیل فراہم کیا تھا۔ واضح رہے کہ اس وقت اقوامِ مغرب نے اپنی روایات برقرار رکھتے ہوئے پاکستان پر معاشی پابندیاں لگادی تھیں ۔ سعودی عرب نے ان کی پرواہ نہیں کی اور پاکستان کی امداد جاری رکھی ۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت شاہ فہد کی علالت کے باعث امورِ مملکت

شاہ عبداللہ چلا رہے تھے۔ 98ء کے دھماکوں کے بعد شاہ عبداللہ نے 8 ملکوں کے دورے کیے تھے۔ جس کی ابتدا واشنگٹن سے ہوئی تو انتہا پاکستان پر ہوئی۔

(اللہ تعالٰی مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین

## پھر ایک سانحۂ خوں چکاں

پھر ایک سانحۂ خوں چکاں ہو گیا۔ پھر ایک بار معصوم انسانیت کا قتلِ عام کیا گیا۔ نمازِ جمعہ کا احترام بھی ملحوظ نہ رکھا گیا۔ اب بھی اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اُن کا تعلق مذہب سے ہے تو خام خیالی ہے۔ابھی تک پشاور کا سانحہ ذہن سے محو نہیں ہوا۔ ایک اور سانحے نے مغموم کر دیا۔ اس دفعہ اُن کا نشانہ سندھ دھرتی کا ایک گم نام علاقہ بنا۔ علاقے کا نام لکھی در ہے اور ضلع شکار پور۔ امام صاحب نے، جو اب اس دنیا میں نہیں رہے، خطبۂ جمعہ ختم کیا ہی تھا کہ ایک زور دار دھماکا ہوا اور امام بارگاہ کی چھت زمین بوس ہو گئی۔ یہ کیسے لوگ ہیں، جنھیں دوسروں کی عبادت خانوں کا بھی کچھ پاس نہیں ۔کیا زمانہ آگیا کہ لوگ عبادت خانوں میں بھی خود کو محفوظ نہیں سمجھتے۔ ایک مسجد میں جاتے ہوئے میری تین بار چیکنگ کی گئی۔ یہاں تک کہ میرا سامان بھی چیک کیا گیا۔مجھے بہت رنج ہوا۔ اس بات پر نہیں کہ میری چیکنگ کی گئی۔ بلکہ اس بات پر کہ اب عبادت خانے بھی محفوظ نہیں رہے۔ یہاں بھی انسانیت کش واردات ہوتی ہیں ۔اب امن و سکون کہاں ڈھونڈا جائے۔رب تعالی رحم کرے۔ نہ جانے میرے پیارے وطن کو کس کی نظر لگ گئی۔ وگرنہ اس کی گلیاں، اس کے چوراہے، اس کے شہر ،اس کے علاقے ایسے تو نہ تھے۔

افراد شہید اور 50 سے زائد زخمی ہو گئے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں، دھماکا خود کش تھا۔ 60 کچھ کہتے ہیں، ریموٹ کنٹرول کے ذریعے کیا گیا۔ بہر حال۔۔۔ جیسا بھی تھا۔ ہمیں تو ان کا ملال ہے، جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ جو زخمی ہو گئے۔ جن کا نقصان ہوا۔ جاں بحق ہونے والوں میں کوئی کسی بہن کا بھائی ہوگا۔ کوئی پورے خاندان کا واحد کفیل ہوگا ۔ کوئی کسی کا معصوم بچہ ہوگا۔ایک خبر بتاتی ہے کہ ایک ماں نے 4 بچوں کو تیار کرکے بھیجا۔ مگر واپس کوئی نہیں آیا۔ ان کی لاشوں کے ٹکڑے گھر لائے گئے تو ماں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کی لاشوں کو شناخت کرکے اکٹھا کیا۔ ان کا کیا بنے گا، جنھوں نے بڑی خوشی اور شادمانی کے عالم میں مرحومین کو نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے رخصت کیا ہوگا، لیکن پھر ان کی ساری شادمانی غم واندوہ اور سوگ واری میں بدل گئی ہوگی۔ جب انھیں معلوم ہوا ہوگا کہ وہ شہید کر دیے گئے ہیں۔ محض اس قصور پر کہ نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے گئے تھے۔ ان کے لیے وزیرِ اعلیٰ کی 20، 20 لاکھ کی امداد کی کیا حیثیت ہوگی، جو اپنے عزیزوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے گئے۔ یہ 20 لاکھ ان کے غموں کو کسی طرح کم نہیں کر سکتے۔

حالات کشیدہ ہیں۔ سبھی جانتے ہیں۔ حفظِ ماتقدم ناگزیر ہے۔ مگر یہ کیا

کہ نمازِ جمعہ کے وقت صرف ایک پولیس اہل کار تعینات تھا اور وہ بھی موقع پر موجود نہیں تھا۔ پولیس ریکارڈ بتاتا ہے کہ دو پولیس اہل کاروں کو تعینات کیا گیا۔ اب اس بات پر تحقیق کی جارہی ہے کہ یہ دو موقع پر موجود کیوں نہیں تھے۔ ایسی حساس صورت حال میں صرف دو پولیس اہلکاروں کی تعیناتی اور پھر ان کا موقع پر موجود نہ ہونا کسی لطیفے سے کم نہیں صوبائی حکومت کا فرض بنتا ہے کہ عبادت خانوں کی سکیورٹی یقینی بنائے تاکہ اس قسم کے سانحاتِ خون چکاں سے بچا جاسکے۔ پہلے سے ہی اس بات کا خیال رکھا جاتا تو آج میں کسی مثبت موضوع پر طبع آزمائی کر رہا ہوتا۔

اُن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ جید علماء کرام کا حالیہ بیانیہ اس حقیقت کی توثیق کرتا ہے ۔ایک خبر کے مطابق وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سربراہ مولانا سلیم اللہ خان، مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر (مہتمم جامعہ بنوری ٹاؤن)، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی و دیگر علماء نے اپنے مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ ہم اس واقعے کی پر زور مذمت کرتے ہیں۔ وطنِ عزیز میں تمام شہریوں کے جان و مال کا تحفظ ان کا بنیادی حق ہے۔ لہٰذا مظلومانہ قتل، چاہے سنی کا ہو یا شیعہ کا، مسلمان کا ہو یا غیر مسلم کا، قرآن کریم کی رو سے پوری انسانیت کا قتل ہے۔ ہم حکومت، تمام سیاسی جماعتوں انجمنوں اور سول سوسائٹی کے دردمند افراد سے اپیل کرتے ہیں

کہ وہ دشمنوں کی اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے متحد ہوں اور ملک میں فرقہ وارانہ یا لسانی فسادات پھیلانے کی ہر کوشش کو اپنے اتحاد سے ناکام بنائیں۔ دیگر علماء نے بھی اس بابت اظہارِ خیال کیا۔ ان سب کی باتوں کا لبِ لباب یہی نکلتا ہے کہ اسلام جیسا پر امن دین، ایسا دین جس نے چودہ سو سال قبل جانی دشمنوں کا بھائی بھائی بنا دیا تھا، اس قسم کے وحشیانہ عمل کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اسلام پر امن مذہب ہے۔

لبریز خوں سے ہو گئی ہر ایک سجدہ گاہ
ہر آنکھ اشک بار تو نکلی ہے دل سے آہ
کرتے ہیں اس طرح سے ادا ہم نمازِ عشق
بولے شکار پور کے لاشے خدا گوا

(تشنہ بریلوی)

# آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر

5 فروری آیا اور چلا گیا۔ یہ ہر سال آتا ہے۔ اہلیانِ پاکستان کو سوگ وار کرتا ہے۔ پھر چلا جاتا ہے۔ اس دن پاکستان میں عام تعطیل ہوتی ہے۔ کشمیری بھائیوں سے اظہارِ یک جہتی کے لیے جلوس نکلتے ہیں۔ "کشمیر بنے گا پاکستان" کے نعرے بازی ہوتی ہے۔ ایوانِ بالا و زیریں میں قراردادیں منظور ہوتی ہیں۔ سیاست دان ایوانوں میں، عوام سڑکوں پر جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ زبانِ قال و حال سے کہا جاتا ہے: "ہم کشمیریوں کے ساتھ ہیں۔" جارحانہ بیان بازی ہوتی ہے۔ یہ دن 1990ء سے منایا جا رہا ہے۔ میں نے بھی جب سے ہوش سنبھالا، اس دن کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ یہی کچھ دیکھ رہا ہوں، جو اوپر بیان کیا۔

لیکن پھر 5 فروری شام ڈھلتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کشمیر جوں کا توں رہتا ہے۔ اسے آزادی نہیں ملتی۔ اس کے زخم مندمل نہیں ہوتے۔ یہ خطۂ جنت نظیر ذرا نہیں بدلتا۔ یہاں کی اداس صبحیں اداس ہی رہتی ہیں۔ یہاں کی بے سکون شامیں بے سکون ہی رہتی ہیں۔ ہم بھی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ سیاست دانوں کے جذبات ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ عوام روزگار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جو ایک دن پہلے کشمیری بھائیوں کے ساتھ ہوتے ہیں، اب دوسرے کاموں میں مصروف ہو جاتے

ہیں۔ ہم سال میں ایک دن منا کر احسان کی انتہا کر دیتے ہیں۔ بالآخر ہم فقط گفتار کے غازی ہی ٹھہرتے ہیں۔ تغیرات کے اس عالمِ رنگ و بو میں کشمیر کے حق میں ایک تغیر بھی وقوع پذیر نہیں ہوتا۔

مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ہمارے اختیار میں ہے ہی کیا ! سوائے جارح بیان بازی، جذباتی نعروں اور پر جوش تقریروں کے۔ مسئلہِ کشمیر ایک ایسا گھاؤ ہے، جو 67 سالوں سے نہیں بھر رہا۔ کشمیر کے مظلوم عوام پچھلے 67 سالوں سے آزادی سے محروم ہیں۔ انھیں حقِ خود ارادیت نہیں مل رہا۔ مسئلہِ فلسطین کے بعد مسئلہِ کشمیر امت کا دوسرا بڑا مسئلہ ہے، جو کئی سالوں سے تشنہِ تکمیل ہے۔ جب میں کشمیر اور فلسطین کے بارے میں سوچتا ہوں تو اس "امتِ مرحومہ" کی بے چارگی پر آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔ اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔ خجالت سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ یہ بے چارگی، اگر تعمق سے دیکھا جائے تو، ہم نے اپنے آپ پر خود مسلط کی ہے۔ ہم نے اپنی توانائیاں، اپنی قوم کو شکست دینے کے لیے خرچ کی ہیں۔ جب ہم اپنے آپ سے نبرد آزما ہوتے ہیں، تو دشمن ہمیں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہوتا ہے اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی۔

یہ دورِ جدید ہے۔ یہ چھوٹا سا سیارہ عالمی گاؤں بن چکا ہے۔ شعور بڑھتا جا

رہا ہے۔ ظلم کیا ہے، سب جانتے ہیں۔ حقوق کیا ہیں، سب کو معلوم ہے۔ کسی پر ظلم کیا جائے، کسی کے حقوق غصب کیے جائیں، اس دورِ نمود و نمائش میں سب کو آن کی آن پتا پڑ جاتا ہے۔ اب دورِ غلامی مفقود ہو چکا ہے۔ بچہ بچہ اپنے حقوق کے بارے میں آگاہ ہے اور آواز بلند کر سکتا ہے۔ اب کسی کو دبا کر رکھنا عبث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکاٹ لینڈ کے باسیوں نے حقِ خود ارادیت مانگا تو مل گیا۔ حالاں کہ برطانیہ قوی ہیکل ہے۔ چاہتا تو اسکاٹ لینڈ کی ایک نہ مانتا اسے دبانا کیا مشکل تھا۔ لیکن برطانیہ نے ایسا نہیں کیا ۔ کیوں کہ ہر ایک آزادی کا حق رکھتا ہے۔ اسکاٹ لینڈ میں خوشی خوشی ریفرنڈم ہوا۔ کشمیر میں ظلم کی انتہا کر دی گئی ہے۔ یہی وہ ظلم ہے، جس پر کشمیری عوام سب سے زیادہ سراپا احتجاج ہیں۔ اسی ظلم پر ہم ایسے آشفتہ سروں کے دل جلتے ہیں۔ ہمیں 14 صدیاں قبل بھائی بھائی بنا دیا گیا ہے۔ ہمیں تنبیہ کی گئی کہ مسلمان ایک جسم کے مانند ہوتے ہیں ۔ اگر جسم کے ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو پورے جسم میں درد کی ٹیسیں محسوس ہوتی ہیں ۔ گو ہم اس تنبیہ کو بھول گئے، لیکن اس کے کچھ کچھ اثرات اب بھی روح کو اس وقت گھائل کر دیتے ہیں، جب کسی مظلوم مسلمان کی داستانِ الم کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ یہ ظلم، چاہے کشمیر، جنت نظیر کی پر بہار وادیوں میں ہو، چاہے انبیاءؑ کی سرزمین

فلسطین میں ہو۔ چاہے افغانستان کی بگرام جیل میں ہو، یا گوانتا ناموبے ایسے بدنام زمانہ عقوبت خانے میں ہو۔یا کسی اور مقام پر ہو۔ یہ ظلم اپنے کریں تب بھی دل جلتا ہے۔ غیر کریں، تب بھی دل خون کے آنسو روتا ہے۔ یاد رکھیے، ظلم کی کالی گھٹاؤں سے احتجاج جنم لیتا ہے۔ شمیم شال، جو انٹرنیشنل مسلم ویمن کی نمائندہ برائے کشمیر ہیں، کہتی ہیں: "آدھی بیوہ کا لفظ پوری دنیا میں صرف کشمیری خواتین کے ساتھ جڑا ہے۔ بھارتی فوج نے بہت سی کشمیری خواتین کے شوہروں کو گھروں سے اٹھا کر غائب کر دیا۔ یہ خواتین اب بھی شوہروں کا انتظار کر رہی ہیں۔ کشمیری عوام اور خواتین جو تکلیفیں سہتی رہی ہیں، انھیں کبھی ریکارڈ پر نہیں لایا گیا ہے۔ بھارت کسی کو کشمیر میں آنے کی اجازت نہیں دے رہا۔ شمیم شال نے اور بھی بہت سی ظلم کی داستانیں بتائیں۔ جسے لکھنے کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ آسیہ اندرابی، جو "دخترانِ ملت" کی سربراہ ہیں، اپنی داستانِ الم بیان کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ میرے شوہر ہی کو دیکھ لیں۔ میرے ساتھ ء میں گرفتار ہوئے تھے۔ 22 واں سال شروع ہو رہا ہے۔ جیل میں رہتے ہوئے 93 میں کبھی کبھی ان سے ملنے جاتی ہوں۔ لیکن اپنے آپ کو مکمل ڈھانپ کر۔ انھوں نے 22 سال سے میرا چہرہ نہیں دیکھا۔ میرا بیٹا جو جیل میں میرے ساتھ تھا، اب اکیسویں سال میں ہے۔ غور کریں بیٹے باپ کے زندہ ہوتے ہوئے اس کی محبت سے محروم ہوں تو ان کی شخصیت کیسی ہو گی۔

آخر میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار پر اپنی تحریر کی انتہا کرتا ہوں۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مجبورِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بے دردیِ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانہ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

# دو منفی خبریں

پھر وہی خون ۔ پھر وہی لہو زدہ تحریر ۔ سمجھ نہیں آتا، کب تک ایسی تحریریں لکھنے کی نوبت آتی رہے گی ۔ ذہن ماؤف ہے ۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عنقا ہے ۔ بے ربط سے جملے دماغ پر مسلط ہیں ۔ پس وہی زیرِ قلم ہیں ۔ پشاور ایک بار پھر خون میں نہلا دیا گیا ہے ۔ آرمی پبلک اسکول کے بعد دوسرا بڑا حملہ، جو اس شہر میں وقوع پزیر ہوا ۔ ہر ہفتے سوچتا ہوں، کسی مثبت موضوع پر طبع آزمائی کروں ۔ مگر کیوں کر؟ جہاں پشاور ایسے سانحات منہ چڑا رہے ہوں، وہاں کیسے مثبت موضوعات پر لکھا جا سکتا ہے؟ اب کے ان کا نقطۂِ ہدف پشاور کے علاقے حیات آباد کی امامیہ مسجد تھا ۔ 20 افراد جاں بحق ہوئے ۔ 67 زخمی ہوئے ۔ وہ ایف سی کی وردیوں میں ملبوس تھے ۔ پہلے دستی بم پھینکے گئے ۔ نمازی بہادر تھے ۔ ان سے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی ۔ ردِ عمل میں ان میں سے دو نے خود کو دھماکے سے اڑا دیا ۔ پھر ان کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ۔ جس سے نا قابلِ تلافی نقصان ہوا ۔ 20 یا 21 اس جہاں سدھارے ۔ 67 زخمی ہوئے ۔ دھماکے کے وقت مسجد میں 150 افراد موجود تھے ۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کی تعداد 6 سے 7 تھی ۔

پے در پے 2 اندوہ گیں حملوں کے بعد ایک بات تو واضح ہو گئی کہ وطنِ عزیز میں دہشت گردی جوں کی توں بر قرار ہے۔ اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ نیشنل ایکشن پلان کا کوئی ثمرہ نظر نہیں آیا۔ ہم وہیں ہیں، جہاں تھے۔ شکار پور کا سانحہ، پشاور کا سانحہ، کراچی کے نجی اسکولوں پر دستی بم کے حملے، تعلیمی اداروں کو دھمکی آمیز خط، شکار پر کے اسکول میں نامعلوم افراد کا کفن پھینک کر فرار ہونا۔۔۔۔ یہ تمام واقعات کس بات کے غماز ہیں؟ یہ واقعات یہی ظاہر کرتے ہیں کہ دہشت گردی جوں کی توں بر قرار ہے۔ ہم اس عفریت کو قابو نہیں کر پائے ہیں۔ ہماری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی ہے۔ سب کچھ اسی طرح جاری و ساری ہے۔ ہمارا دشمن ہم پر واقعی حاوی ہو چکا ہے ۔شاید ہم سے کہیں غلطی ہو رہی ہے۔ جس کا ادراک ہمیں ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے کئی دشمن ہیں، لیکن ہم صرف ایک دشمن کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور دوسرا دشمن مصروفِ عمل ہے۔ وہ بغیر کوئی ذک اٹھائے اپنا کام کرتا جارہا ہے۔اور ہم بے خبر ہیں۔ ورنہ ہم تو بڑی سخت کوش قوم ہیں۔ دہشت گردی ایسے کئی عفریتوں کو کچل سکتے ہیں۔ لیکن غلطی کا ادراک ہو، تب ناں! اب پتا نہیں کیا ہوگا، یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوں۔ میرا رب رحم کرے۔

سانحۂ پشاور کے بعد ایک اور خبر نے بہت پریشان کیا۔ یہ خبر امریکا کی ہے۔ معلوم ہوا کہ امریکی ریاست نارتھ کیرلینا کے شہر چیپل ہل میں ایک شخص نے 3 مسلمان طلباء کو شہید کردیا۔ العربیہ کے مطابق : "پولیس نے مقتولین کے نام دیاح شیڈی برکات (عمر 23 سال) اس کی بیوی یسور محمد ابو صلحہ (عمر 21 سال) اور اس کی بہن رزان محمد ابو صلحہ (عمر 19 سال) بتائے ہیں۔ امریکی میڈیا کی رپورٹس کے مطابق انھیں قتل کرنے والے مسلح شخص کی شناخت کریگ اسٹیفن ہکس کے نام سے کی گئی ہے۔ اس کی عمر 46 سال ہے اور اس نے خود کو پولیس کے حوالے کردیا ہے۔"

دنیا بھر کے لوگوں نے اس واقعے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ لوگ اسے نفرت پر مبنی جرم قرار دیتے ہیں۔ تاہم مقامی پولیس "پارکنگ تنازعہ" پر بضد ہے۔ گو مبینہ شخص کے فیس بک پیج پر مذہب مخالف نفرت آمیز پوسٹس موجود ہیں۔ جو اس شخص کے "امن پسند" ہونے کی سب سے بڑی حجت ہے۔ پھر امریکی چینل سی این این کی آفیشل ویب سائٹ پر موجود یوسر ابو صلحہ کے وہ الفاظ، جو اس نے اپنے والد سے مبینہ شخص کے بارے میں کہے تھے، ملحوظ ہوں :

'Daddy, I think he hates us for who we are and how we look.'

(ابو! مجھے لگتا ہے، یہ شخص ہم سے نفرت کرتا ہے۔ اس وجہ سے کہ ہم کون ہیں اور کس طرح نظر آتے ہیں؟)

اف ! کتنا درد ہے اس جملے میں ۔ اب بھی اگر اس اندوہ ناک واقعے کو "پارکنگ تنازعہ کہا جائے تو عجب ہے ۔اس واقعے کا سب سے اندوہ ناک پہلو یہ ہے کہ برکات اور یوسر " ابوصلحہ کی شادی کو صرف دو مہینے ہی ہوئے تھے ۔

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ بے شک دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ دہشت گرد کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ عیسائی بھی ہو سکتا ہے، ہندو بھی ہو سکتا ہے۔ بدھ مت بھی ہو سکتا ہے۔ تامل ٹائیگر بھی ہو سکتا ہے۔ صرف مسلمانوں کو دہشت گرد کہنا اور ان کی دہشت گردی کا پرچار کرنا ستم ظریفی ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ آئے روز مسلمان طرح طرح کی دہشت گردی کا نشانہ بنتے ہیں ۔ اس ضمن میں برما کے روہنگیا مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یا پھر فلسطین میں اسرائیل کے ڈھائے گئے حالیہ مظالم کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یا پھر رمضان کے عین مہینے میں ایک ہندو تنظیم کے ارکان کی جانب سے مسلمان روزہ دار کو زبردستی کھانے کھلانے کا واقعہ دیکھا جا سکتا ہے۔ یا پھر فرانس حکومت کی جانب سے مسلمان عورتوں پر نقاب کی پابندی کے فیصلے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ٹھیک ہے، کسی کو قتل کرنا دہشت گردی ہے۔ لیکن کسی کی مذہبی آزادی کو سلب کرنا بھی تو دہشت گردی ہے۔

مانا کہ داعش ایک دہشت گرد تنظیم ہے۔ مانا کہ بوکو حرام ، الشباب ، ٹی ٹی

پی اور اس نوعیت کی دیگر تنظیمیں دہشت گرد ہیں، مگر شکوہ اس بات کا ہے کہ وہ تنظیمیں، جو دنیا بھر میں مسلمانوں کے لیے دردِ سر بنی ہوئی ہیں، انھیں عالمی سطح پر دہشت گرد کیوں نہیں کہا جاتا۔ ان کے افعالِ بد کا پرچار کیوں نہیں کیا جاتا۔ مغربی میڈیا پر جس طرح داعش اور اس نوعیت کی دیگر تنظیموں کی مذمت کی جاتی ہے، اسی طرح مسلمانوں کے لیے عرصہِ دراز تنگ کرنے والوں کے بارے میں کیوں خبریں نہیں چلتیں۔ دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ حق یہ ہے کہ دہشت گردی جو بھی کرے اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔،

دنیا بھر میں مسلمان دہشت گردی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس دہشت گردی کی بھی پوری پوری کوریج ہونی چاہیے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ بحرین نیوز ایجنسی کی آفیشل ویب سائٹ کے مطابق برما کے وزیرِ اعظم تھین سین نے مسلم مخالف مظاہروں کی وجہ سے روہنجیا مسلمانوں سے آنے والے ریفرنڈم میں رائے شماری کا حق واپس لے لیا ہے۔ برما میں ایک ملین سے زائد مسلمان رہتے ہیں۔ مگر وہاں کی حکومت انھیں رائے شماری کا حق نہیں دینا چاہتی۔ ایک اور رپورٹ بتاتی ہے کہ مغرب اور بالخصوص امریکا میں مسلمانوں کے خلاف انتہا پسندی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال کرسچین اسرائیل نامی عیسائی فرقہ ہے، جس کے بانی جان ہیگ نے کھل کر اسرائیل کی حمایت کرنے کی مہم چلا رکھی ہے۔ اس شخص

نے ایبولا وائرس کو خدا کا عذاب قرار دیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ عذاب اس لیے نازل ہوا، کیوں کہ امریکا نے اسرائیل کی کھل کر مدد نہیں کی۔

نہ جانے عالمی سطح پر کب ایسے لوگوں کے خلاف بولا اور لکھا جائے گا؟؟

# امریکا اور مسلم دنیا

امریکی صدر نے دنیا کو باور کرایا کہ مغرب اور اسلام میں جنگ کو تاثر سفید جھوٹ ہے۔ دنیا پر تشدد انتہا پسندی اور دہشت گردی کے ناسور کے خلاف متحد ہے۔ بین الاقوامی برادری دہشت گردوں کے خلاف لڑائی میں غیر متزلزل عزم کا اظہار کرے۔ جہادی یہ غلط تاثر پیش کر رہے ہیں کہ یہ تہذیبوں کے درمیان لڑائی ہے۔ مگر یہ بات کھلی دروغ گوئی ہے کہ مغرب اسلام کے خلاف صف آراء ہے۔ بغیر کسی مذہبی تفریق کے یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ اس تاثر کو مسترد کریں۔ ہم اسلام کے خلاف لڑائی نہیں کر رہے، ہم ان عناصر سے لڑ رہے ہیں، جنھوں نے اسلام کو مسخ کیا ہے۔
اس میں شک نہیں کہ اس وقت عالمی طاقتیں داعش اور اس نوعیت کی دیگر تنظیموں سے سخت خطرہ محسوس کر رہی ہیں۔ امریکی صدر نے درج بالا باتیں واشنگٹن میں جاری سہ روزہ دہشت گردی کے انسداد کے سربراہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ اس اجلاس میں 60 ملکوں کے نمائندگان نے شرکت کی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی دنیا جہادی تنظیموں سے سخت خطرہ محسوس کر رہی ہیں۔ امریکی صدر نے جو باتیں کی ہیں، بلاشبہ لائقِ تحسین ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تقریبا تمام

جہادی تنظیمیں امریکا کی اپنی پیداوار ہیں۔ 11/9 سے پہلے ہم صرف القاعدہ سے واقف تھے۔ 11/9 کے بعد آج کئی جہادی تنظیمیں معرضِ وجود میں آچکی ہیں۔ جن میں سب سے نمایاں داعش ہے۔ جس سے امریکا اور اس کے اتحادیوں کو سخت خطرہ ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکا پوری دنیا پر بالعموم اور مسلم دنیا پر بالخصوص اپنی مکمل بالا دستی چاہتا ہے۔ لیکن مسلم دنیا میں اس کی بالادستی کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہی جہادی تنظیمیں ہیں۔امریکا اس بات کا ادراک رکھتا ہے کہ جب تک ان جہادی تنظیموں کی بیخ کنی نہیں کی جائے گی، وہ اپنے عزائم کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ کئی جہادی تنظیمیں خود مسلمانوں کے لیے خطرہ ہیں، لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ امریکا نے سب سے پہلے اپنی خارجہ پالیسیوں سے ان تنظیموں کو جنم دیا، پھر ان کو مسلمانوں کے مدِ مقابل کر دیا۔ داعش، جو اس وقت عالمی شہرت کی حامل تنظیم ہے، اس کا آغاز عراق سے ہوا۔جہاں امریکا نے محض ایک خوف کی وجہ سے چار لاکھ اکسٹھ ہزار لوگوں کی جان لے لی۔ اتنے سارے لوگوں کی خون سے مزاحمت جنم نہیں لے گی تو اور کیا ہوگا۔

امریکی صدر نے اس اجلاس میں یہ بھی بتایا کہ شیعہ سنی اختلافات صرف اسی

صورت ختم ہوں گے، جب بڑی طاقتیں بات چیت کریں گی۔ فرقہ واریت انتہا پسندی کو فروغ دیتی ہے۔ امریکی صدر نے یہ بڑے کام کی بات کی۔ میں ان کے اس بیان کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں کہ اسلامی دنیا میں شیعہ سنی اختلافات کو بڑھانے میں امریکا کا اہم کردار ہے۔ 2003 ء میں جب امریکا اور برطانیہ نے عراق کو مسخر کرنے کے لیے وہاں فوجیں بھیجیں تو اس وقت صدام حسین صدر تھے۔ صدام حسین سنی تھے۔ مگر امریکا نے نوری المالکی کو عراق کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ جو شیعہ ہیں۔ یہیں سے عراق میں فرقہ واریت کی آگ بھڑکی اور داعش جیسی تنظیم نے جنم لیا۔

اصل چیز جنگ نہیں ہوتی، جنگ کے بعد نظم و نسق کو سنبھلنا ہوتا ہے۔ 11/9 کے بعد امریکا نے دو مسلم ممالک پر چڑھائی کی۔ امریکا ان دونوں ممالک پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ مگر امریکا جنگ کے بعد کی صورت حال کا ادراک نہیں رکھتا تھا۔ اب ان دونوں ملکوں کی صورت حال یہ ہے کہ اب ان دونوں ملکوں کی معیشت کا دارو مدار لگ بھگ امریکا پر ہے۔ اس کے علاوہ اس ملک میں پائی جانے والی مزاحمتی تنظیمیں مسلسل امریکا کے لیے دردِ سر بنی ہوئی ہیں۔ ہم حقائق دیکھتے ہوئے بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ امریکا جنگ کے بعد آنے والی مسائل سے صحیح طور پر نمٹنے میں کام یاب نہیں ہو سکا۔

امریکا ایک طرف مسلم دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے، مگر دوسری طرف ان عوامل کی حمایت کرتا ہے، جو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہیں۔ امریکا شروع سے اسرائیل کی حمایت اور فلسطین کی مذمت کرتا ہوا آیا ہے۔ امریکا حماس کو "دہشت گرد" تنظیم بھی قرار دے چکا ہے۔ اقوامِ متحدہ میں امریکا اسرائیل کے خلاف آنے والی ہر قرار داد کو ویٹو کر دیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب یوٹیوب پر "انوسنٹ آف مسلمز" اپ لوڈ ہوئی تھی تو اس وقت پوری مسلم دنیا سراپا احتجاج بن گئی تھی۔ امریکا نے اس وقت بڑی سرد مہری سے مسلم دنیا کو جواب دیا تھا کہ اس فلم کے اپ لوڈ ہونے پر ہمیں افسوس ہے، لیکن ہم اسے ہٹا نہیں سکتے۔ آزادیِ اظہارِ رائے سب کا حق ہے۔ اسی طرح حال ہی میں چارلی ہیبڈو نے گستاخانہ جسارت کی تو اسے امریکا اور برطانیہ کو آشیر باد حاصل تھا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم دنیا میں امریکا آمروں کی حمایت کرتا ہے۔ اس ضمن میں مصر کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اگر امریکا واقعی مسلم دنیا پر اپنا تسلط چاہتا ہے تو اسے اپنی پالیسیاں تبدیل کرنی ہوں گی۔

## تعلیم اور ہم

کسی بھی قوم میں تعلیم ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقوامِ مغرب کی ترقی کی سب سے بڑی وجہ تعلیم ہے۔ تعلیم شعور و آگہی بخشتی ہے۔ یہ تعلیم ہی ہے، جس کے بل بوتے پر آج انسان کی رسائی چاند تک ہو چکی ہے۔انسان اپنے سیارے یعنی زمین کو تو مسخر کر ہی چکا ہے، لیکن اب دوسرے سیاروں پر بھی کمندیں ڈالنے کو ہے۔ میں تعلیم اور علم کے مابین فرق کا قائل نہیں ہوں۔ دونوں کو ایک ہی چیز سمجھتا ہوں ۔ تعلیم یا علم ہر بچے کا بنیادی حق ہے، جو اسے ضرور ملنا چاہیے۔

مگر اپنے ملک پاکستان میں تعلیم کی حالتِ زار دیکھ کر نہایت افسوس ہوتا ہے۔ 26 فروری 2015 ء (بروز جمعرات) کو روز نامہ جنگ کراچی میں سندھ کے گرنمنٹ اسکولوں کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی۔ میرے خیال میں یہ خبر ہر اس شخص کو متفکر اور پریشان کردے گی، جو پاکستان کی تعلیمی صورتِ حال پر نظر عمیق رکھتا ہے۔ اس خبر کی چیدہ چیدہ باتیں یہ ہیں۔

بین الاقوامی طور پر یو این او نے تعلیم کا کم از کم معیار قومی مجموعی آمدنی کا چار فی صد رکھا ہے۔جب کہ ہماری ملک میں تعلیم کے شعبے کے لیے

قومی مجموعی آمدنی کا دو فی صد مختص کیا جاتا ہے۔
سندھ میں تعلیمی بجٹ کے لیے 134 ارب روپے سالانہ مختص ہیں۔ جس میں سے 125 ارب روپے تنخواہوں کی مد میں چلے جاتے ہیں۔ بقیہ سات فی صد کا بڑا حصہ کرپشن کی نذر اور دیگر اخراجات پر خرچ ہوتے ہیں۔
ایک حالیہ تعلیمی سیمینار کے مطابق ) سندھ میں 49500 اسکولوں میں سے 44500) پرائمری 4900 مڈل اور سیکنڈری اسکول ہیں۔ جن میں سے 22 ہزار اسکولوں میں پینے کا پانی اور 24 ہزار اسکولوں میں بجلی کی سہولت موجود نہیں۔ 18 ہزار اسکول غیر فعال ہیں۔ جن میں اکثریت گوداموں اور وڈیروں کی اوطاقوں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔
حکومتی اعداد و شمار کے مطابق سندھ میں خواندگی کا تناسب شہری علاقوں میں 55 فی صد اور دیہی (علاقوں ) میں 42 فی صد ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سندھ بھر میں 11 ملین بچوں میں سے صرف 4 ملین بچے اسکولوں میں داخل ہیں۔ پانچ سے سولہ سال تک کے 39 فی صد بچے گورنمنٹ اسکولوں میں جاتے ہیں۔ پہلی سے میٹرک تک نہ پہنچ پانے والے بچوں کا تناسب 67 فی صد ہے۔ 66 فی صد بچے اپنی مادری زبان میں دس جملے نہیں لکھ سکتے۔ 78 فی صد کو سادہ جمع ضرب نہیں آتی۔ 75 فی صد انگریزی کا ایک جملہ نہیں لکھ سکتے۔ جب کہ 62 فی صد اسکول نہیں

جاتے۔

سندھ میں اساتذہ کی تعدادایک لاکھ 46 ہزار ہے۔ جن میں سے پچاس ہزار اسکول نہیں جاتے۔۔۔۔۔80 فی صد استاد انگلش نہیں لکھ سکتے۔ 36 فی صد کو انگریزی، سندھی اور ریاضی نہیں آتی۔

سندھ میں ضلع ٹھٹھہ تعلیمی لحاظ سے ملک کے 144 اضلاع میں سے 140 نمبر پر اور سندھ کے 23 اضلاع میں سے 22ویں نمبر پر ہے۔

یہ ہے صوبہ سندھ کے گورنمنٹ اسکولوں کی تعلیمی صورت حال۔ گورنمنٹ اسکولوں کی نا گفتہ بہ تعلیمی و انتظامی صورت حال کے باعث والدین اپنے بچوں کو وہاں نہیں بھیجتے۔ لیکن جب وہ پرائیویٹ اسکولوں میں بھیجتے ہیں تو وہاں بھاری بھر فیسیں، مہنگے کورسز اور کئی قسم کے دیگر اخراجات ان کی کمر توڑ دیتے ہیں۔اس طرح تعلیم تک صرف ان لوگوں کی رسائی ممکن ہوتی ہے۔ جو امیر لوگ ہوتے ہیں۔ غریب کا بچہ نہ گورنمنٹ اسکول میں پڑھ سکتا ہے۔ نہ پرائیویٹ اسکول میں۔ نتیجتاً وہ تعلیم سے محروم رہتا ہے۔ کیوں کہ گورنمنٹ اسکول میں پڑھائی نہیں ہوتی اور پرائیویٹ اسکول تک رسائی نہیں ہوتی۔یہی وجہ ہے کہ غریب کا بچہ پڑھائی سے زیادہ کام کو ترجیح دیتا ہے

پاکستان کا آئین بچوں کو تعلیم دینا ریاست کا فرض سمجھتا ہے۔ لیکن پھر ہمارے تعلیمی اداروں کی حالت ناگفتہ بہ کیوں ہے۔ اگر تعلیم بنیادی حق ہے تو اس سے پہلو تہی کرنا کوئی اچھا عمل نہیں ہے۔ اس سے غفلت برتنا نئی نسل کو اندھیروں میں دھکیلنے کے مساوی ہے۔ ہم جدید دنیا میں بغیر تعلیم کے ترقی نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر گورنمنٹ اسکولوں کی حالت ٹھیک ہو جائے تو ہماری شرح خواندگی خود بہ خود بڑھ جائے گی۔ مگر ایسا کرنے کے لیے کئی قسم کے سخت قوانین بنانے ہوں گے۔ جو اساتذہ اسکولوں میں پڑھانے کے لیے نہیں آتے، ان سے جان چھڑانی ہوگی۔ اچھی اور معیاری تعلیم کے لیے قابل اور اہل لوگوں کو آگے لانا ہوگا۔ اس کے علاوہ نقل کا سدباب بھی از حد ضروری ہے۔ نقل وہ دیمک ہے، جو ہماری تعلیم کو اندر ہی اندر سے چاٹ رہا ہے۔ بات پھر وہی آجاتی ہے۔ اگر اساتذہ بچوں کو صحیح طور پر پڑھائیں گے۔ نقل کا سدِباب بھی خود بہ خود ہو جائے گا۔

پوری دنیا تعلیم کی حقیقت اور اس کی اہمیت سے باخبر ہو چکی ہے۔ پوری دنیا اس حقیقت کا ادراک رکھتی ہے کہ تعلیم کے بغیر جدید دنیا کی جدیدیت سے فائدہ اٹھانا عبث ہے۔ تعلیم نہ صرف انسان میں عقل اور شعور کا اضافہ کرتی ہے ،

بلکہ یہ کسی بھی ملک کی معاشی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خبروں کی مشہور ویب سائٹ ڈی ڈبلیو کے مطابق :

"ایشیائی ریاستیں بھارت اور چین واضح کرتی ہیں کہ تعلیم کا ایک معاشی فائدہ بھی ہے۔ پچاس کی دہائی میں جنوبی کوریا کا آج کی افریقی ریاستوں سے بھی برا حال تھا۔ مردوں عورتوں کے لیے مساوی تعلیم کے علاوہ شعبہ صحت میں سرمایہ کاری نے وہاں کی اقتصادی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ چین کی تیز رفتار ترقی، تعلیم کے شعبے میں کی جانے والی اصلاحات کے مرہون منت ہے۔ پچیس برس سے کم عمر ہر نوجوان کے لیے تعلیم ایک بنیادی موضوع ہے، جو نوجوانوں کی زندگی کا تعین کرتا ہے۔ چینی حکومت اس بات کی بھی واضح مثال ہے کہ وہاں مزید آزادی دیے بغیر تعلیم پر زور دیا جارہا ہے لیکن اس طرح کا نظام اسی وقت تک چلتا ہے، جب تک اکثریت اس کے پیچھے کھڑی ہے۔
"

اگر ہمیں جدید دنیا میں ترقی حاصل کرنی ہے تو ہمیں تعلیم پر خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ بہ صورتِ دیگر ہم جہاں ہیں، وہیں رہیں گے۔

# کچھ باتیں کتابوں کی

یہ بات نہایت تشویش ناک ہے کہ عموما پوری قوم اور خصوصا ہماری نوجوان نسل کتابوں سے خطرناک حد تک دور ہوتی جارہی ہے۔ گو زمانے نے بہت ترقی کر لی ہے ۔جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دوددورہ ہے۔ دنیا سکڑ کر عالمی گاؤں بن چکی ہے۔ مگر میری دانست میں کتابیں اس وقت بھی علم کا سب سے بڑا منبع ہیں۔ گویا کتابوں سے دوری علم سے دوری کے مساوی ہے۔ ہمارے طلبہ بھی کتابوں سے بھاگتے ہیں۔وہ صرف اپنی نصابی کتابوں تک محدود رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی معلومات جمود کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یہ کتابوں سے دوری کا ہی شاخسانہ ہے کہ ہمارے طلبہ وطالبات میں تحقیق و تجسس اور شعور وآگہی جیسی حیاتِ جاوداں بخشنے والی چیزیں پروان نہیں چڑھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے آج کل کے طلبہ وطالبات علمی میدان میں کوئی بڑا کارِ نمایاں سرانجام نہیں دے پاتے۔

یہ کوئی سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ میں نے ایک لائبریری میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی " قواعدِ اردو" دیکھی۔ اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو کرتا ہی چلا گیا۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ تھی کہ جہاں یہ اردو کے بنیادی قواعد سے متعلق مستند معلومات پہنچاتی تھی، وہاں یہ علم عروض کے بارے میں

بھی مفید معلومات کی حامل تھی۔ مولوی عبد الحق کا اسلوب بیاں بھی بہت خوب ہے۔ شاید ان کی تحریر کا کچھ سحر بھی شامل تھا کہ میں اس کتاب کا فریفتہ ہوگیا۔ اس کتاب کے مطالعے سے مجھ پر پہلی بار یہ راز کھلا کے شاعری کے پیچھے بھی دراصل کچھ اس طرح کو کوڈنگ کام کر رہی ہوتی ہے، جس طرح ایک ویب سائٹ کے پیچھے ایچ ٹی ایم ایل، جاوا اسکرپٹ وغیرہ جیسی کوڈنگ کام کر رہی ہوتی ہے۔ بہر حال۔۔۔۔ میں نے لائبریری میں جاکر اس کتاب سے خوب استفادہ کیا۔ مگر میں اس کتاب کو مستقلا اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ تاکہ وقت آنے پر کام آسکے۔ میں اس کتاب کو خریدنے کے لیے اردو بازار گیا۔ تین چار دوکانوں سے پوچھا، مگر نہیں ملی۔ پھر ایک دوکان سے پوچھا۔ دوکان دار نے میری وضع قطع کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اندازہ لگا لیا کہ میں اسکول کا طالبِ علم ہوں۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ لہٰذا اس نے اردو گرامر کی کوئی کتاب، جو میرے خیال میں پرائیویٹ اسکول کے استاد چھٹی سے آٹھویں جماعت تک کا اردو گرامر تیار کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، تھما دی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر میں نے وہ کتاب اس کے حوالے کردی اور چلتا بنا۔ ظاہر ہے، دوکان دار وہی کتابیں رکھیں گے، جن کی مانگ ہوگی۔ کتابوں کی بازاروں میں نصابی کتابوں کی مانگ ہے، اس لیے وہی بکتی ہیں۔ باقی کتابیں کوئی خریدتا نہیں۔ اس لیے دوکان دار رکھتے بھی نہیں ہیں۔ اگر "قواعدِ اردو" ایسی کتابیں کوئی دوکان دار خرید بھی لے تو اسے نقصان ہی اٹھانا

پڑتا ہے۔ اسے اس نوعیت کی کتابیں سستے داموں بیچنی پڑتی ہیں۔ یوں لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا " عقلمند" دوکاندار ایسی کتابیں خریدنے کی " غلطی " کم کم ہی کرتا ہے جو دانش کا حقیقی منبع ہوتی ہیں۔ یہ بات بھی تشویش ناک ہے۔ ہم ایسی کتابوں سے ، دور ہو رہے ہیں ، جو معلومات کا اصل اور حقیقی منبع ہیں۔ گو یہ کتاب مجھے بعد میں مل گئی۔ مگر جتنی مشکل سے ملی ، وہ مجھے پتا ہے۔

اردو پوائنٹ ڈاٹ کام کی ایک خبر کے مطابق: "کتابوں سے دوری کی وجہ سے نوجوان نسل اپنے اسلامی ، سیاسی ، مذہبی کلچر اور ادب سے بھی غیر مانوس ہونے لگی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق قدرت اللہ شہاب ، احمد ندیم قاسمی ، خواجہ حسن نظامی ، ابوالکلام آزاد ، چراغ حسن حسرت ، میر تقی میر ، فیض احمد فیض ، ناصر کاظمی ، واصف علی واصف کی کتابوں کے دوکانوں پر ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ مگر ان کو پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق نوجوان نسل کی صرف 19 فی صد تعداد ہی کتابیں پڑھنے کا شوق رکھتی ہے۔ 60 فی صد سے زائد نسل انٹرنیٹ ، فیس بک اور ٹوئٹر کی جانب مائل ہے۔ "

ہماری نئی نسل ادب سے تو دور ہے ہی ، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی ، سائنسی ، فلسفیانہ اور اس نوعیت کی دیگر کتابیں پڑھنے کی بھی کچھ زیادہ

عادی نہیں ہے۔ مجھے کندن لال کندن کی "ارمغانِ عروض" اور "پس تحریر
مصنف کا نام یاد نہیں ) کوڑیوں کے بھاؤ ملی۔ کیوں کہ یہ کتاب کوئی نہیں خرید رہا ) "
تھا۔ "ارمغان عروض" علمِ عروض پر ایک جامع کتاب ہے۔ شعراء حضرات اس کتاب
کی افدیت کے بارے میں بہ خوبی آگاہ ہوں گے۔ جب کہ " پسِ تحریر" میں اردو کے
کچھ ادیبوں کا انٹرویو تھا۔ جن میں ممتاز مفتی اور احمد ندیم قاسمی کا نام قابلِ زکر ہے۔ یہ
بھی بڑی معلوماتی کتاب تھی۔ جس میں مصنف نے ایک منفرد طریقے سے اردو کے چند
ادیبوں سے سوالات پوچھے تھے۔

اسد مفتی روز نامہ جنگ کے کالم نگار ہیں۔ عموما وہ عالمی موضوعات پر لکھتے ہیں۔ میں
ان کی تحریریں شوق سے پڑھتا ہوں۔ 11 فروری 2015 ئے ء کے اپنے کالم "کتاب
مر نہیں سکتی" میں رقم طراز ہیں :

چند روز قبل کا واقعہ ہے، میں نے اپنے چھوٹے بیٹے آدم کو مطالعہ کی اہمیت سمجھاتے "
ہوئے ٹیلی وژن دیکھنے سے پرہیز کی تلقین کرتے ہوئے کہا، "کتابیں پڑھنے کے لیے
"تمھیں وقت کب ملتا ہوگا ؟

"بیٹے نے کہا، "کتابیں پڑھنے سے کیا فائدہ پایا؟

اس سے آپ کا ذہن وسیع ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔"

آدم کا جواب تھا، "وہی ساری چیزیں ٹی وی پر بھی ہیں، چناں چہ ذہن ٹی وی دیکھنے سے بھی وسیع ہوتا ہے۔"

"میں کہتا ہوں، "کتابوں میں تمھیں بے شمار سائنسی معلومات اور ان کا احوال ملے گا۔"

"بیٹا کہتا ہے، " سائنس ٹی وی پر بھی ہے۔"

میں پھر کہتا ہوں، کتابوں میں ادب ہے، سیاست ہے، صحافت ہے۔ ثقافت اور تہذیبی سرمایا ہے۔"

آدم جواب دیتا ہے، " ایسی بہت سی چیزیں اور پروگرام جن کا تعلق ادب، صحافت، ثقافت، سیاست، تفریح اور تہذیب و تمدن سے ہے، ٹیلی وژن پر بھی موجود ہیں۔"

بیٹے کو سمجھاتے ہوئے جب تنگ آجاتا ہوں تو کہتا ہوں، "اس کے باوجود تمھیں کتابیں پڑھنی ہوں گی۔"

وہ کیوں؟" بیٹے نے پوچھا۔"

"اس لیے کہ ہم کتابیں لکھتے ہیں۔"

باپ کی زبانی یہ دلیل سنتے ہی بیٹا کہتا ہے، " جب ہم کتابیں پڑھتے ہی نہیں ہیں تو آپ کتابیں لکھتے کیوں ہیں؟"

جدید دنیا کے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم چلنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ہمیں کتابوں سے اپنا ناطہ جوڑنا ہوگا۔

## اردو کا مسئلہ

پاکستانی آئین کی دفعہ 251 کے مطابق:

(1) پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور یوم آغاز سے پندرہ برس کے اندر اندر اس کو سرکاری و دیگر اغراض کے لیے استعمال کرنے کے انتظامات کیے جائیں گے۔

(2) انگریزی زبان اس وقت تک سرکاری اغراض کے لیے استعمال کی جاسکے گی، جب تک کہ اس کے اردو سے تبدیل کرنے کے انتظامات نہ ہو جائیں۔

(3) قومی زبان کی حیثیت کو متاثر کیے بغیر، کوئی صوبائی اسمبلی قانون کے ذریعے قومی زبان کے علاوہ کسی صوبائی زبان کی تعلیم، ترقی اور اس کے استعمال کے لیے اقدامات تجویز کرسکے گی۔

یہ ہے قومی زبان سے متعلق پاکستانی آئین۔ جس سے قومی زبان کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک میں قومی زبان انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ مگر بد قسمتی سے ہمارے ملک میں قومی زبان کو وہ اہمیت نہیں دی گئی ہے، جس کی وہ مستحق ہے۔ گو آئین میں پندرہ برس کے اندر اندر یعنی 1988ء تک سرکاری و دیگر اغراض کے لیے سرکاری زبان کے استعمال کا عزم کیا گیا ہے

مگر اب تک اس بات کو عملی جامہ نہیں پہنایا گیا ہے۔ ہمارے ہاں اب بھی سرکاری و، دیگر اغراض کے لیے انگریزی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہر جگہ اردو پر انگریزی زبان کو ترجیح دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہماری دستاویزات پر، ہمارے کاغذات پر، ہماری تعلیمی اسناد پر۔۔۔ گویا ہر جگہ انگریزی نظر آتی ہے۔ اردو سے اس حد تک اغماض ہمارے حق میں کسی صورت بہتر نہیں ہے۔

اردو سے اس حد تک اغماض برتنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہماری نئی نسل بڑی تیزی سے اپنے ادب سے دور ہوتی جارہی ہے۔ دسویں جماعت کا کوئی طالبِ علم علامہ اقبال کے کسی ایک شعر کی تشریح بھی بہ مشکل کر پاتا ہے۔ ہمارے ادب اور شعر و شاعری میں بہت سا علمی ذخیرہ موجود ہے۔ اس میں ہمارے مفکرین، ادبا، شعرا وغیرہ کی دانشوری پنہاں ہے۔ مگر اردو کی کمزوری کے باعث ہمارے طلبہ و طالبات اس مستفید نہیں ہو سکتے۔ یوں وہ اپنے اس ادبی و علمی ذخیرے کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں جس کے لیے ہمارے ادبا، شعرا اور مفکرین نے بڑی محنت اور تگ و دو کی۔ کسی بھی، قوم کے لیے یہ صورت حال لائقِ تعریف نہیں ہے۔ جس کا ازالہ ہر صورت ہونا چاہیے

۔

پھر یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ہم اپنی زبان کو علمی بنانے کے بجائے انگریزی میں سائنس، فلسفے، منطق، ریاضی وغیرہ ایسے دقیق علوم پڑھنے اور

پڑھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔جس سے ہمارے طلبہ و طالبات کے ساتھ ساتھ ہمارے اساتذہ بھی بڑی تیزی سے اردو سے نابلد ہوتے جارہے ہیں۔ ہم نے اپنی زبان کو علمی بنانے کے لیے ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ جس سے ہماری اپنی زبان صحیح طور پر پروان نہیں چڑھ سکی اور انگریزی کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں مسلم دنیا میں بہت زیادہ علمی ترقی ہوئی۔ ہارون الرشید نے بغداد میں بیت الحکمت نامی ایک ادارے کی بنیاد رکھی تھی۔جس میں دنیا بھر سے علمی کتابیں منگوائی جاتی تھیں۔ پھر ان کتابوں کے ترجمے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہارون الرشید نے بیت الحکمت کے دارالترجمہ کے لیے وقت کے بہترین اور مستند علما و مترجمین کا انتظام کر رکھا تھا۔ جنھیں بھاری بھر قسم کا مشاہرہ دیا جاتا تھا۔تاکہ وہ معاشی قیودات سے آزاد ہو کر اس علمی کام میں اپنی ساری توانائیاں صرف کریں۔ بھلے ہارون الرشید نے یونانی، رومی، سنسکرت، فارسی وغیرہ کی، جو اس وقت علمی زبانیں سمجھی جاتی تھیں، ترویج و اشاعت کے بجائے اپنی زبان کو علمی بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ اگر ایسے اقدامات ہماری حکومتیں اور متعلقہ حکام بھی کرنے لگیں تو ہماری زبان کے ساتھ ساتھ ہماری تعلیم پر بھی مثبت اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

جب کسی دور دراز کے گاؤں کا ایک ہونہار بچہ اپنے گاؤں کے چھوٹے سے اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرکے شہر کا رخ کرتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتا ہے۔

کیوں کہ اس نے میٹرک کا امتحان بغیر نقل کیے اچھے نمبروں سے پاس کیا ہوتا ہے۔ وہ شہر کا رخ اس امید کے ساتھ کرتا ہے کہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ایک اچھا ڈاکٹر یا انجینیر بن کر ملک و قوم کی خدمت کرے گا۔ وہ سائنس اور ریاضی میں مہارتِ تامہ کا حامل ہوتا ہے۔ مگر جیسے ہی وہ شہر کے کسی اچھے سے کالج میں جاتا ہے تو حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ یہاں اسے ہر جگہ انگریزی کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ یہاں مروجہ مضامین اردو کے بجائے انگریزی میں پڑھانے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ یہ عمل اس کی پڑھائی کو شدید متاثر کرتا ہے۔ کیوں کہ اس نے تمام مضامین اردو میں پڑھے ہوتے ہیں۔ یوں اسے انگریزی کی کمزوری کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔

یہ اردو کو اہمیت نہ دینے کا ہی نتیجہ ہے کہ ہماری شرحِ خواندگی کا اس طرح اضافہ نہیں ہو رہا، جس طرح وقت کا تقاضہ ہے۔ جب کہ ہم سے کم ترقی یافتہ ممالک شرحِ خواندگی میں ہم سے آگے ہیں، جو کہ ہمارے لیے لمحہِ فکریہ ہے۔ ڈاکٹر منظور اعجاز لکھتے ہیں:

"پاکستان میں ہر چیز کے لیے شارٹ کٹ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ لسانی پہلو سے یہ شارٹ کٹ انگریزی کو ذریعہِ تعلیم بنا کر اپنایا گیا ہے۔ دیہاتوں، قصبوں اور شہروں کے محلوں میں ہر جگہ انگریزی میڈیم اسکول کھل گئے ہیں۔ حکومتیں بھی یہ نوید دیتی رہتی ہیں کہ سرکاری اسکولوں میں بھی پہلے انگریزی زبان پڑھائی جائے گی۔ گویا کہ یہ

تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مادری زبان کی بجائے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے سے ملک تیزی کے ساتھ ترقی کرے گا۔ اب یہ سارکچھ کئی دہائیوں سے جاری و ساری ہے لیکن کیا اس سے پاکستان میں تعلیمی معیار بہتر ہوا ہے یا عوامی شعور میں کوئی مثبت تبدیلی آئی ہے ؟ ظاہر بات ہے کہ نہ تو خواندگی کی شرح میں بہتری آئی ہے اور نہ ہی معیارِ تعلیم بہتر ہوا ہے۔ اس کے الٹ جن ملکوں میں انگریزی کی جگہ مادری زبان کو ہی ترجیح دی گئی ، ( تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں۔" (روز نامہ جنگ، 11 فروری 2015ء

میں اس بات کا برملا اعتراف کرتا ہوں کہ انگریزی ایک اہم زبان ہے۔ انگریزی زبان کی عالم گیریت سے کوئی انکار نہیں۔ دنیا بھر میں یہ زبان استعمال ہو رہی ہے۔ کون سا ملک ہے، جہاں یہ زبان مستعمل نہ ہو۔ یہ بات قابلِ ستائش ہے کہ ہماری درس گاہوں میں انگریزی لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ میں انگریزی کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھانے کا زبردست حامی ہوں۔ لیکن میں صرف اتنی استدعا کرتا ہوں کہ قومی زبان کو اس کا مقام دیا جائے۔ درس گاہوں میں دقیق مضامین کو اردو میں پڑھنے اور پڑھانے کو انگریزی میں پڑھنے اور پڑھانے پر ترجیح دی جائے۔ اردو کی تدریس کا خاص اہتمام کیا جائے۔ تاکہ ہماری اپنی زبان بھی پروان چڑھ سکے۔ اس کے علاوہ کاغذات، اسناد وغیرہ میں بھی اردو کو اولیت دی جائے۔ ہمارا آئین بھی اس بات کا تقاضا

کرتا ہے۔

# نقل کی روک تھام

پاکستان میں تعلیمی زوال کا ایک بڑا سبب نقل کلچر ہے۔ مجھے دیگر صوبوں کا علم نہیں، لیکن جس طرح صوبہِ سندھ کے شہر کراچی میں نقل ہوتی ہے، اس سے ہماری تعلیم کے معیار کا پول کھل جاتا ہے۔ ان دنوں امتحانات کا دور دورہ ہے۔ اسکولوں میں امتحانات ہو گئے ہیں۔ اگلے مہینے کی ابتدا میں کراچی میں جماعت نہم اور دہم کے امتحانات شروع ہوں گے۔ اس کے بعد گیارہویں اور بارہویں کے امتحانات ہوں گے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے طلبہ امتحانات سے بالکل خوف زدہ نہیں ہیں۔ ان کے چہروں سے پریشانی ذرا بھی نہیں جھلکتی۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ امتحانات میں نقل کرکے پاس ہو جائیں گے۔ یہ نقل ہی ان کے کام یاب ہونے کا واحد سہارہ ہے۔
نقل ایک دیمک کی مانند ہے، جو ہمارے تعلیمی نظام کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرتا جا رہا ہے۔ پہلے نقل جماعت نہم اور دہم تک محدود تھی۔ پھر بڑھ کر گیارہویں اور بارہویں جماعت تک پہنچ گئی۔ اب اس سے اوپر کی کلاسوں میں بھی بڑی شان کے ساتھ نقل کا بازار گرم کیا جاتا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ تعلیم کا نظام درہم برہم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن کوئی اس زہر قاتل

کے لیے موثر عملی اقدامات اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ امتحانات سے پہلے ہم متعلقہ حکام کے بیانات اخبارات میں پڑھتے ہیں، جس میں اس بات کا عزم کیا جاتا ہے کہ اس دفعہ نقل کی روک تھام کے لیے سخت اقدامات کیے جائیں گے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ بیانات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس طرح ہمارے تعلیمی زوال کا زور ذرا بھی نہیں تھمتا۔ اس میں کوئی مثبت تبدیلی نظر نہیں آتی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں ہر ایک نقل میں ملوث ہیں۔ بہت سے دردِ دل رکھنے والے انسان ہیں، جو اس زہر سے اپنی نئی نسل کو بچانے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ بہت سے ایسے امتحانی مراکز ہیں، جہاں بالکل نقل نہیں ہوتی۔ بہت سے ایسے طالبِ علم ہیں، جو نقل سے اپنا تعلیم دامن بچائے رکھتے ہیں۔ بہت سے ایسے والدین ہیں، جو اپنے بچوں کو تلقین ہی نہیں، تاکید کرتے ہیں کہ نقل سے باز رہنا۔ بہت سے استاد ایسے ہیں جو بہ صد خلوص اپنے شاگردوں کو امتحانات کی تیاری کراتے ہیں، تاکہ وہ نقل سے باز رہیں۔ میری نظر میں یہ سب لوگ ایک بہترین کام سرانجام دے رہے ہیں، ان کے اس کام کی جتنی ستائش اور حوصلہ افزائی کی جائے، کم ہے۔

لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں، جو نقل کے ذریعے ہماری تعلیم کا بیڑا

غرق کر رہے ہیں۔ میں نے ایسے ایسے امتحانی مراکز بھی دیکھے ہیں، جہاں کلاس سے نگران کو بدمعاشی کے زور پر نکال دیا جاتا ہے۔ اور پھر بچوں کو چند روپوں کے عوض حل شدہ پرچے دے دیے جاتے ہیں۔امتحانات کے دوران ہر ایک کو اندر آنے کی اجازت ہوتی ہے۔ جو اپنے جاننے والے طلبہ کے لیے نقل لاتے ہیں۔آپ خود سوچیے کہ اس طرح کے ماحول میں ہماری تعلیم بھلا کیوں کر پروان چڑھے گی۔ وہ لوگ، جو نقل کے اس برے کھیل میں ملوث ہیں، انھیں سوچنا چاہیے کہ یہ اپنی آنے والی نسل کے لیے بہت برا کر رہے ہیں۔ تعلیم کسی بھی ملک کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے ۔ لیکن جب یہی تعلیم نقل جیسی بیماری کے بھینٹ چڑھ جائے تو پھر تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ شخص میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

صوبۂ سندھ میں نقل کے لیے سخت قوانین وضع کیے گئے ہیں۔ طالبِ علم جماعت سے امتحانی کاپی باہر نہیں لے جاسکتا۔ نقل کرنا تو در کنار، وہ امتحانی مرکز میں موبائل بھی نہیں لا سکتا۔لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نقل کے خلاف بنائے گئے ان قوانین پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس کا جواب ہر گز "نہیں" میں ہوگا۔ پھر اگلا سوال یہ ہے کہ ان قوانین پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا؟ اب نقل کلچر اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کا زور، اگر متعلقہ حکام توڑنا چاہیں تو بھی، بڑی مشکل سے ٹوٹے گا۔آسان لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اب

صورت حال بہ ایں جا رسید کہ نقل کے خلاف مستعمل قوانین پر فی الفور عمل نا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو چکا ہے۔ یہ صورت حال اور زیادہ خطرناک ہے۔ جس کا تدارک، جتنا جلد ہو سکے، کر دینا چاہیے۔

ہمارے طلبہ امتحانات میں ناجائز ذرائع استعمال کرکے ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ ڈگریاں لے کر جب وہ نوکریوں کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں تو بہ مشکل ہی کوئی اچھی نوکری تلاش کر پاتے ہیں۔ اکثر وہ بے نیل و مرام لوٹتے ہیں۔ یا پھر کسی چھوٹی موٹی نوکری پر قناعت کر لیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب وہ تعلیم جیسے مقدس فریضے میں بھی ناجائز ذرائع استعمال کرکے دو چار ڈگریاں لے لیتے ہیں تو ان میں ذرا بھی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔ جب کہ نوکری ڈگری سے زیادہ قابلیت مانگتی ہے۔ جتنی بڑی نوکری ہوگی، اتنی بڑی قابلیت کی محتاج ہو گی۔ ایسے "پڑھے لکھے" نوجوانوں کو جب نوکری نہیں ملتی تو وہ دانت پیستے رہ جاتے ہیں اور گلے شکوے کرتے پھرتے ہیں کہ یہاں رکھا ہی کیا ہے۔ ہم نے اتنا "پڑھ" لیا ہے۔ لیکن نوکری ہی نہیں ملتی۔ یہاں تو سب اپنوں کو نوازتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

تقریباً ایک سال پہلے میں نے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں نقل کی روک تھام کے لیے چند تجاویز دی تھیں۔ آج کی اپنی تحریر میں وہی تجاویز دوبارہ دہرا

کر اس تحریر کا اختتام کرتا ہوں۔

1۔ سال کے ابتدا میں ہی سرکاری سطح پر یہ اعلان کر دیا جائے کہ اس دفعہ جو اسٹوڈنٹ کسی بھی ذریعے سے (مثلا موبائل، کاپی یا کسی اور ذریعے سے) نقل کرتے ہوئے پکڑا جائے گا، اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے سے بالکل گریز نہیں کیا جائے گا۔ (مجھے باقی صوبوں کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ وہاں نقل کی کیا سزا ہے، لیکن سندھ میں نقل کی سزا یہ ہے کہ امیدوار تین سال تک امتحان میں شریک نہیں ہو سکتا۔)

2۔ تمام اسکولوں اور کالجوں کے پرنسپل، ہیڈ ماسٹر وغیرہ کو سال کی ابتدا میں ہی محکمۂ تعلیم کی جانب سے نوٹس بھیج دیا جائے کہ وہ اپنے شاگردوں کی پڑھائی پر خصوصی توجہ دیں اور انھیں امتحانات کے دوران نقل نہ کرنے کی تنبیہ کریں، تاکہ وہ قانونی کارروائی اور سزا سے بچ سکیں۔

3۔ امتحانی مراکز میں سوائے امیدواروں، نگرانوں اور متعلقہ حکام کے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ ( میں نے بارہا دیکھا ہے کہ امیدواروں کے رشتہ دار اور دوست وغیرہ امتحانی مراکز میں بے باکی سے داخل ہو جاتے ہیں اور امیدواروں کو نقل فراہم کرتے ہیں۔ اکثر اوقات نگران کو ڈرا دھمکا کر

(! کلاس سے ہی نکال دیتے ہیں۔یہ کتنے فسوس کی بات ہے
۔ چھوٹی چھوٹی جیبی سائز کی حل شدہ کتابوں پر پابندی عائد کی جائے۔(برائے مہربانی 4
ان کتابوں کے شائع کرنے والے ناراض نہ ہوں، کیوں کہ یہ حل شدہ جیبی سائز کی
کتابیں نہ صرف طلباء کو نقل فراہم کرنے میں آسانیاں فراہم کرتے ہیں، بلکہ ان کی وجہ
(سے طلباء نصاب کی اصل کتاب بھی نہیں پڑھتے۔
۔آخر میں سب سے اہم بات یہ کہ نقل کے سدباب کے قانون پر عمل ضرور کیا جائے 5
(۔ ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ یہاں قوانین تو بن جاتے ہیں، لیکن عمل نہیں کیا جاتا۔

# ( نقل امریکا اور بھارت میں ( فکاہیہ کالم

یقین جانیے ، اگر ہمیں امریکا اور انڈیا میں ہونے والی نقل کے بارے میں پہلے سے ہی معلوم ہوتا تو ہم پچھلے ہفتے " نقل کی روک تھام " کے عنوان سے کوئی کالم زیرِ تحریر نہ لاتے ۔ بھارت کے طلبہ کہتے ہیں کہ نقل کرنا ان کا جمہوری ہی نہیں ، بلکہ پیدائشی حق ہے ۔ بچے تو بچے ہوتے ہیں ، چاہے وہ انڈیا کے ہوں یا پاکستان کے۔ جب نقل کرنا بھارت کے بچوں کابنیادی حق ہے تو ہمارے بچوں کا کیوں نہیں ہے ۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں ؟اگر ہم اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے طلبہ وطالبات کو ان کے پیدائشی اور جمہوری حق سے محروم کرنے کی بات کریں تو یہ بالکل اچھی بات نہیں ہے ۔اس لیے ہم اپنی پچھلی تحریر سے .برات کا اظہار کرتے ہیں ۔ دراصل امتحان کے گرم موسم میں جب ہم نے چند ہونہار بچوں کو کھیلتے دیکھا تو ہمارا خون کھول اٹھا۔ہمارے حساس دل میں قوم کا جذبہ تو یوں ہی موج زن ہے ۔ اس لیے ہم نے ایک جذباتی کالم لکھ مارا۔ کیوں کہ ہمارے لاشعور میں یہ بات رقص در رقص کر رہی تھی کہ نقل "صرف " ہمارے بچے کرتے ہیں ۔ لیکن جب ہمیں معلوم ہوا کہ نقل امریکا اور بھارت میں بھی کی جاتی ہے تو ہمارے لاشعور کو خیال میں ایک چھوٹی سی ترمیم کرنی پڑی ۔اب ہمارے لاشعور کا خیال تھا: " نقل ہمارے بچے بھی کرتے ہیں ۔"اس "صرف " نے سارا کام خراب کر دیا۔ اور ہم نے

نقل کے نقائص بیان کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ اب ہمیں بہت پشیمانی ہو رہی ہے۔ پر اب کیا ہووت اب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ ہمیں اس بات کا تاسف کھائے جا رہا ہے کہ ہم نے اپنے کھلنڈرے طالب علموں کے جذبات کی ذرا بھی قدر نہیں کی۔ ہم نے ان کے "بنیادی اور جمہوری" حق کے خلاف بول کر بہت بڑی خطا کی ہے۔

اب ہم ان دو خبروں کا احوال بیان کرتے ہیں، جن کو پڑھ کر ہمارے خیالات میں ایک انقلابی" تبدیلی رونما ہوئی۔ ان میں سے پہلی خبر یہ ہے کہ امریکی ریاست میری لینڈ" کا محکمہِ تعلیم دو ایسے طالب علموں کے خلاف قانونی کارروائی کی کوشش کر رہا ہے، جنھوں نے میٹرک کے امتحان میں انگریزی کے پرچے میں سماجی رابطے کی ویب سائٹ ٹوئٹر کے ذریعے نقل کی تھی۔ امریکا ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ اس لیے وہاں کے طالب علموں نے نقل کے لیے بھی "ترقی یافتہ" طریقہ استعمال کیا۔ پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے، اس لیے یہاں نقل کے لیے بھی "ترقی پذیر" طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہاں ٹوئٹر سے زیادہ پرچیوں سے مدد لی جاتی ہے۔ میری لینڈ کی ریاست کے محکمہِ تعلیم کے ترجمان ولیم رائین ہارڈ کہتے ہیں: "پہلے طلبا اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی دوسرے طالب علم کی تحریر دیکھ کر نقل مارتے تھے۔ اب لیکن امتحان میں نقل مارنے کے لیے جدید ذرائع استعمال کیے جانے لگے ہیں۔" اس طرح کی باتیں ہم بھی کبھی ترنگ میں آ

کر کہہ دیتے ہیں۔ مگر یقین جانیے کہ اس طرح کی باتوں سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سب کچھ وہی رہتا ہے۔ ولیم رائن ہارڈ کو اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ آج کے بچے بہت تیز ہیں۔ وہ نقل کرنے کے ہر فن سے واقف ہیں۔ انھیں نقل کے ایسے ایسے طریقوں کا علم ہے، جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہیں۔ پھر دور بھی جدید ہے۔ جدید دور اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہر شے میں جدت کا ظہور ہو۔ اگر ان کی ریاست کے بچے نقل کے طریقہ ہائے کار میں جدت لاتے ہیں تو کیا ہوا؟ جیسی کومارٹ نے، جو امتحانات کا اہتمام کرنے اور ان امتحانات کا اہتمام کرنے والی ایک کمپنی کے ترجمان ہیں، بین الاقوامی نیوز ایجنسی روئٹرز کا بتایا کہ موجودہ امتحانات کے دوران اب تک چھ امریکی ریاستوں میں طلبہ کی طرف سے 'آن لائن چیٹنگ' کے مجموعی طور پر 76 واقعات سامنے آچکے ہیں۔ جیسی کومارٹ کے اس انکشاف سے معلوم ہوا کہ معاملہ دو بچوں تک محدود نہیں، بلکہ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ اس لیے اب یہی بہتر محسوس ہوتا ہے کہ طلبہ کو ان کا بنیادی حق دے دینا چاہیے۔ ریاست میری لینڈ کے یہ ہونہار بچے اگر کسی دقیق مضمون میں نقل کرتے تو تو بات بنتی۔ مگر انھوں نے انگریزی میں نقل کرکے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ بات باور کرادی کہ آسان مضامین میں نقل کرنا بھی کوئی اچنبھے یا عیب کی بات نہیں۔ ہر مضمون میں نقل کی جاسکتی ہے۔ چاہے وہ مشکل ہو یا آسان۔

اب دوسری خبر کی بات کرتے ہیں۔ یہ خبر زیادہ دور کی نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے پڑوسی ملک بھارت کی ہے۔ بی بی سی رقم طراز ہے: "بھارت کی ریاست بہار میں امتحانات کے دوران نقل کرنا عام ہے لیکن نئی حاصل ہونے والی تصاویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس بڑے پیمانے پر نقل بڑی بے باکی سے ہوتی ہے۔" بی بی سی نے اس خبر میں سب سے بڑی ستم ظریفی یہ کی ہے کہ اس خبر کے ساتھ ایک ایسی تصویر چسپاں کی ہے، جس میں ایک عمارت کی کھڑکی سے طلبہ وطالبات کے "عزیز واقارب" اپنے بچوں کو نقل کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بی بی سی نے یہ بھی لکھ دیا:

"سکینڈری سکول کے امتحان کے دوران طالب علموں کے دوست اور یہاں تک کہ ان کے والدین دیواریں پھلانگ کر انھیں سوالات کے جوابات اور نقل میں مدد دینے والا دیگر مواد پہنچاتے نظر آتے ہیں۔" اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ بات نظر سے گزری: "بی بی سی ہندی کے منیش سندیلا کے مطابق مقامی اخبارات ایسی تصاویر سے بھرے پڑے ہیں جس میں والدین اپنے بچوں کو نقل کرنے میں مدد دے رہے ہیں اور اس کوشش میں بعض تو اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔"

اس جذبہ وایثا کو ہم کیا نام دیں۔ بھارت ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ وہاں کے بچے ہمارے بچوں سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ اب جب وہاں اس طرح نقل کا رواج ہے، تو ہم کون ہوتے ہیں، اپنے بچوں کو نقل کے نقائص کا درس دینے والے۔ بی بی سی کی اس خبر سے یہ بھی معلوم ہوا:

"اب تک چار سو طالب علموں کو نقل کرنے پر امتحانات سے نکال دیا گیا ہے تاہم
حکومت اکیلے اس مسئلے پر قابو نہیں پا سکتی اور اس میں میں والدین اور طالب علموں کو
بھی ساتھ دینا چاہیے۔"

امریکی ریاست میری لینڈ میں نقل کے 76 واقعات سامنے آئے ہیں تو اس کے برعکس
بھارتی ریاست بہار میں 0 40 طلبہ نقل کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں
کہ بھارتی حکومت اگر اس مسئلے پر قابو نہیں پا سکتی تو اس مسئلے کو بالکل چھوڑ دے۔ کیوں
کہ مسئلے کا ایک حل یہ بھی ہے کہ اسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے!

## اتحاد و اتفاق۔۔۔ مسلمانوں کی اہم ضرورت

اس میں شک نہیں کہ اتحاد و اتفاق مسلمانوں کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ میں اپنی تحریروں کے ذریعے کبھی کبھی مسلمانوں کو اس سب سے اہم ضرورت کی طرف توجہ دلاتا رہتا ہوں۔ مسلمان دنیا کی دوسری بڑی قوم ہیں۔ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ارب سے بھی زیادہ ہے۔ دنیا کے اٹھاون ممالک پر مسلمانوں کی حکومت ہے۔ عیسائیوں کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ لیکن عالمی سطح پر مسلمانوں کی کیا اہمیت ہے، وہ ہم سب جانتے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کو کئی قسم کے خطرات لاحق ہیں۔ جن کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن میری نظر میں سب سے بڑی وجہ مسلم دنیا میں پھیلی نااتفاقی اور انتشار ہے۔ کہیں فرقہ واریت ہے تو کہیں قوم پرستی۔اور اس کی سب سے بڑی وجہ تعصب ہے۔ مسلمان جب تک متحد نہیں ہوں گے، وہ اپنے مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکیں گے۔ ان کی حالت یہی رہے گی۔ وہ اپنے دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ مسلمان ہر قسم کے نااتفاقی اور انتشار پھیلانے والے عوامل سے گریز کریں۔

مجھے یہ موضوع سعودی عرب اور یمن کے درمیان ہونے والی محاذ آرائی پر یاد آیا۔ یہ جنگ، جب تک یمن میں حوثیوں اور وہاں کی حکومت کے درمیان ہو رہی تھی

اس وقت تک اقتدار کے حصول کے سبب ہو رہی تھی ، لیکن جیسے ہی اس جنگ میں ، سعودی عرب شامل ہوا ، اب اس میں اقتدار کے حصول کے ساتھ ساتھ فرقہ واریت بھی نظر آ رہی ہے۔ جو کہ تشویش ناک بات ہے اور مسلمانوں میں پھیلے نا اتفاقی اور انتشار کی ایک تازہ مثال ہے۔ سعودی عرب کے یمن پر حملے کے بعد ایران اور سعودی عرب کے درمیان بیان بازی شروع ہو گئی۔ ایران کے نائب وزیرِ خارجہ عامر عبد اللہ نے کہا کہ خطے کے ایک حصے میں جنگ سے لگی آگ پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔ جو خطے کی اقوم کے مفاد میں نہیں۔ ہم یمن میں فوجی حل کے شدید مخالف ہیں۔ ہمارا ماننا ہے کہ یمن میں سعودی عرب کا فوجی حملہ اسٹریٹیجک غلطی ہے۔ سیاسی حل ڈھونڈنے کے لیے فوجی آپریشن کو فورا بند کرنا ہوگا۔ ایران یمن میں مداخلت کو بیرونی جارحیت تصور کرتا ہے۔ جس سے خطے میں انتہا پسندی کو فروغ ملے گا۔ جب کہ سعودی وزیرِ خارجہ سعود الفیصل نے شورائی کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم جنگ کے حامی نہیں۔ لیکن اگر طبلِ جنگ بجایا جائے گا تو ہم تیار ہیں۔ شاہ سلمان بن عبد العزیز نے کہا ہے کہ یمن میں ایران نواز حوثی باغیوں کے خلاف جاری آپریشن "فیصلہ کن طوفان" نہ صرف پورے خطے بلکہ عالمی امن و سلامتی کا باعث بنے گا۔ اس بیان بازی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صورتِ حال خطرناک حد تک تشویش ناک ہے ۔اس خیال سے ہی خوف محسوس ہوتا ہے کہ نہ جانے اس جنگ کے خطے پر کیا کیا اثرات مرتب ہوں گے اور مسلمان اس جنگ سے پیدا ہونے والے منفی اثرات سے

کس طرح نمٹیں گے۔

وقت بہت نازک ہے۔ یہ وقت جوش سے نہیں، ہوش سے کام لینے کا ہے۔ اس نازک موقع پر سعودی عرب اور ایران دونوں کو اپنی غلطیوں کا ادراک کرنا ہوگا۔ اچھی بات یہ ہے کہ اس جنگ کا سیاسی حل نکالا جائے۔ بہ صورتِ دیگر مشرقِ وسطیٰ میں فرقہ واریت کو مزید تقویت ملے گی۔ جس کا نقصان سب کو ہوگا۔ مسلم دنیا میں پہلے سے ہی فرقہ واریت کچھ کم نہیں ہے۔ شام میں پچھلے 4 سالوں سے اسی فرقہ واریت کے نام پر انسانیت کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔ عراق کو بھی اسی فرقہ واریت سے کئی قسم کے نقصانات اٹھانے پڑ رہے ہیں۔ پاکستان کی حالت بھی اس ضمن میں قابلِ تشویش ناک ہے۔ یہاں فرقہ واریت کے نام پر ہم کئی عظیم لوگوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کو سوچنا ہوگا کہ کیا ہم اس نازک موقع پر فرقہ واریت کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ جب کہ ہمارے چاروں طرف دشمن منڈلا رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی جتنے اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔

اسلام فرقہ واریت کی بیخ کنی کرتے ہوئے اتحاد و اتفاق پر زور دیتا ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ اس کے ماننے والے باہم دست و گریباں ہوں۔ اسلام سلامتی کا درس دیتا ہے۔ سورہِ آل عمران کی آیت نمبر 103 میں ارشادِ باری تعالیٰ

: ہے

اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو۔ اور اللہ کی اس وقت کی "
نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں میں الفت
ڈال دی۔ پس تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے
کنارے پہنچ چکے تھے تو اس نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اللہ اسی طرح تمھارے لیے اپنی
" نشانیاں بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

: سورۂ انعام کی آیت 159 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا۔ اور گروہ گروہ بن گئے۔ آپ
ﷺ) کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ بس ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔)

اس آیت سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں فرقہ واریت کس حد تک
بری شے ہے۔ سورۂ حجرات قرآن حکیم کی انچاسویں سورت ہے۔ اس سورت کی تقریبا
تمام آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کوئی نہ کوئی خوب صورت نصیحت کی ہے

: ۔اس سورت کی آیت نمبر 10 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے

سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ پس اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو۔ اور اللہ "
" سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ اور جو شخص جماعت سے الگ
ہوا، وہ دوزخ میں جا گرا۔" ( ترمذی بہ حوالہ مشکوۃ المصابیح، راوی : حضرت عبداللہ
(بن عمر رضی اللہ عنہ

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا: "خبردار! میرے بعد تم گمراہ "نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگ جاؤ۔

اسلام کی حقیقی تعلیمات کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ فرقہ واریت کو اپنی صفوں سے نکال باہر کریں۔ کیوں کہ اتحاد وقت کی ضرورت ہے۔ اور اسلام بھی اتحاد کی دعوتِ عام دیتا ہے۔

## پاکستانی ٹیلنٹ

یہ خبر اگرچہ تھوڑی سی پرانی ہے، لیکن دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جرمن ویب سائٹ ڈی ڈبلیو نے بارہ فروری 2015 کو اپنی ویب سائٹ پر پاکستانی محققین کے ایک کام یاب تجربے کے بارے میں خبر شائع کی تھی۔ میں اس خبر کی چند چیدہ چیدہ باتیں یہاں تحریر کرتا ہوں۔اس خبر کے مطابق: پاکستانی محققین نے گھریلو کوڑے کرکٹ میں شامل پلاسٹک کو انتہائی جدید طریقے سے ری سائیکل کرنے کا کامیاب تجربہ کیا ۔پاکستان میں اس طریقہ کار سے متعلق تجربات حسین ابراہیم جمال ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں کیے گئے ہیں۔ یہ تجربات شاہ فہد یونیورسٹی برائے پٹرولیم اور معدنیات کے پروفیسر ڈاکٹر فرحت علی کی زیر نگرانی انجام دیے گئے ہیں۔ کراچی کے حسین ابراہیم جمال ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈکٹر رضا شاہ بتاتے ہیں کہ پلاسٹک ری سائکلنگ کا یہ طریقہ نہایت ماحول دوست ہے، "یہ ایک ایسا پراسس ہے جس میں پلاسٹک کا کوڑا فیول میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان کے بڑے شہروں خاص طور سے کراچی کے جو بڑے مسائل ہیں ان میں سے ایک آلودگی ہے۔ اس کی بڑی وجہ پلاسٹک کا کوڑا ہے جس میں پولیتھن بیگ کی سب سے زیادہ تعداد ہے جو ماحول میں شامل ہو کر تلف نہیں ہوتے اور مختلف بیماریوں کو جنم دیتے ہیں۔"

پاکستان کے ان ہونہار محققین نے یہ عمل کس طرح کیا،اس کے بارے میں ڈاکٹر رضا شاہ کہتے ہیں : اس عمل میں پلاسٹک کو ایک کیٹالسٹ یعنی ایسا مادہ جو دُوسرے مادّوں میں کیمیائی عمل کو تیز کرتا ہے، اس کی موجودگی میں پلاسٹک کو حرارت دی جاتی ہے۔ اس سے پلاسٹک میں شامل پولیمر کو توڑ کر ہائیڈروکاربن کے مالیکیولز میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، جو فیول کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہائیڈروکاربن عام طور پر پیٹرول اور ڈیزل میں ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہم نے جو طریقہ اختیار کیا اس میں ہم نے کیٹالسٹ تیار کیا وہ عام مٹی تھی جسے ریفائین کیا گیا اور کیٹالسٹر بنایا۔اس کے علاوہ ہم نے ایک سادہ سا آلہ تیار کیا، جسے حرارت دے کر کیٹالسٹ کو استعمال کرتے ہیں اور پلاسٹک کو ہائڈروکاربن میں تبدیل کرتے ہیں۔ یہ ایک سادہ سا پراسس ہے، جس میں کوئی بہت ہائی ٹیکنالوجی استعمال نہیں ہوتی۔

معذرت چاہتا ہوں کہ خبر طویل ہو گئی۔ مگر اس ضمن میں سائنسی پراسس من و عن لکھنا ضروری تھا۔ بہ صورت دیگر خبر پوری طرح سمجھ نہ آتی۔ بلا شبہ یہ خبر پاکستانی قابلیت اور ٹیلنٹ کو ظاہر کرتی ہے۔ میری کوشش رہتی ہے کہ اس طرح کی خبروں اور رپورٹوں کی تشہیر کروں، جس میں پاکستان کے باشندوں کی صلاحیت اور قابلیت کا اظہار ہو۔اس لیے اس خبر کو جو اگرچہ پرانی تھی، مگر پاکستان کے سائنسدانوں کی قابلیت اور صلاحیت کا مظہر تھی، مجھے اپنی اس

تحریر میں لکھنا پڑا۔ پاکستان کے لوگوں میں قابلیت اور صلاحیت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ سائنس کی دنیا میں کچھ ایسے کارنامے بھی ہیں، جو پاکستانیوں نے سرانجام دیے۔ لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اگر پاکستان میں سائنس کی تعلیم معیاری ہو جائے اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت سائنسی تحقیقات میں نہ صرف دلچسپی لے، بلکہ اس کے لیے بجٹ میں ایک بھاری رقم مختص کرے تو ہمارے ہونہار محققین اور سائنس دانوں کی صلاحیت اور قابلیت میں مزید نکھار آجائے گا۔ اور وہ بہ آسانی دنیا کو باور کرا سکیں گے کہ ہم بھی قابلیت، لیاقت صلاحیت اور مہارت میں کسی سے کم نہیں۔ ہم بھی دنیا کے دیگر ملکوں کے سائنس دانوں اور محققین کی طرح بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

یہاں ایک اور خبر قابلِ ذکر ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کے محققین اور سائنس دانوں میں تحقیق کی کتنی جستجو پائی جاتی ہے۔ یہ خبر بی بی سی اردو نے شائع کی ہے۔ اس خبر کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے: "کراچی کی آغا خان یونیورسٹی کے محقق ڈاکٹر نوید احمد خان کو جراثیم کی کھوج نے اپنے بچوں کے باتھ روم سے کاکروچ کے دماغ تک پہنچا دیا ہے۔" ڈاکٹر نوید احمد خان بتاتے ہیں: "میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہم تو اپنے بچوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ان جراثیموں اور جانداروں کو تو قدرتی طور پر تحفظ مل رہا ہے جو ان کی اتنی افزائش نسل ہو رہی۔ یقیناً ان کے اندر کوئی مضبوط

مدافعاتی نظام موجود ہے جو انہیں محفوظ رکھتا ہے۔" پھر بالآخر ڈاکٹر نوید احمد خان اور ان کے ساتھ کام کرنے والی ٹیم نے یہ راز معلوم کر ہی لیا کہ کاکروچ کا مدافعاتی نظام اتنی مضبوط کیوں ہے۔ ڈاکٹر نوید احمد خان اور ان کی ٹیم نے جب کاکروچ پر تحقیق کی تو انھیں معلوم ہوا کہ کاکروچ سے ملنے والی مالیکیول انسانی جسم میں انفیکشن پیدا کرنے والے "ایم آر ایس اے" اور "ای کولائی" بیکٹریا کے خاتمے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔اس طرح یہ بات پہلی بار معلوم ہوئی کہ کاکروچ ایسے حقیر جان دار میں بھی قدرت نے ایسے اجزا رکھے ہیں، جو انسانی جسم کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ بالاشبہ اس تحقیق کا کریڈٹ بھی پاکستانی ٹیلنٹ کے سر جاتا ہے۔ اس تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستانی بھی کسی سے کم نہیں۔

ایک اور خبر بھی نظر سے گزری، جس سے پاکستانی ٹیلنٹ کا اندازہ ہوتا ہے۔ 10 اپریل،بروز جمعہ کو روزنامہ جنگ میں ایک خبر شائع ہوئی۔ اس خبر کے مطابق پاکستانی نژاد،برطانوی ڈاکٹر نے ایک ایسا لیزر پین ایجاد کرنے کا اعزاز حاصل کر لیا جس سے ،برین ٹیومر کا سراغ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ 36 سالہ ڈاکٹر بابر وقاص نے یہ لیزر پین ،اس سے مماثل آلہ کینیڈا میں جلد کے کینسر کے علاج میں استعمال ہوتے دیکھ کر ایجاد کیا۔ اس خبر سے بھی پاکستانی ٹیلنٹ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔جب پاکستان میں ڈینگی کی وبا

نے آفت پھیلائی ہوئی تھی ، اس وقت پاکستان کی ایک یونی ورسٹی نے اس بیماری کے خاتمے کے لیے اہم پیش رفت کی تھی ۔ یہ پاکستانی کی ایگری کلچرل یونی ورسٹی آف فیصل آباد (یو اے ایف ) تھی ۔اس وقت یو اے ایف کے وائس چانسلر نے بارہ سائنس دانوں پر مشتمل ایک گروپ تشکیل دیا تھا۔ تاکہ وہ ڈینگی کے خاتمے کے لیے تحقیقات کر سکیں ۔ اس ٹیم نے ڈینگی پھیلانے والے عوامل کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستانی ٹیلنٹ سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے عملی اقدامات اٹھائے جائیں ۔ کیوں کہ ہمارے طلبہ وطالبات میں تحقیق و تجسس کا بہت زیادہ شوق پایا جاتا ہے ۔ ان کی تحقیقات نہ صرف ملک و قوم کے لیے سود مند ثابت ہوں گی ، بلکہ بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے بھی کارآمد ثابت ہوں گی ۔ اسی پر اکتفا ہے ۔

## الم ناک سانحہ

موضوع ذرا پرانا ہے۔ مگر ایسا ہے کہ اغماض برتنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ موضوع دیگر موضوعات سے زیادہ اہم بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ موضوع جتنا پرانا ہوتا جاتا ہے، اہمیت کھوتا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی لکھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ پیر سے لے کر ہفتے تک ذہن میں بہت سے موضوعات کلبلاتے رہے۔ میرے سامنے یمن کا موضوع تھا۔ عرب امارات کے وزیر کی طرف سے پاکستان کے خلاف بیان بازی اور پھر اس پر ہمارے وزیرِ داخلہ کے سخت ردِ عمل کا موضوع تھا۔ سعودی عرب کے وزیرِ مذہبی امور ڈاکٹر عبد العزیز بن عبد اللہ العمار کی مثبت باتوں کا موضوع تھا۔ جنھوں نے نجی ٹی وی کے ایک پروگرام میں بہترین انداز سے یمن کی کشیدگی کے ضمن میں سعودی عرب کے موقف کا اظہار کیا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں کسی مثبت موضوع پر طبع آزمائی کروں۔ سعودی عرب کے وزیرِ مذہبی امور نے جس طرح مثبت انداز میں اپنے موقف کا اظہار کیا، اس سے اچھا کوئی مثبت موضوع تھا ہی نہیں۔

مگر پھر امید پر نا امیدی غالب آ گئی۔ جب معلوم ہوا کہ میرے بلوچستان میں 20 مزدوروں کو، محض اس جرم کی بنا پر کہ وہ بلوچ نہیں تھے، قتل کر دیا گیا۔ آگ جب اپنے گھر میں لگی ہو تو اس کی زیادہ فکر کرنی چاہیے۔ کیا یمن، کیا

عراق، کیا شام۔ یہ الم ناک واقعہ جمعے اور ہفتے کی درمیانی شب وقوع پزیر ہوا۔ جب سوراب ڈیم پل تعمیر کرنے والی کمپنی کے 20 مزدوروں کو فائرنگ کرکے شہید کر دیا گیا۔ یہ واقعہ بلوچستان کے علاقے تربت میں پیش آیا۔ شہید ہونے والوں میں سے 13 مزدوروں کا تعلق پنجاب کے علاقے صادق آباد سے تھا۔ 7 مزدوروں کا تعلق سندھ سے تھا۔ وہ 50 مسلح افراد تھے۔ جو جمعے کی شب ایک بج کر 40 منٹ پر سوتے ہوئے مزدوروں کے کیمپوں میں داخل ہوئے اور اندھا دھند فائرنگ کرکے انھیں لہو لہو کر دیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان مزدوروں کی حفاظت کے لیے لیویز فورسز کے اہل کار تعینات تھے۔ مگر جب انھوں نے 50 مسلح افراد کو دیکھا تو وہاں سے چلتے بنے۔ یوں نگہبانوں کی نگہبانی کچھ کام نہ آئی۔ قافلہ لٹتا گیا۔ اور لٹتا چلا گیا۔

نہ جانے میرا ملک کب تک فرقہ واریت اور قومیت کے نام پر ہونے والے قتل کے گھاؤ سہتا رہے گا۔ بلوچستان بھی فاٹا اور شہر قائد کی طرح حرماں نصیب ہے۔ فاٹا اور شہر قائد ہی کیا۔ یہاں تو ہر سو آگ لگی ہوئی ہے۔ ہر طرف معصوم انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے۔ کہیں فرقے کے نام پر قتل کیا جا رہا ہے تو کہیں قومیت کے نام پر۔ پے در پے دو جمعوں کو پشاور اور شکار پور کے امام باڑوں میں انسانوں کا قتلِ عام اگر فرقہ واریت کے نام پر ہونے والے قتل کی مثالیں ہیں تو 20 مزدوروں کے قتل کا حالیہ سانحہ قومیت کے نام ہونے

والے قتل کی تازہ ترین مثال ہے۔ بلوچستان میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے قبل بھی گذشتہ اکتوبر میں بلوچستان کے علاقے ساکران سے 8 مزدوروں کو اغوا کے بعد قتل کر دیا گیا تھا۔

حریت اور آزاد پسندی کا یہ مطلب نہیں کہ بے ضرر اور غریب لوگوں کا لہو بہایا جائے۔ آخر ان بے چاروں کا قصور کیا تھا؟ بس یہی کہ وہ اپنے گھروں سے کوسوں دور حصول رزق کی تلاش میں ادھر آ گئے تھے۔ یہ کوئی اتنا بڑا جرم تو نہیں تھا، جس کی انھیں سزا دی گئی۔ زمین اور مزدور کا رشتہ بہت پرانا بھی ہے اور بہت مضبوط بھی۔ مزدور کا یہ حق ہے کہ وہ زمین کے کسی بھی گوشے سے اپنے رزق کے حصول کا سامان کرے۔ یہ بے ضرر لوگ تھے۔ یہ مزدور پیشہ تھے۔ اگر ان کا کوئی قصور ہوتا تو بات سمجھ آتی۔ یہ سیاست کے ابتدائی حروف سے بھی نابلد تھے۔ یہ سب لوگ عصبیت کے بھینٹ چڑھ گئے۔ اور عصبیت اندھی ہوتی ہے۔ عصبیت کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ عصبیت انسانیت کے درد سے ناآشنا ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے یہ کام کیا، وہ دنیا کو کیا باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہی کہ ہم عدم برداشت کے سخت شکار ہیں۔ ہمارے دلوں میں ان مزدوروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، جو ہماری زبان نہیں بولتے۔ اگرچہ ان کا کوئی قصور بھی نہ ہو۔ جن لوگوں نے یہ خطرناک کھیل کھیلا، انھیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ جس طرح یہ لوگ اپنے صوبے میں دیگر

زبانوں کے لوگوں کو برداشت نہیں کرتے ۔ اسی طرح اگر دیگر صوبوں میں بھی یہی فعلِ قبیح شروع ہوجائے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا ۔ یقیناً وہی لوگ ، جنھوں نے اس فعلِ قبیح کی خشتِ اول رکھی ہوگی ۔ پاکستان کے ہر صوبے میں ہمارے بلوچ بھائی رہتے ہیں ۔ پنجاب کی یونی ورسٹیوں میں ہمارے بلوچ طالب علم بھائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ جس طرح دیگر صوبوں کے مزدور بلوچستان میں حصولِ رزق کے لیے آتے ہیں ، اسی طرح بلوچستان سے بھی بہت سے مزدور حصولِ رزق کے لیے دیگر صوبوں کا رخ کرتے ہیں ۔ خدانہ خواستہ عمل کا ردِ عمل شروع ہو جائے تو پورا ملک ہی بدترین عصبیت کا شکار ہوجائے گا ۔

بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے ۔ بلوچستان میں طاقت کے استعمال سے زیادہ ان لوگوں کی نفسیات سمجھنے کی ضرورت ہے ، جنھوں نے اپنے لوگوں سے ہی بغاوت کر دی ۔ ان محرکات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے ، جس سے قومیت کی وبا پھوٹی اور اس وقت تقریبا پورے بلوچستان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے ۔ یہ قومیت کس حد تک خطرناک ہو چکی ہے ، اس کا اندازہ صرف 20 مزدوروں کے قتل کے حالیہ سانحے سے لگایا جاسکتا ہے ۔ احساسِ محرومی سے قومیت جنم لیتی ہے ۔ غیر جانب دار ہو کر دیکھیں تو ہم سارا دوش بلوچستان کے ان چند سر پھرے لوگوں پر نہیں ڈال سکتے ، جو اس وقت پاکستان کی دیگر قوموں کے لیے خطرے کی علامت بن چکے ہیں ۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کا بھی قصور ہے ، جنھوں نے باشندگانِ بلوچستان

کو اپنے افعال سے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ واقعی محروم ہیں۔ ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اگر بلوچستان کے ان لوگوں کی جائز شکایات ہیں تو ان کا ازالہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ورنہ یہ احساسِ محرومی نہ جانے کیا کیا گل کھلائے گی۔

a

## امامِ کعبہ کے نصائح

24 مارچ 2015 بروز جمعۃ المبارک کو امامِ کعبہ شیخ خالد الغامدی نے بحریہ ٹاؤن لاہور کی جامع مسجد میں خطبۂ جمعہ دیا۔ انھوں نے اس خطبے میں اسلام کے حوالے سے جن باتوں کا درس دیا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ کوئی نئی باتیں نہیں تھیں۔ قرآن حکیم کو بہ غور پڑھا جائے تو یہی نے نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام امن کا دین ہے۔ یہ دینِ مبین نہ صرف اپنوں کے لیے بلکہ غیروں کے لیے بھی نسخۂ اکسیر ہے۔ یہ دنیا کی تمام اقوام کے لیے رحمت ہی رحمت ہے۔ ہر ایک اس آفاقی دین کے دامنِ عافیت میں آکر حقیقی سکون حاصل کر سکتا ہے۔ یہ الہامی اصولوں پر مبنی ایسا دینِ مبین ہے، جو اقوام عالم کے لیے امن، سکون اور آتشی کا ضامن ہے۔
اس خطبے میں انھوں نے اسلام کی حقیقی ترجمانی کرتے ہوئے امتِ مسلمہ کو بتایا کہ مسلمان فرقوں اورمذاہب کا احترام کرتا ہے۔ دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ اسلام ہمیں صبر کی تلقین کرتا ہے۔ مومن کی نشانی ہے کہ وہ ہمیشہ ہنس مکھ اور با اخلاق ہوتا ہے۔ مومن کبھی اپنی بات پر اصرار نہیں کرتا۔ اسلام ایک واضح اور کشادہ دین ہے ۔اسلام میں ایک دوسرے سے حسد کرنے کی اجازت نہیں ہے

۔ علماء اور اولیائے دین نے اسلام پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسلام کے دشمن اسلام کو متشدد اور متعصب مذہب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسلام میں اقلیتوں کو بہترین حقوق دیے گئے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے اقلیتوں سے حسنِ سلوک کا درس دیا ہے۔ آپ ﷺ غیر مسلموں کی تیمار داری کے لیے ان کے گھر جاتے۔ آپ ﷺ کا حسنِ سلوک دیکھ کر غیر مسلم مسلمان ہو جاتے تھے۔ اسلام میں دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے احترام کا درس دیا گیا ہے۔ اسلامی حکومت میں تمام مذاہب کے لوگ پر امن زندگی گزارتے ہیں۔ اسلام نے دورانِ جنگ بھی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقے میں نہ پڑو۔ سچائی مسلمان کا زیور ہے۔ ہر مسلمان کو اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ علم حاصل کرنے والوں پر ہمیشہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ باطل کے مٹنے اور حق کی فتح کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ اسلام ہمیں بہترین اخلاق اور محبت کا درس دیتا ہے۔

اسی طرح انھوں نے وفاق المدارس کی طرف سے اپنے اعزاز میں دیے گئے عشائیے میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں آج سب کو مل کر سوچنا ہو گا کہ شیطانی قوتوں کا کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ یہ قوتیں امتِ مسلمہ کو خوش دیکھنا نہیں چاہتیں۔ ان کے عزائم ہیں کہ مسلمانوں کو کم زور کرکے اپنی باتوں کو منوایا جائے، جو نا ممکن ہے۔

ایک نجی ٹی وی میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ عالمِ اسلام کو اس وقت درپیش مشکلات کی وجہ قرآن و سنت سے دوری ہے۔ میں ہر مسلمان کو نصیحت کرتا ہوں قرآن و سنت کی طرف لوٹنے میں ہی ہماری بھلائی ہے۔ امتِ مسلمہ مشکلات سے نکل سکتی ہے۔ تمام فرقوں کے مسلمان آپس میں مل سکتے ہیں۔ متفقہ مسائل بہت زیادہ ہیں۔ فروعی اختلافات کم ہیں۔ ہماری اصل ایک ہے۔ ہمارا کعبہ، نبی اور قرآن بھی ایک ہے۔ اس اصول پر سب کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تقاربِ مذاہب اور خصوصاً اہلِ سنت اور فقہِ جعفریہ کا تقارب ہمیشہ سے رہا تھا۔ اور اب بھی ہے۔فرقہ واریت کا خاتمہ ہمیشہ بہت ضروری امر رہا ہے۔ اکابرینِ امت نے وحدتِ امت کو ہمیشہ اہمیت دی ہے۔

جامع مسجد منصورہ میں نمازِ فجر کی امامت کے بعد خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دشمن ہمارے درمیان نفرتیں پیدا کرکے ہمارے اتحاد و یک جہتی کو توڑنا چاہتا ہے۔ ہمیں دشمن کی افواہوں پر کان نہیں دھرنے چاہئیں۔ دشمن کی ان چالوں سے ہوشیار رہتے ہوئے ہمیں باہمی محبت، اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دینا چاہیے۔ دنیا میں بسنے والے مسلمان ایک امت ہیں۔ ہمارا خدا، نبی قرآن، ایمان، عقیدہ اور جنت ایک ہے۔ جب تک ہم متحد رہیں گے، دشمن اپنے عزائم میں کام یاب نہیں ہوسکے گا۔

امامِ کعبہ نے مختلف تقریبات اور اجتماعات کے دوران اور بھی بہت ساری باتیں کہیں ۔ لیکن میں نے یہاں صرف وہی باتیں لکھی ہیں جو اسلام سے متعلق ہیں ۔ اوپر کے اقتباسات بہ غور پڑھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو اتحاد کا درس دیتا ہے ۔ اور آج مسلمانوں پر جو افتاد آن پڑی ہے ، اس کی سب سے بڑی وجہ انتشار ہے ۔ یمن اور سعودی عرب کے درمیان حالیہ محاذ آرائی کی وجہ بھی یہی انتشار ہے ۔امامِ کعبہ کے درج بالا بیانات پڑھنے یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ زور مسلم اتحاد پر دیا ہے ۔ان کی یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو کعبہ ، نبی ﷺ اور قرآن پاک کے اصول پر یکٹ جا کرنا چاہیے ۔ میری ذاتی رائے بھی یہی ہے کہ اس اصول پر تمام مسلمان متحد ہو سکتے ہیں ۔اس کے علاوہ انھوں نے بحریہ ٹاؤن کی جامع مسجد میں خطاب کرتے ہوئے جس طرح سہل انداز میں اسلام کی حقیقی تعلیمات پیش کیں ، وہ بھی قابلِ تعریف ہیں ۔ اقوامِ مغرب سمجھتی ہیں کہ اسلام میں اقلیتوں کے کوئی حقوق نہیں ہیں ۔ اسلام عورتوں کو کوئی حقوق نہیں دیتا ۔ اسی طرح اسلام اپنے ماننے والوں کو دہشت گردی سکھاتا ہے ۔حالاں کہ ایسا ہر گز نہیں ہے ۔ بحریہ ٹاؤن کی جامع مسجد میں امامِ کعبہ کا حالیہ خطبہ بتاتا ہے کہ اسلام کے حوالے سے اس قسم کے تصورات سراسر غلط ہیں ۔ اسلام دینِ امن ہے ۔ اسلام اقلیتوں کو جائز حقوق دیتا ہے ۔ اسلام میں دہشت

گردی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام تو دہشت کی بیخ کنی کرنے کے لیے نازل ہوا۔ جو لوگ اسلام سے خائف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام اقلیتوں کو حقوق نہیں دیتا، وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ عیادت کے لیے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کو گھروں میں بہ نفس نفیس خود تشریف لے جایا کرتے تھے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام عورتوں کو حقوق نہیں دیتا، انھیں چاہیے کہ وہ عورت کے حوالے سے اسلام سے قبل کی تاریخ پڑھ لیں۔ صورت حال واضح ہو جائے گی۔

# ہیں تلخ بہت بندہِ مزدور کے اوقات

یکم مئی کو بہت گرمی تھی۔ درجہِ حرارت 43 ڈگری سینٹی گریڈ سے متجاوز تھا۔یہ مزدوروں اور محنت کشوں کا عالمی دن تھا۔ مگراس دن بھی ہم نے دیکھا کہ مزدور اور محنت کش طبقہ تو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھا، لیکن امیر طبقہ گھروں میں اے سی اور پنکھوں کے مزے لوٹ رہا تھا۔ بازار حسبِ معمول کھلے تھے۔سبزیوں اور پھلوں کے ٹھیلے لگے ہوئے تھے۔گلی کے نکڑ پر شدید گرمی سے بے نیاز بچوں کی چیزیں بیچنے والا محنت کش اپنے کام میں جتا ہوا تھا۔کھدائی کا کام کرنے والا مزدور پسینے میں شرابور تھا، مگر شدید گرمی میں بھی اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا۔عورتیں ،جو گھروں میں سلائی اور کڑھائی وغیرہ کا کام کرتی ہیں ،ان کی بھی کوئی چھٹی نہیں تھی۔سرکار نے تو چھٹی دے رکھی تھی، مگر کئی نجی ادارے کھلے ہوئے تھے اور وہاں کام کرنے والے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔

کہتے ہیں ، یہ دن مزدوروں کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔1760 ء میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا۔ صنعتی انقلاب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انسانی زندگی سہل سے سہل تر ہوتی گئی۔ مگر نقصان یہ ہوا کہ صنعت کاروں اور

سرمایہ داروں کی طرف سے محنت کش اور مزدور طبقے کا استحصال ہونے لگا۔ جس کی وجہ سے مزدوروں اور محنت کشوں کے دلوں میں امیر طبقے کے خلاف بغاوت پیدا ہونے لگی ۔ جو بالآخر یکم مئی کے سانحے پر منتج ہوئی۔ یکم مئی 1886 ء کو امریکا کے شہر شکاگو کی ہے مارکیٹ میں محنت کش اور مزدور طبقے نے احتجاج کیا۔ اس احتجاج کا مقصد یہ تھا کہ ان کے کام کا دورانیہ 14 گھنٹے سے کم کر کے 8 گھنٹے کیا جائے ۔ بعد ازاں مزدوروں کا یہ مطالبہ منظور تو ہو گیا، مگر اس کے لیے مزدوروں کو بہت قربانی دینی پڑی۔ 50 سے زائد مزدور جان سے گئے اور کئی زخمی ہوئے ۔ ریاستی جبر انھیں دبا نہ سکا۔ انھوں نے اپنا مطالبہ منوا کر ہی دم لیا۔ اس احتجاج میں 12 سو فیکٹریوں کے ساڑھے تین لاکھ سے زائد محنت کشوں اور مزدوروں کا حصہ تھا۔ اتنے بڑے اتحاد کے سامنے ریاست بھلا کیا کر سکتی ہے۔ آخر مجبوراً انھیں وہی کرنا پڑا، جو مزدوروں کی دلی خواہش تھی ۔

وطنِ عزیز میں مزدوروں اور محنت کشوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے ۔ سرکاری اداروں میں کام کرنے والا محنت کش طبقہ پھر بھی کچھ بہتر ہے۔ مگر نجی اداروں میں کام کرنے والوں کی حالت بہت ہی خراب ہے ۔ فیکٹریوں اور ملوں میں کام کرنے والوں کے اوقاتِ کار مقرر نہیں ہیں ۔ حکومت کی طرف سے ایک عام محنت کش کی تنخواہ 12 (ہزار روپے مقرر ہے۔ ( جو میری دانست میں کم ہے ۔

مگر پرائیویٹ اداروں میں کام کرنے والوں کی تنخواہیں شرم ناک حد تک کم ہیں۔ 7 سے 8 ہزار میں کیوں کر گھر چل سکتا ہے ؟جب مہنگائی بھی آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہو۔ ہر انسان کی طرح مزدور بھی چاہتا ہے کہ اس کا بچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ زرق.برق یونی فارم پہن کر اسکول جائے۔ مگر جب وہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہناتا ہے تو اسے بہت ہی زیادہ معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ نجی ادارے محنت کشوں کا خون تک چوس لیتے ہیں، حکومت کی طرف سے نج کاری کی بات ہو رہی ہے۔ ملک کے کئی منافع بخش اداروں کو نجی اور نیم سرکاری بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ میری دانست میں حکومت پھر بھی کچھ نہ کچھ خیال رکھتی ہے۔ مگر سرمایہ کار کو صرف اپنے منافع کا خیال ہوتا ہے۔ اسے مزدور اور محنت کش کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ ایسی صورت حال میں اگر سرکاری اداروں کو نجی بنا دیا جائے گا تو اس کا سب سے زیادہ نقصان محنت کش طبقے کا ہوگا۔ وہ بنیادی سہولتوں سے محروم ہو جائے گا۔

محنت کشوں کے عالمی دن پر پاکستان کے سیاست دانوں کی طرف سے مختلف بیانات سامنے آئے۔ پاکستان کے صدر ممنون حسین نے کہا کہ حکومت نے محنت کش طبقے کو با اختیار بنانے، یومیہ اجرت پر کام کرنے والوں کی ملازمت کو مستقل کرنے

سمیت مختلف عملی کام کیے ہیں۔ وزیرِ اعظم نواز شریف نے آجروں اور کارکنوں پر زور دیا کہ وہ ملک کی خوش حالی میں اپنا کردار ادا کریں۔چیئرمین سینیٹ میاں رضا ربانی نے کہا کہ دنیا بھر میں نج کاری کا عمل ناکام رہا ہے اور پاکستان میں بھی ناکام ہے۔ٹریڈ یونین تحریک اپنی تاریخ میں پہلے اتنی کم زور نہیں تھی، جتنی آج ہے۔مزدور صرف مزدور ہوتا ہے۔پاکستان میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام نہیں چل سکتا۔اب ایک عام آدمی اور محنت کش اپنی پٹیشن سینیٹ کو بھیج سکتا ہے۔امیر جماعتِ اسلامی سراج الحق نے کہا ہے کہ ملک میں نج کاری کے نام پر مکاری ہو رہی ہے۔ ہم حکومت کو پی آئی اے اور اسٹیل مل جیسے ادارے بیچ کر مزدور کشی نہیں کرنے دیں گے۔ ٹھیکیدار ی نظام کے نام پر ملک میں ہزاروں بیگار کھلے ہوئے ہیں، جن میں مزدوروں اور محنت کشوں کا مسلسل استحصال ہو رہا ہے۔کم از کم پنشن آٹھ ہزار مقرر کی جائے۔ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے کہا ہے کہ محنت کش طبقہ کسی بھی ملک میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔پاکستان میں بسنے والوں کی اکثریت محنت کش طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ہر سال عالمی سطح پر منایا جانے والا یومِ مزدور پاکستان سمیت دنیا بھر کے حکم رانوں کو مزدوروں، محنت کشوں اور ان کے اہلِ خانہ کو حقوق فراہم کرنے کے عزم کا اعادہ کرتا ہے، لیکن ہم اس دن کے اصل پیغام کو آج تک نہیں سمجھ سکے ہیں ۔جمعیت علمائے اسلام کے قائد مولانا فضل الرحمان نے کہا ہے کہ آج یکم مئی ہے۔یہ مزدوروں

کی جد و جہد کا دن ہے۔ ہم سرمایہ داری اور جاگیر داری کا خاتمہ چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ مزدوروں کو ان کے حقوق ملیں۔ عالمی یوم مزدور پر اور بھی بہت سے بیانات سامنے آئے۔ کالم کا دامن کم ہے۔ اس لیے اسی پر اکتفا کریں۔

یکم مئی ہر سال آتا ہے۔ اس دن حکم رانوں اور سیاست دانوں کی طرف سے مختلف بیانات دیے جاتے ہیں۔ لیکن کچھ نہیں بدلتا۔ سب کچھ وہی رہتا ہے۔ اب کے دیکھتے ہیں کہ تبدیلی آتی ہے یا نہیں۔ مزدوروں اور محنت کشوں کے دن سنورتے ہیں کہ نہیں۔ یا سب کچھ وہی رہے گا؟؟؟

# کراچی میں پانی کا مسئلہ

ان دنوں شہر قائد کے چند علاقوں میں پانی کا شدید بحران ہے۔ اس کی وجہ پمپنگ اسٹیشنوں میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہے۔ جمعرات کو خبر آئی کہ شہر میں پانی کی قلت 348 ملین گیلن ہو گئی۔ جس سے قلتِ آب کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ادھر وزیرِ اطلاعات و بلدیات کے الیکٹرک پر سخت برہم ہیں۔ انھوں نے کے الیکٹرک کی جانب سے عدالت کے واضح احکامات کے باوجود واٹر پمپنگ پر گھنٹوں لوڈ شیڈنگ کو کراچی کا امن و امان خراب کرنے کے مساوی قرار دیا۔ اس طرح انھوں نے سندھ اسمبلی میں بھی کے الیکٹرک کو کھری کھری سنائیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر کے الیکٹرک کے ذمہ داروں نے اپنا رویہ نہیں بدلا تو انھیں گرفتار کرکے جیل کی سلاخوں میں ڈالا جائے گا۔

مسئلہ پانی کا ہو یا بجلی کا۔ اس کے لیے سخت ترین اقدامات کی ضرورت ہے۔ ابھی رمضان المبارک کا مقدس مہینا نہیں آیا۔ ابھی سے ہی پانی اور بجلی کے مسائل شروع ہو گئے ہیں۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ شہر قائد کے عوام کو اگر پہلے صرف بجلی کا مسئلہ درپیش تھا تو اب پانی جیسی اہم بنیادی ضرورت

کا مسئلہ درپیش ہے۔ لوگوں نے شکایت کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ ہمیں صبح چار بجے اٹھ کر پانی بھرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ پھر سارا دن پانی نہیں آتا۔ لوگ پینے کا پانی خرید خرید کر پی رہے ہیں۔ لوگوں کو صاف پانی میسر نہیں ہے۔ ایک صاحب نے خوشی خوشی بتایا کہ آج کئی ہفتوں کے بعد وہ صاف ستھرے پانی سے نہائے۔ لوگ بدبودار پانی پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا زمانہ آگیا ہے کہ پانی بھی خرید خرید کر پیا جارہا ہے۔ کیا کبھی پہلے بھی ایسا ہوا تھا کہ اللہ کی اس انمول نعمت کو خریدا جائے۔ حکام کو چاہیے کہ وہ عوام کو بنیادی سہولتوں سے محروم نہ رکھے۔ سخت ترین گرمی میں اگر ایک انسان پانی اور بجلی دونوں سے محروم ہو تو کیا بنے گا۔ ہمارے ملک میں اکثریت غریب لوگوں کی ہے۔ امیر لوگ تو بجلی نہ ہونے کی صورت میں جنریٹر سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ پانی نہ ہونے کی صورت میں خرید کر پی سکتے ہیں، لیکن ان غریب لوگوں کا کیا ہوگا، جن کی کم زور معیشت میں جنریٹر خریدنے کی سکت نہیں۔ جن کی جیبوں میں پانی خریدنے کے لیے وافر مقدار میں پیسے نہیں۔

ماہرین باور کرارہے ہیں کہ 2020۔25 میں جنوبی ایشیا میں میٹھے پانی کا شدید بحران آنے کو ہے۔ جس سے یہاں کے باسیوں کی حیات کو شدید خطرات لاحق ہوں گے۔ یہ آبی بحران انسانی زندگی کے ساتھ دوسری مخلوقات کی زندگی کو بھی شدید متاثر کرے گا ۔ ماہرین کہتے ہیں کہ موسمی تغیرات کی وجہ سے جنوبی

ایشیا کے تمام گلیشیرز پگھل جائیں ۔ جس سے میٹھے پانی کا یہ جان لیوا بحران جنم لے گا۔ عقل مند لوگ وہ ہوتے ہیں، جو پہلے سے ہی کچھ بچا کر رکھیں ۔ وہ عقلمند نہیں جسے خطرات کا علم ہو، لیکن وہ پھر بھی چپ سادھے منتظرِ فردا ہو۔ اب اس بحران سے پہلے سے نمٹنے کا دو طریقے ہیں ۔ پہلا تو یہ ہے کہ سمندری پانی کو میٹھا بنانے کے اقدامات کیے جائیں ۔ مگر یہ ایک مہنگا طریقہ ہے ۔ اس کے لیے بہت زیادہ سرمایہ چاہیے ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ڈیمز بنائے جائیں ۔ دنیا بھر میں زیادہ تر ملک دوسرے طریقے کو ترجیح دے رہے ہیں ۔ کیوں کہ یہ ایک سستا ترین طریقہ ہے ۔ اس کے لیے زیادہ سرمائے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اب حالت یہ ہے کہ پڑوسی ملک انڈیا اور بنگلہ دیش ڈیمز پر ڈیمز بناتے جا رہے ہیں ۔ لیکن پاکستان کی طرف سے ایسے اقدامات بالکل نظر نہیں آ رہے ۔ میرے خیال میں سڑکوں اور پلوں سے زیادہ ڈیمز بنانے کی ضرورت ہے ۔

کہتے ہیں، مستقبل میں تیسری جنگ کی بڑی وجہ پانی کا مسئلہ ہوگا۔ اس بات میں کتنی حقیقت ہے، یہ تو اس وقت پتا چلے گا، جب ہماری یا ہماری آنے والی نسلوں کی آنکھیں تیسری جنگ کا مشاہدہ کریں گی ۔ مگر اسی پانی کے مسئلے کی وجہ سے جمعے کے روز سندھ اسمبلی کا درجۂ حرارت عروج پر تھا۔ ارکان کی طرف سے گرم گرم باتیں ہوئیں ۔ جس سے ایک طرف تو پانی کے بحران کی شدت کو جانچا جا سکتا ہے، جب کہ دوسری طرف ارکان کے غم اور غصے کا اندازہ بھی لگا

یا جا سکتا ہے۔ مختصراً اسمبلی میں ہونے والی باتیں لکھتا ہوں۔پانی کی شدید قلت کے حوالے سے متحدہ قومی موومنٹ کے رکن محمد حسین کی تحریک التوا پر بحث کرتے ہوئے ارکان نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کراچی کے واٹر بورڈ کو فوج یا رینجرز کے حوالے کر دیا جائے یا اس کی نج کاری کر دی جائے۔ کراچی میں پانی کے مسئلے پر فساد ہو سکتے ہیں۔ کراچی کے ڈھائی کروڑ عوام قلتِ آب کا شکار ہیں۔ وفاقی حکومت کھربوں روپے موٹر ویز اور دیگر منصوبوں پر خرچ کر رہی ہے۔ لیکن کراچی میں پانی کے منصوبے کے لیے رقم جاری نہیں کی جا رہی۔ کراچی میں پانی کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ لگائے جائیں۔آخر میں سندھ کے وزیرِ بلدیات و اطلاعات شرجیل انعام میمن نے اسمبلی کے ارکان کو بتایا کہ دھابیجی پمپنگ اسٹیشن کی گنجائش 550 ایم جی ڈی سے زیادہ نہیں۔ اس کی گنجائش مزید 65 ایم جی ڈی بڑھانے پر کام ہو رہا ہے۔ دعا کریں کہ بارش ہو جائے۔ اور حب ڈیم سے 100 ایم جی ڈی پانی ملنا شروع ہو جائے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری باتیں ہوئیں۔

کراچی کے غریب عوام پانی اور بجلی کے مسئلے کے حل کے لیے حکام کی جانب دیکھ رہے ہیں۔نہ جانے یہ مسائل کب حل ہوں گے !!

# صفورہ چوک کا سانحہ

جمعرات کو پھر ایک دل دہلا دینے والی خبر پڑھی۔ معلوم ہوا کہ میرے شہر کراچی کو پھر خون میں نہلا دیا گیا۔ بس کے اندر گھس کر ایک مخصوص کمیونٹی پر فائرنگ کی گئی۔ جس کے نتیجے میں 18 خواتین سمیت 45 جاں بحق ہو گئے۔ یہ اندوہ ناک سانحہ صفورہ چورنگی کے قریب پیش آیا۔ بد قسمت بس بدھ کی صبح ساڑھے 9 بجے الاظہر گارڈن سے عائشہ منزل جماعت خانے کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ مگر راستے میں ہی نشانہ بنا دی گئی۔ 55 مسافروں میں سے 45 اس جہاں سدھارے۔ داد دیجیے بس کے زخمی کنڈکٹر کو۔ وہ زخمی تھا۔ مگر پھر بھی ہمت کر کے اٹھا اور بس کو ایک نجی اسپتال تک لے گیا۔ بلا شبہ یہ کنڈیکٹر قابلِ تعریف ہے۔ پاکستانی قوم میں ایثار بہت ہے۔ جذبہ قربانی بھی بہت ہے۔ایسے مواقع پر یہ جذبہ مزید اپنے رنگ دکھاتا ہے۔ سیاست دانوں اور ہمارے رہنماؤں نے حسبِ معمول بیانات دیے۔ ملک کے نام ور سیاست دان اور عوام کے نمائندگان نے گرم گرم بیانات دیے۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ اب دہشت گردی کے خلاف سخت فیصلے کرنے ہوں گے۔ ہمارا دشمن پاکستان کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھنا چاہتا۔ کراچی آریشن کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

بلا شبہ اس سانحے نے سب کو اداس کر دیا۔ یہ سانحہ تھا ہی کچھ ایسا۔ میں نے بے گناہوں کے خون پر بے گانوں کو بھی روتا دیکھا ہے۔ ان 45 افراد کا بھلا کیا قصور تھا؟ یہ لوگ تو کسی قسم کی تخریب کاری میں ملوث بھی نہیں تھے۔ یہ اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے۔ ان کا کسی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ تحریکِ پاکستان میں اس کمیونٹی کا بڑی خدمات ہیں۔ کیوں کہ پاکستان کا قیام آل انڈیا مسلم لیگ کے مرہونِ منت ہے۔ آزادی سے پہلے مسلم لیگ مسلمانوں کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت تھی۔ 1906ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو سر آغا خان سوم کو اس جماعت کا پہلا صدر بنایا گیا۔ ایسے لوگوں کو قتل کر کے نہ جانے کیا بتانے کی کوشش کی گئی۔

ہمارے ہاں تخریب کاری کے ہر واقعے کے بعد افواہوں اور الزامات کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے واقعات کے بعد بڑے لوگ پیشین گوئیاں شروع کر دیتے ہیں۔ جب کہ چھوٹے اور جذباتی لوگ اپنے مخالف پر الزامات لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ جس سے نفرتیں اور آپس کا تفاوت مزید پروان چڑھتا ہے۔ ہم بکھرے ہوئے اور منتشر لوگ ہیں۔ ایسے حادثات ایک طرف ہمیں غمگین کر دیتے ہیں تو دوسری طرف ہمیں مزید منتشر کر دیتے ہیں۔ جب صفورہ چوک کا سانحہ پیش آیا تو اس وقت بھی ہم نے بغیر تفتیش و تحقیق کے الزام

بازی شروع کر دی۔ اس ضمن میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو بھی اس انسانیت کش سانحے میں ملوث ہے، اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔ عوام بیان بازی سے گریز کرے۔ تحقیق و تفتیش جن کا کام ہے، وہی کریں۔ عوام خبریں پڑھیں، نیوز دیکھیں اور ملک کی سلامتی کے لیے دعا کریں۔

نیشنل ایکشن پلان ترتیب دیا جا چکا ہے۔ ملوث لوگوں کے خلاف کارروائیاں زور و شور سے جاری و ساری ہیں۔ کراچی آپریشن بھی نقطۂ عروج پر ہے۔ گینگ وار اور بھتہ خوروں کو سختی سے کچلا جا رہا ہے۔ حساس علاقوں میں پولیس کیا، رینجرز بھی تعینات ہے۔ اس کے باوجود سانحہ صفورہ جیسے حادثات وقوع پذیر ہوں تو اسے کیا کہیں۔ جب سب کچھ جاری و ساری ہے تو پھر ایسے واقعات کیوں کر ہو رہے ہیں۔ جب اتنی محنت کی جا رہی ہے تو ایسے واقعات نہیں ہونے چاہییں۔ آخر بے گناہوں کا خون کب تک بہتا رہے گا۔ سکیورٹی اداروں کی محنتِ شاقہ کے باوجود یہ سلسلہ کیوں نہیں تھم رہا۔ کراچی میں ایک بار پھر ٹارگٹ کلنگ شروع ہو چکی ہے۔ سبین محمود کے بعد یاسر رضوی بھی ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بن چکے ہیں۔ اس شہر بے اماں میں اہلِ علم کی بھی کوئی قدر و وقعت نہیں۔ انھیں بھی شہید کر دیا جاتا ہے۔ مگر حیرت اس بات کی ہے کہ یہ سب کچھ اس دوران جاری و ساری ہے، جب کہ کراچی میں وفاق کی طرف سے آپریشن بھی کئی مہینوں سے جاری ہے۔ کراچی کے امن و امان کے حوالے سے ہمارے سکیورٹی اداروں

کی محنت اور کوشش قابلِ تعریف ہے۔ کئی کرمنلز مارے جا چکے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کراچی کے لوگ ذرا دیر سے خوش ہوتے ہیں۔ یہ اس دن خوش ہوں گے جب کراچی کی ٹارگٹ کلنگ مکمل طور پر رک جائے گی۔ سانحہ صفورہ چوک جیسے واقعات کا امکان بھی نہیں ہوگا۔ حکمتِ عملی اور پلان کی بھی سخت ضرورت ہے۔ یہ بھی دیکھنا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کچھ لوگ، جو تخریب کاری میں ملوث ہیں، ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ اور خطرناک بات ہے۔ جس کا ازالہ ضروری ہے۔ ظالم کو بلا امتیاز نشانہ بننے سے ہی انصاف کا بول بالا اور ظلم کی حوصلہ شکنی ہو سکتی ہے۔

میری نگاہِ منتظر ایک پرامن کراچی دیکھنے کے لیے ترس رہی ہے۔ ایک ایسا کراچی، جہاں امن ہو، سکون ہو۔ جہاں اہلِ علم اور بے ضرر لوگوں کی قدر ہو۔ جہاں ٹارگٹ کلنگ کیا، بھتہ خوری بھی نہ ہو اور ہر ایک خوش ہو۔

## مصر میں جمہوریت کا خون

فی الحقیقت مصر میں جمہوریت کا خون ہو گیا۔ مصر کی ایک عدالت نے سابق صدر محمد مرسی سمیت 106 افراد کو سزائے موت سنا دی۔ ان پر 2011ء میں حسنی مبارک کے خلاف عوامی بغاوت کے دوران جیل توڑنے کا الزام ہے۔ کہا یہ بھی جا رہا ہے کہ انھوں نے حماس، حزب اللہ اور مقامی جنگجوؤں کے ساتھ مل کر یہ قدم اٹھایا تھا۔ جس کے نتیجے میں محمد مرسی سمیت اخوان کے 34 افراد فرار ہونے میں کام یاب ہو گئے تھے۔ اس سے قبل محمد مرسی کو 20 برس قید کی سزا سنائی گئی تھی۔

مصر میں ایک جمہوری حکومت کا گرنا اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ ایک جمہوری صدر کو سزائے موت دینے کا فیصلہ سنانا۔۔۔ پھر اسی پر اکتفا نہ ہو، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ 100 سے زائد لوگوں کو تختہ دار پر چڑھانے کی "نوید" سنانا ایک نہایت افسوس ناک عمل ہے، جس کی جتنی مذمت کی جائے، کم ہے۔ واضح رہے کہ ان 100 سے زائد افراد میں علامہ یوسف القرضاوی بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے علامہ یوسف القرضاوی کو پڑھا ہوگا، وہ ان کے علمی تعمق سے بہ خوبی آگاہ ہوں گے۔ علامہ صاحب دنیائے اسلام کے ایک بہت بڑے عالم ہیں۔ مصر کی جس

عدالت نے علامہ صاحب جیسی علمی شخصیت کو بھی سزائے موت سنائی ہے، اس کو یہ بات سوچنی چاہیے کہ ایک عالم کی موت سارے عالم کی موت ہوتی ہے۔ ان کی سزائے موت سے پورے عالمِ اسلام کو نا قابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ اور اس کا ذمہ دار کوئی اور نہیں، مصر کی حکومت اور اس کی عدالتیں ہوں گی۔

مصر کے سابق صدر ڈاکٹر محمد مرسی کی سزائے موت پر دنیا بھر کی سر برآوردہ شخصیات کے ساتھ ساتھ پاکستان کے سیاست دانوں نے بھی مذمت کا اظہار کیا۔ جرمنی کے وزیرِ خارجہ فرانک والٹر نے کہا کہ یہ ایک سنگین سزا ہے اور ہمیں اس کی مذمت کرنی چاہیے۔ انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے سابق صدر کی سزا کو افسوس ناک قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس عمل سے کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ پس پردہ سابق مصری صدر کی سزائے موت کے پیچھے امریکا کا ہاتھ ہو یا نہ ہو، لیکن امریکا کے محکمہ خارجہ نے بھی مصری عدالت کے اس فیصلے پر اظہارِ تدمیم کرتے ہوئے کہا کہ سابق مصری صدر کی سزا انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ عدالت نے انصاف کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر سزائے موت کا فیصلہ سنایا ہے۔ ہمیں اس پر شدید تحفظات ہیں۔ مصر کے سابق صدر اور ان کے ہم نواؤں کی سزا کے خلاف ترکی کے صدر رجب طیب ایردوان نے اب تک کا سب سے بڑا قدم اٹھایا۔ ان کا بیان بھی سب سے زیادہ جارحانہ ہے۔ انھوں نے مصری صدر اور ان کی جماعت کے ساتھیوں کی سزا کے خلاف صدائے احتجاج

بلند کرتے ہوئے کہا کہ مصری صدر یعنی عبد الفتاح السیسی فرعونوں کے زمانے میں واپس جا رہے ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے استنبول میں مصری صدر کے حق میں ایک بھرپور مظاہرہ بھی کیا۔ جس میں لاکھوں افراد نے شرکت کی ۔

سابق مصری صدر اور ان کے ہم نواؤں کی سزا کے خلاف سعودی عرب کا کوئی اقدام نظر نہیں آرہا۔ یہ اس مسئلے کا سب سے افسوس ناک پہلو ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک طرف سعودی عرب حوثی باغیوں کا کچومر نکال رہا ہے۔ دنیا کو اس کا یہ جواز فراہم کر رہا ہے کہ حوثی باغیوں نے یمن کی جمہوریت پر شب خون مارا۔ اس لیے ان کی بیخ کنی از حد ضروری ہے۔ لیکن مصر میں جس طرح جمہوریت پر شب خون مارا گیا، اس پر سعودی عرب کی طرف سے کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی گئی ۔ یہاں تک کہ ایک سنگل پٹی کی خبر بھی اب تک میری نظر سے نہیں گزری۔ مجھے مصر کے ضمن میں سعودی پالیسیوں سے سخت اختلاف ہے۔ سعودی عرب کو چاہیے کہ وہ عبد الفتاح السیسی کے اس فیصلے کی نہ صرف مذمت کرے، بلکہ اسے اس اقدام سے باز رکھے۔ کیوں کہ صحیح معنوں میں سعودی عرب ہی مصر کو اس گھناؤنے اقدام سے باز رکھنے کا حوصلہ اور قوت رکھتا ہے۔

عالم اسلام پر نظر دوڑائی جائے تو ہمیں احیائے اسلام کے لیے کوشاں دو اقسام کی تنظیمیں نظر آتی ہیں۔ ایک وہ ہیں، جو مسلح جدوجہد کے قائل ہیں۔ یہ

مزاحمتی لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اب احیائے اسلام بہ زورِ طاقت ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے اگر اپنوں کا لہو بہے تو سو فی صد جائز ہے۔ اسلام کو بہ زورِ طاقت نافذ کرنے والوں میں سب سے نمایاں تنظیم القاعدہ ہے۔ پھر داعش، الشباب، بوکوحرام وغیرہ ہیں۔ 11/9 سے پہلے ہم صرف القاعدہ سے واقف تھے۔ 11/9 کے بعد امریکا کے سخت پالیسیوں کی بہ دولت اب کئی مسلح تنظیموں کا ظہور ہو چکا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں، جو اسلام تو چاہتے ہیں، مگر اس کے لیے مسلح جدوجہد کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ جمہوری اور دوسرے مروجہ طریقوں سے اسلام کا احیا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی تنظیموں میں سے ایک اخوان المسلمون بھی ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس نوعیت کے لوگ غیروں سے زیادہ اپنوں کے زخم خوردہ ہیں۔ اس کے لیے بنگلہ دیش میں ہونے والی پھانسیوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں جماعتِ اسلامی زیرِ عتاب ہے۔ اب اگر اسلام کو جمہوری اور مروجہ طریقوں سے نافذ کرنے والوں کو اسی طرح کچلا جانے لگا تو خطرہ ہے کہ یہ لوگ مسلح جدوجہد شروع نہ کر دیں۔ اور پہلی قسم کے لوگوں کے ساتھ نہ مل جائیں۔ اگر انھوں نے بھی مسلح جدوجہد شروع کر دی تو پہلی قسم کے لوگوں کو مزید تقویت ملے گی۔ اور وہ پورے عالمِ اسلام کے لیے ایک مستقل خطرہ بن جائیں گے۔ پھر ان سے نمٹنا بہت مشکل ہی نہیں، نا ممکن ہو جائے گا۔ اس کا خمیازہ ان سب مسلم حکومتوں کو بھگتنا پڑے گا، جو اس وقت مصر میں ہونے والے ظلم پر خاموش بیٹھی ہیں۔ سعودی عرب

کو بھی اس ضمن میں ضرور سوچنا چاہیے۔

# بھولے بسرے مسلمان

جمعۃ المبارک کے بابرکت دن خبر آئی کہ بلوچستان کے ضلع مستونگ میں پہلے تین بسوں کے مسافروں کو اغوا کر لیا گیا اور پھر شناخت کے بعد بیس افراد کو شہید کر دیا گیا۔ اسی بابرکت دن کو سعودی عرب کے شہر دمام میں مسجد کے باہر خود کش دھماکا ہوا، جس سے چار افراد شہید ہو گئے۔ واضح رہے کہ سعودی عرب میں یہ دوسرا بم دھماکا ہے۔ یعنی اب سعودی عرب بھی دہشت گردی سے محفوظ نہیں رہا۔ رب تعالیٰ رحم کرے۔

ان دونوں موضوعات پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور لکھا جائے گا۔ لیکن دنیائے انسانیت ایک ایسا المناک مسئلہ بھی ہے، جس پر بہت کم لکھا گیا۔ اور وہ مسئلہ ہے، روہنگیا مسلمانوں کا۔ بے شک وہ بھولے بسرے مسلمان ہیں، ہم انھیں فراموش کر چکے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے اپنے اتنے سارے مسائل ہیں۔ ہم کیوں کر انھیں یاد رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اتنی بڑی فراموشی ۔۔۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ میں نے "بھولے بسرے مسلمان" کی اصطلاح "ٹائم" کے جیمز ناچٹوے سے مستعار لی ہے۔ ٹائم کے یہ صحافی روہنگیا مسلمانوں کے "بھولے ہوئے" مسلمان قرار دیتے ہیں۔ یہ صحافی لکھتے ہیں کہ آج سے پانچ سال پہلے جب

وہ پہلی بار میانمار کے ایک قصبے میں گئے تو انھوں نے دیکھا کہ راکھائن بدھسٹ مسلمان ماہی گیروں کو سبزیاں بیچ رہے ہیں۔ انھوں نے اس بات کا مشاہدہ بھی کیا کہ وہاں بودھ پنڈتوں اور مسلمان علماء کے درمیان زبردست ہم آہنگی ہے۔ دونوں مذاہب کے ان اہم لوگوں نے انھیں دعائیں دیں۔ دونوں مذاہب کے یہ بڑے لوگ انھیں ظالم اور جابر "جنتا" کے خلاف نظر آئے۔ لیکن ان دنوں کیا ہو رہا ہے؟اس کے لیے جیمز نیچٹوے کی اصل عبارت کا ترجمہ ملحوظ ہو: "وہاں (یعنی اسی قصبے میں) مجھے مارکیٹ میں مسلمان نظر نہیں آتے۔ ان کو مسجدوں پر بلڈوزر چلا دیا گیا۔ اس کے باوجود 2012ء کے بعد مجھے وہاں کے ایک سرکاری اہل کار نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا کہ کوئی "چیز تباہ نہیں کی گئی، کوئی بھی نہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ میانمار کی حکومت اور وہاں کے عوام سمجھتے ہیں روہنگیا مسلمان وہاں کے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ بنگلہ دیش سے آئے ہوئے مسلمان ہیں۔ اس لیے انھیں میانمار چھوڑ دینا چاہیے۔ ان کے لیے میانمار میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ جہاں سے آئے ہیں، وہیں چلے جائیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ مسلمان میانمار میں کئی صدیوں سے رہ رہے ہیں۔ اب اچانک انھیں وہاں سے بے دخل کرنے کے لیے ان پر ظلم و تشدد کرنا۔۔ ان کے لیے ظالمانہ قوانین بنانا، تاکہ وہ تنگ آ کر میانمار چھوڑ دیں اور انھیں کیمپوں کی اذیت ناک زندگی

گزارنے پر مجبور کرنا۔۔۔بڑی افسوس ناک اور قابلِ گرفت حرکت ہے۔اقوامِ متحدہ ان مسلمانوں کو دنیا کی سب سے زیادہ مظلوم قوموں میں سے ایک قوم قرار دے کر راہ فرار اختیار کر چکا ہے۔اور مسلمانوں نے اپنے ان بھائیوں کے لیے کیا کیا، اس کے لیے درج ذیل پیرا ملحوظ ہو۔

"اس سال کے پہلے تین ماہ میں تقریبا پچیس ہزار افراد، جن میں زیادہ تر میانمار کے اقلیتی روہنگیا مسلمان تھے، انھوں نے ایک بہتر زندگی کی تلاش میں خلیجِ بنگال سے ایک کشتی کے ذریعے رختِ سفر باندھا۔لیکن ان کا خواب شرمندہِ تعبیر نہ ہوا۔الٹا وہ بے رحم اسمگلروں اور سنگ دل حکومتوں کے بدترین مظالم کا نشانہ بن گئے۔اقوامِ متحدہ کے مطابق ان میں سے کم از کم 300 افراد بھوک، پانی کی کمی اور تشدد کی وجہ سے مت کے منھ میں چلے گئے۔اور 6 ہزار سے 20 ہزار لوگ اس وقت سمندر میں بھٹک رہے ہیں۔کیوں کہ انھیں تھائی لینڈ، ملائشیا اور انڈونیشیا نے اپنی اپنی سمندری حدود سے باہر بھگایا ہے۔"

یہ الفاظ فنانشیل ٹائمز کے ایک اداریہ کے ہیں۔یعنی ایک طرف سمندر کی بے رحم موجیں ہیں، دوسری طرف اپنے لوگوں کی بے حسی ہے۔تھائی لینڈ کو چھوڑیے۔ملائشیا اور انڈونیشیا تو مسلم ممالک ہیں۔ان کو کیا ہو گیا ہے۔شاید یہ

وطن پرستی اور اس قوم پرستی کا شاخسانہ ہے، جو کہ قوم کو وطن سے ملاتی ہیں۔ یعنی اگر کوئی انڈونیشیائی اور ملیشیائی سمندر کی بے رحم موجوں کی نذر ہو رہا ہو تو اس بچایا جائے۔ باقی لوگوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ اس ضمن میں دیگر اسلامی ممالک کا کردار بھی کچھ زیادہ قابلِ ستائش نہیں ہے۔ کیوں کہ کوئی مسلمان ملک عالمی فورم پر ان بد نصیب مسلمانوں کے حق میں بولنے کے لیے تیار نہیں۔ نہ کوئی ایشیائی ملک، نہ کوئی عربی ملک اور نہ ہی کوئی افریقی ملک۔ حالاں کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات بتاتی ہیں کہ مسلمان ایک جس کے مانند ہوتے ہیں، اگر جسم کے کسی ایک حصے کو تکلیف ہو تو سارا جسم اس درد کی کسک کو محسوس کرتا ہے، اور بے تاب ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم کیسے مسلمان ہیں کہ ان بھائیوں کی تکلیف پر ذرا پریشان نہیں ہوتے۔ اور ان کے حق میں آواز اٹھانے سے بھی عار محسوس کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ فعل بہت برا ہے۔ جس کا ازالہ از حد ضروری ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ میانمار کے اقلیتی روہنگیا مسلمانوں کے مسئلے کو عالمی فورم پر اٹھایا جائے۔ کم زور آواز سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ مسئلہ اس وقت حل ہوتا ہے، جب آواز بلند بھی ہو اور اس آواز کو بلند کرنے والے بھی بہت سارے ہوں۔ میانمار کے مسلمانوں کا مسئلہ بھی اس وقت حل ہوگا، جب بہت سے مسلمان ایک ساتھ آواز بلند کریں گے

# مسلم دنیا کا ایک دکھتا ناسور

3 مارچ، 1924 ء ۔۔ یہ وہ دن ہے، جس دن ترکی میں خلافت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ۔ خلافت کے خاتمے میں اپنوں اور غیروں، دونوں کا ہاتھ تھا۔ خلافت متحرک نہیں تھی ۔ خلافت کے جسم میں وہ طاقت ختم ہو گئی تھی، جو مسلمانانِ عالم کے مسائل حل کر سکتی ہو۔ ترکی میں قائم خلافت سے کوئی خوش نہیں تھا۔ انگریز بر صغیر پر چڑھ دوڑے ۔ وہاں کی بادشاہت ٹکڑے ٹکڑے کر دی ۔ مظالم کی انتہا کر دی ۔ مگر ترکی میں صدیوں سے قائم خلافت مسلمانانِ برصغیر کے لیے کچھ کام نہ آئی ۔ دوسری طرف عرب بھی ترکی خلافت سے سخت نالاں تھا۔ انھوں نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکی کے خلاف بغاوت کر دی۔

خلافت کے تابوت میں آخری کیل مصطفٰی کمال اتاترک نے ٹھونکی ۔ میں برملا اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ اگر ترکی کو کمال اتاترک جیسا لیڈر نہ ملتا تو ترکی بھی اقوامِ غیر کے دام میں گرفتار ہو جاتا۔ مصطفٰی کمال اتاترک کی اپنی قوم کے لیے خدمات قابلِ تعریف ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم کی اس وقت مسیحائی کی، جب قوم مہلک بیماریوں سے چور ہو کر قریبِ مرگ تھی ۔ مگر ان کی اصلاحات آج تک مجھ ایسے لوگوں کو کھٹکتی ہیں ۔ انھوں نے اپنے دور میں علماء

اور درویشوں پر قدغنیں لگائیں۔ ترکی ٹوپی اور پردے کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ ان کے دور میں سرکاری افسروں کے ساتھ ساتھ مذہبی رہنماؤں کے لیے بھی حکومت کا مقرر کردہ لباس پہننا انتہائی ضروری تھا۔ انھوں نے جمعۃ المبارک کی بہ جائے اتوار کو سرکاری چھٹی کا دن منانے کا حکم صادر کیا۔ ان کے دور میں ترکی کا رسم الخط تبدیل کر دیا گیا۔ ترکی کا رسم الخط کمال اتاترک کی اصلاحات سے پہلے عربی طرز کا تھا۔ پھر اس کو لاطینی طرز پر ڈھال دیا گیا۔ یہاں تک کہ کئی شہروں کے نام بھی تبدیل کر دیے گئے۔ مثلاً قسطنطنیہ کا نام استنبول رکھ دیا گیا۔ اور سب سے افسوس ناک اور قابلِ حیرت قدم یہ اٹھایا گیا کہ مسجدوں اور دیگر مذہبی اداروں میں عربی پر پابندی عائد کر دی گئ۔ کمال اتاترک کی ان اصلاحات کے پیچھے جدیدیت پسندی اور قوم پرستی کا جذبہ کارفرما تھا۔

خلافت کے خاتمے کا ایک نقصان یہ ہوا کہ سیکولر اور اسلام پسند لوگ ایک دوسرے کے مد مقابل آ گئے۔ کمال اتاترک کی اصلاحات سے مسلمانوں میں سیکولرازم کی ابتدا ہوئی ۔ لادینیت بڑھتی گئی اور اسلامیت کم ہوتی گئی۔ اس صورت میں اسلام پسند لوگوں کا ابھر کر سامنے آ جانا ایک فطری عمل تھا۔ خلافت کے کچھ عرصے بعد 1928ء میں مصر میں اسماعیلیہ کے مقام پر ایک اسلام پسند تحریک " اخوان المسلمون " کی ابتدا ہوئی۔ جب اخوان نے جنم لیا تو اس وقت

مصر میں کوئی اسلامی حکومت نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد مسلم دنیا میں خطرناک قسم کی قوم پرستی نے جنم لیا۔ ہر ملک کے اپنے اپنے مفادات تھے۔ عرب کے لوگ ترکوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور ترک عربوں سے شدید نفرت کرتے تھے۔ کمال اتاترک کی اصلاحات نے مسلم دنیا میں سیکولرازم کو بڑھاوا دیا۔ رفتہ رفتہ اسلام پسند لوگوں نے محسوس کیا کہ محض دعوت و تبلیغ سے فضا بدلنے والی نہیں ہے۔ اس کے لے سیاست میں آنا ضروری ہے۔ میں یہاں صرف مصر کا ذکر کروں گا۔ مصر میں جب حکومت نے دیکھا کہ اخوان سیاست کی طرف بڑھ رہی ہے تو انھوں نے اسلام پسندوں کو دبانے کے لیے تشدد کا راستہ اپنایا۔ 1949ء میں اخوان المسلمون کے بانی حسن البناء کو شہید کر دیا گیا۔ 29 اگست 1966ء کو ایک اور اخوانی اور مفسرِ قرآن سید قطب کو پھانسی دے دی گئی۔ 1964ء میں سیدات و مسلمات کی بانی زینب الغزالی کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ انھیں جیل میں کئی طرح کے مظالم برداشت کرنے پڑے۔ انھیں 25 سال قیدِ بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ لیکن 1971ء میں انھیں رہا کر دیا گیا۔

جب اسلام پسندوں پر ظلم و تشدد ہونے لگا تو انھوں نے بھی حصولِ حکومت اور نفاذِ اسلام کے لیے تشدد کا راستہ اپنایا۔ یوں دونوں طرف سے تیر و تفنگ

چلنے لگے اور مسلم دنیا اپنوں کے ہاتھوں لہو لہان ہونے لگی۔ اب حال یہ ہے کہ مارنے والا بھی مسلمان ہے اور مرنے والا بھی مسلمان ہے۔ اس وقت مسلم دنیا میں 206 اسلامی تحریکیں ہیں۔ یہ سب کی سب اسلام کا حقیقی احیاء چاہتی ہیں۔ مسلم دنیا کا بہ نظر غائر مشاہد کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر حکومتیں سیکولر ہیں۔ یہ بات ان 206 اسلامی تحریکوں کو کھٹکتی ہیں۔ بالکل اسی طرح، جس طرح یہ 206 تحریکیں سیکولر حکومتوں اور لوگوں کو کھٹکتی ہیں۔ اسلامی تحریکیں چاہتی ہیں کہ چین کے ساحل سے لے کرتا بہ خاکِ کاشغر۔۔۔اسلام کا عملی نفاذ ہو جائے۔ جب کہ سیکولر لوگ انھیں پنپنے نہیں دیتے۔ یوں مسلم دنیا ایک جان لیوا تناؤ کا شکار ہے۔

بلا شبہ سیکولر ازم کے حامیوں اور اسلام پسندوں کے درمیان بپا مستقل محاذ آرائی روز بروز خطرناک سے خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ بلاشبہہ یہ مسلم دنیا کا ایک دکھتا ناسور ہے۔ سیکولر لوگ اسلام پسندوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ اور اسلام پسند سیکولر لوگوں کے منھ لگنا پسند نہیں کرتے۔ یہ امر بہت خطرناک ہے۔ کیوں کہ اس طرح مسلمان اپنا نقصان اپنے ہاتھوں سے کر رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اصلاح پسند لوگ ان دونوں طبقوں کے لوگوں کو قریب لے آنے کی کوشش کریں۔ اگرچہ یہ بہت مشکل کام ہے، کیوں کہ جان کے دشمنوں کو دوست بنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

## " بنگلہ دیش کا قیام ہر بھارتی کی خواہش تھی"

اگر آپ کے سامنے کوئی اس بات کا اعتراف کرلے کہ آپ کے وطن کو برسوں پہلے دو لخت کرنے میں ہمارا ہاتھ تھا تو آپ کو یقینا بہت دکھ ہوگا۔ حب الوطنی اسی کا نام ہے۔ پھر اگر یہ بات کرنے والا کوئی عام شخص نہیں بلکہ ایک پورے اسٹیٹ کا وزیرِ اعظم ہو تو آپ اور زیادہ تاسف کا اظہار کریں گے۔ افسوس کے ساتھ ساتھ آپ کو غصہ بھی آئے گا۔ یعنی آپ غم اور غصے دونوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اسی کیفیت سے دوچار اس وقت ہمارے ملک کے باشندے ہیں۔ بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی کے پاکستان مخالف بیان کے بعد پاکستان کے عام اور خاص دونوں طبقے کے لوگ بہت زیادہ غم اور غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ اب بھارت پر حملے کی باتیں بھی ہونے لگی ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح بھارت کے وزیرِ اعظم نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر پاکستان کو دولخت کرنے کا اعتراف کیا ہے، بالکل اسی طرح پاکستان کے وزیرِ اعظم کو بھی دوٹوک بات کرنی چاہیے۔ انھیں کسی طرح کی مصلحت کا شکار نہیں ہونا چاہیے ۔دوسرے الفاظ میں وزیرِ اعظم کا مصلحت سے عاری اور جذباتی ردِ عمل فی الواقع عوام کا حقیقی ترجمانی ہوگی۔

7 جون 2015 ء بروز اتوار کو بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی نے بنگلہ دیش کی ڈھاکا یونی ورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بنگلہ دیش کا قیام ہر بھارتی کی خواب تھا۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے 90 ہزار جنگی قیدی بھارت کے پاس تھے۔ اگر ہمارا 1971 شیطانی ذہن ہوتا تو پتا نہیں ہم کیا کرتے۔ بنگلہ دیشی وزیرِ اعظم اور ان کی سوچ ایک ہی ہے۔ " لبریشن وار آنر " ایوارڈ وصول کرنے کی تقریب میں نریندر مودی نے کہا کہ جب بنگلہ دیش کی آزادی کی لڑائی لڑنے والے بنگلہ دیشی اپنا خون بہا رہے تھے تو بھارتی بھی ان کے کاندھے سے کاندھا ملا کر جدو جہد کر رہے تھے۔ اس طرح انھوں نے بنگلہ دیش کا خواب پورا کرنے میں مدد کی۔ 1971 ء میں جب بنگلہ دیش کے قیام کی لڑائی لڑنے والوں کی حمایت میں دہلی میں تحریک چلی تھی تو وہ بھی اس میں شریک ہوئے تھے۔ اسی طرح وزیر اعظم نے اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ ان کی فوج مکتی باہنی کے ساتھ مل کر لڑی۔

اب آپ ہی بتائیں ، کیا ان الفاظ سے لگتا ہے کہ یہ کسی مصالحت پسند شخص کے الفاظ ہیں۔ بنگلہ دیش کے قیام کو 44 سال گزر گئے۔ 44 سال گزرنے کے بعد اس زخم کو ہرا کرنے کا کیا جواز ہے۔ 44 سال کے بعد بھارت کے سابق وزیرِ اعظم اٹل بہاری واجپائی کو ان کی 6 دسمبر 1971ء کی تقریر پر ، جو انھوں بنگلہ دیش کے حق میں پارلیمنٹ میں کی تھی ، "بنگلہ دیش وار آنر" کا اعزاز دینے کی کیا

وجوہات ہیں۔ نریندر مودی نے درج بالا اعترافات کرکے گویا پاکستان کو یہ باور کران کی کوشش کی کہ جس طرح 44 سال پہلے بھارت نے پاکستان کو دولخت کیا تھا، 44 سال بعد بھی بھی بھارت اتنی "ہمت" اور "صلاحیت" رکھتا ہے کہ پاکستان کے مزید ٹکڑے کرے۔پہلی کسی حد تک میں بلوچستان میں بھارتی مداخلت کے سلسلے میں گومگو کا شکار تھا۔ اب تو یقین ہوگیا ہے کہ بھارت بلوچستان میں مداخلت کرکے پاکستان کو توڑنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ بچپن سے یہ بات سنتا اور پڑھتا ہوا آرہا ہوں کہ بھارت نے پاکستان کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔اس سلسلے میں بھی میں شش وپنج کا شکار تھا۔ مگر اب بھارتی وزیرِ اعظم کا بیان پڑھ کر یہ شش وپنج بھی دور ہوگیا۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد سے بھارت کی سابقہ وزیرِ اعظم اندراگاندھی کے دو باتیں مسلسل پڑھنے کو ملتی ہیں۔ایک یہ کہ ہم نے مسلمانوں سے ایک ہزار برس کی غلامی کا بدلہ لے لیاہے۔دوسری بات یہ تھی کہ ہم نے نظریہ پاکستان کو کو بحیرہِ عرب میں پھینک دیا ہے۔ شروع شروع میں، میں اسے حافظ محمد سعید جیسے لوگوں کے جذباتی خیالات سے تعبیر کرتا تھا۔ مگر بھارتی وزیرِ اعظم کے حالیہ اعتراف سے یہ بات بھی واضح ہو گئی اور اب میں اس بات کو بالکل سچ سمجھتا ہوں۔ اندراگاندھی نے ایسا ضرور کہا ہوگا۔

بھارتی وزیرِ اعظم کے اس بیان پر پاکستان کے ردِ عمل کا آنا ناگزیر تھا۔

پاک فوج نے کھل کر کہہ دیا کہ بھارت کو جارحیت کا منھ توڑ جواب ملے گا۔ آرمی چیف جنرل راحیل شریف کی زیرِ صدارت فارمیشن کمانڈروں کی کانفرنس میں بھارت کی طرف سے حالیہ جارحانہ بیانات بہ شمول پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی ظاہری اور در پردہ کارروائیوں کا سخت نوٹس لیتے ہوئے اس بات پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا گیا بھارتی سیاست دان نہ صرف ایسے اقدامات میں ملوث رہے، جو اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی ہے، بلکہ وہ دیگر ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔ عسکری قیادت نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ بھارتی عزائم کو شکستِ فاش دی جائے گی اور پاکستان کی علاقائی سالمیت کا ہر قیمت پر دفاع کیا جائے گا۔

وزیرِ اعظم نواز شریف نے کہا کہ بھارتی قیادت کے غیر ذمہ دارانہ بیانات سے مفاہمت کی فضا متاثر ہوئی۔ ایسے بیانات سے ماحول کشیدہ ہوگا۔ بھارتی طرزِ عمل ہمیں علاقائی امن واستحکام کے مقصد سے دور کرے گا۔ ہم سایوں سے پر امن تعلقات چاہتے ہیں۔ امن کی خواہش یک طرفہ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح سینیٹ اور قومی اسمبلی نے بھارتی قیادت کے حالیہ بیانات پر دو الگ الگ متفقہ قرار دادیں منظور کرتے ہوئے انھیں نا قابلِ برداشت قرار دیا ہے اور عالمی برادری سے ان کا نوٹس لینے کے لیے کہا ہے۔

پاکستان کے دفتر خارجہ نے بھی بھارتی بیانات کی بھرپور مذمت کی ہے۔ میں یہاں بار بار "بیانات" کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی کے ساتھ ساتھ بھارت کے کئی دیگر

اعلیٰ حکام نے بھی پاکستان کے بارے میں " گل افشانی " کی ہے۔

بعض لوگ سمجھ رہے تھے کہ ہمارے وزیرِ اعظم بھی بھارتی وزیرِ اعظم کی طرح بیان بازی کریں گے۔ بعض لوگ تو وزیرِ اعظم سے نالاں ہیں کہ انھوں نے مفاہمت اور مصالحت پر مبنی بیانات کا سلسلہ کیوں شروع کر رکھا ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں وزیرِ اعظم کے بیانات کو بالکل صحیح سمجھتا ہوں۔ ہمارے وزیرِ اعظم کے بیانات ایک " ذمہ دار" ریاست کے " ذمہ دار" وزیرِ اعظم کے بیانات ہیں۔ جب کہ بھارتی وزیرِ اعظم کے بیانات اس کے بر عکس ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بھارتی اعترافات کے بعد اب جنگ نا گزیر ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں یہ بڑا جذباتی خیال ہے۔ جنگ سے دونوں ملکوں کا نقصان ہوگا۔ بے گناہ لوگ مریں گے اور عالمی سطح پر دونوں ملکوں کی بد نامی ہوگی۔ جنگ کسی بھی مسئلے کے حل کا آخری آپشن ہوتا ہے۔ بھارت کو ترکی بہ ترکی جواب دینا بہر حال ہمارا حق ہے۔ لیکن جنگ میں پہل کرنے سے بہت سے نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔

## نریندر مودی کا فون اور مسئلہِ کشمیر

پچھلے دنوں بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی نے اپنے پاکستانی ہم منصب کو فون کیا۔ انھوں نے وزیرِ اعظم نواز شریف کو رمضان المبارک کی آمد پر مبارک باد دی۔ اس کے علاوہ انھوں نے پاکستانی مچھیروں کی رہائی کی نوید بھی سنائی۔ دونوں رہنماؤں نے متانازعہ بیانات نہ دینے پر اتفاق کیا۔ یہ گفتگو پانچ منٹ تک جاری رہی۔ بھارتی وزیرِ اعظم نے اس گفتگو میں کہا کہ وہ پاکستان کے ساتھ اچھے تعلقات چاہتے ہیں۔ اس موقع پر پاکستانی وزیرِ اعظم نے اپنے بھارتی ہم منصب کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ہمیں جنگ اور اختلافات کی بہ جائے امن و محبت کی طرف جانا چاہیے۔تاکہ دونوں ملکوں کے عوام اپنے لیڈروں کو ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد رکھیں۔ قوموں کے حکم ران گھر کے سربراہ کی طرح ہوتے ہیں، جو اپنے خاندان کو لڑائی جھگڑوں سے بچا کر امن کی طرف لے جاتے ہیں اور ہر آفت سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں کنبے کی فلاح ہر حال میں مقدم ہوتی ہے۔

بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی کی طرف سے اٹھایا گیا یہ اقدام واقعی قابلِ تعریف ہے۔ یہ انصاف نہیں ہے کہ ان کی پاکستان مخالف تقریر کو تو ہم " قابلِ تذمیم" کہیں۔ لیکن ان کے متنازعہ بیان نہ دینے پر اتفاق کے اقدامکی

ذرا بھی تعریف نہ کریں۔ انصاف یہ ہے کہ غلطی اپنے بھی کریں تو سرزنش کی جائے۔ اچھائی غیر بھی کریں تو تعریف کی جائے۔ بلاشبہہ یہ ہمارے وزیرِ اعظم کی مفاہمت پر مبنی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے بھارتی ہم منصب پگھل گئے۔ ورنہ طبلِ جنگ تو دونوں طرف سے بج رہا تھا۔ نریندر مودی کے پاکستان مخالف بیانات کے بعد انڈیا اور پاکستان دونوں کی طرف سے شدید بیان بازی کے گولے برسائے جا رہے تھے۔ کچھ بیانات، پڑھ کر تو مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ بس اب جنگ شروع ہونے کو ہے۔ ہمارا دانش ور اور قلم کار طبقہ بھی شدید غصے میں مبتلا تھا۔ لیکن صاحبانِ بصیرت جانتے تھے کہ برف ضرور پگھل جائے گی۔ مجھے بھی جنگ کے امکانات دور دور تک دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ ہمارے وزیرِ اعظم کے مصلحت پر مبنی بیانات کام آ گئے۔ نریندر مودی سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ بالآخر انھوں نے اپنے پاکستانی ہم منصب کو فون کر دیا۔ یوں وہ مصلحت پر اتر آئے۔

نریندر مودی اس بات کا بھی ادراک رکھتے ہیں کہ پاکستان ایک ایٹمی طاقت ہے۔ کسی ایٹمی طاقت سے الجھاؤ کے نتائج اچھے نہیں ہوتے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ "پاکستان میانمار نہیں"۔ اگر رن پڑا تو زور کا پڑے گا۔ نقصان دونوں طرف ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ پاکستانی وزیرِ اعظم کی طرح مصالحت کی بات کی جائے۔ نریندر مودی یہ بھی جانتے ہیں کہ اب یہ 1971ء والا پاکستان نہیں

ہے۔ یہ 2015 ء ہے۔ اس وقت پاکستان ہر دفاعی خطرے سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ پاکستان کو شکستِ فاش دینا بہت مشکل ہے۔ اس صورت میں امن و سلامتی کا علم بلند کیا جائے تو بہتر ہے۔

گو نریندر مودی نے وزیرِ اعظم کو فون کرکے اس عزم کا بھرپور اظہار کیا ہے کہ وہ خطے میں امن و سلامتی چاہتے ہیں۔ وہ تصادم سے گریز برتنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے بغیر دونوں ملکوں کے درمیان امن و سلامتی کا پیدا ہونا عبث ہے۔ پاکستان کو بھارت سے دیگر تحفظات بھی ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان کئی بار کہہ چکا ہے کہ بھارت اندر ہی اندر سے پاکستان کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسی طرح پاک چین اقتصادی راہداری پر پاکستان کو بھارت کے موقف پر شدید اعتراض ہے۔ اس کے علاوہ پانی کا مسئلہ ہے، جو دونوں ملکوں کے درمیان شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ لیکن ان تمام مسئلوں میں سے سب سے بڑا مسئلہ کشمیر کا مسئلہ ہے۔ مبصرین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر حل کیے بغیر جنوبی ایشیا میں امن کا خواب دیکھنا محض خواب ہی ثابت ہوگا۔ پھر کشمیریوں کے استقامت، ہمت اور صبر کو جتنی داد دی جائے، کم ہے۔ بھارت 1948ء سے کشمیریوں کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن آج بھی میرے کشمیری بھائی پاکستان کے حق میں نعرے لگاتے ہیں۔ جب وہ پاکستان کے حق میں نعرے لگاتے ہیں تو بھارت کو یہ بات برداشت نہیں ہوتی۔

بھارت کی سکیورٹی فورسز ان پر ظلم و ستم کرتی ہے۔ان کے جذبہ آزدی کو سلب کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان کے دل سے پاکستان کی محبت نکالنے کی سعی کرتی ہے۔ لیکن اس میں انھیں ذرا سی بھی کام یابی حاصل نہیں ہوتی ۔

بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی سے گذارش ہے کہ اگر وہ واقعی امن کے خواہاں ہیں، تو کشمیریوں کو حقِ خودارادیت دے دیں۔ اقوامِ متحدہ کی قرار دادوں کے مطابق کشمیر کا مسئلہ حل کر دیں۔ اس کے بعد ہی دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی ختم ہوگی۔ مسئلہِ کشمیر حل کیے بغیر "وقتی امن" تو قائم کیا جا سکتا ہے۔ "حقیقی امن" نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ بھارتی وزیرِ اعظم وقتی امن چاہتے ہیں یا حقیقی امن۔

## ! اے شہرِ بے اماں کے مرحوم ساکنانِ بہشت

اے شہرِ بے اماں کے مرحوم ساکنانِ بہشت ! میرے دامن میں ایسا کچھ نہیں ہے ، جو میں تمھاری نذر کر سکوں ۔ سوائے چند الفاظ کے ۔ میں کوئی سیاست دان نہیں ، جو بیان بازیاں کروں ۔ کوئی سکہ بند شاعر نہیں جو قافیوں پر قا فیے ملا کر تمھارے لیے کوئی مرثیہ نظم کروں ۔ فقیہِ وقت نہیں کہ فتوے رقم کروں ۔ واعظِ شہر نہیں کہ تمھاری مدح میں وعظ کر کے خلقت کا دل لبھا سکوں ۔ میں ایک چھوٹا سا قلم کار ہوں۔ سو میری آج کی تحریر کے سارے الفاظ تمھارے لیے وقف ہیں ۔ اسے تم میرے دل کی آواز کہو یا اپنے لیے خراجِ عقیدت ۔ یہ تم پر انحصار کرتا ہے ۔

اے شہرِ بے اماں کے مرحوم ساکنانِ بہشت ! 21 جون بروز اتوار کو تمھاری تعداد محض سترہ تھی ۔ تمھاری اس طرح کی تاسف ناک اموات پر کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ 22 جون بروز پیر تک تعداد 132 تک جا پہنچی ۔ پھر بھی سب چپ سادھے بیٹھے رہے ۔ جیسے تمھاری موت ، کسی انسان کی نہیں ، جانور کی موت ہو ۔ 23 جون بروز منگل تک تعداد بڑھتے بڑھتے 261 تک جا پہنچی ۔ اب سیاست دانوں کی طرف سے جارح بیان بازی اور الزام تراشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ وفاق

صوبائی حکومت کو کوسنے لگا اور صوبائی حکومت وفاق اور کے۔ الیکٹرک دونوں کو۔ مگر عملی میدان اب بھی خالی رہا۔ کوئی اس میدان میں اترنے کو تیار نہیں تھا۔ 24 جون بروز بدھ کو غضب ہوگیا۔ تمھاری تعداد 784 ہو گئی۔ اپوزیشن کو تم پر رحم آیا۔ سو اس نے جمعۃ المبارک کو یومِ سوگ منانے کا اعلان کر دیا۔ خیر سے اب بھی عملی میدان خالی رہا۔ احتجاج، بیان بازی اور یومِ سوگ ۔۔۔ میرے ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والوں کے دامن میں تمھارے لیے بس یہ تین ہی چیزیں تھیں اور ہیں۔ اگر پہلے سے ہی ہر ایک عملی میدان میں اتر کر اپنے اپنے کام سرانجام دیتا تو تمھاری تعداد تک کیوں کر پہنچتی؟ 25 جون بروز جمعرات تک تمھاری تعداد میں 238 کا 784 اضافہ ہوا۔ یوں تمھاری تعداد 1022 ہو گئی۔ یعنی عملی میدان اب بھی خالی۔ آج کا اخبار بتاتا ہے کہ تمھاری تعداد 1131 ہو گئی ہے۔ لیکن حکم ران اب بھی بیان بازی میں لگے ہوئے ہیں۔ کیا اس سے بڑا بھی کوئی ظلم ہوگا؟

اے شہرِ بے اماں کے مرحوم ساکنانِ بہشت! جب میں انسانیت کا اپنوں کے ہاتھوں یوں قتلِ عام دیکھتا ہوں تو بے ساختہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ یاد آ جاتے ہیں۔ انھوں نے کیا خوب کہا تھا کہ اگر میرے دورِ حکومت میں دریائے نیل کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو قیامت کے دن مجھ سے اس کتے کی موت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ بلاشبہ

انھوں نے اپنے اس قول کے ذریعے اندازِ جہاں بانی کا ایک سنہری اصول طے کر دیا۔ آنے والے حکم رانوں کو سمجھا دیا کہ اچھا بادشاہ وہ ہوتا ہے، جو انسان کیا، جان ور کی موت کو بھی اپنے لیے قابلِ گرفت سمجھتا ہے۔ مگر یہاں انسانوں کے انسان مر رہے ہیں۔ کوئی بھونچال نہیں آیا۔ کسی نے استعفیٰ نہیں دیا۔ کسی نے اقتدار نہیں چھوڑا۔ کوئی کرسی سے نہیں اٹھا۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ قیامت کے دن تمھاری موت کے بارے میں اگر احکم الحاکمین نے پوچھ لیا تو کیا جواب دے گا۔ سب مزے لے لے کر بیان بازی میں مصروف ہیں۔ تمھاری ہلاکت نے تو اہلِ اقتدا کی سیاست کے وارے نیارے کر دیے۔ اب تمھاری ہلاکتوں پر خوب سیاست ہوگی۔ تم نے جان دے کر بھی ان کا بھلا کر دیا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تمھاری ہلاکتوں کے مسئلے کو اپنی سیاست کے لیے کس طرح استعمال کرتے ہیں۔

اے شہرِ بے اماں کے مرحوم ساکنانِ بہشت! تمھاری زخموں کے اندمال کے لیے کسی سیاست دان، کسی حکم ران، کسی مذہبی عالم، کسی این جی او، کسی خیراتی ادارے کے پاس مرہم نہیں ہے۔ سوائے ایدھی اور چھیپا کے رضا کاروں کے۔ جب تم بسترِ مرگ پر آخری سانسیں لے رہے تھے تو حکامِ بالا میں سے کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اپنا اے سی کا کمرہ چھوڑ کر تمھارے پاس آتا۔ تمھیں دلاسا دیتا۔ نہیں نہیں۔۔ نرم و گداز عادت اور جسم کے مالک یہ نمائندگان

ملک کیوں کر 45 ڈگری سینٹی گریڈ کی گرمی میں باہر نکلتے۔جب درجۂ حرارت ذرا تھما تو کچھ لوگ آئے اور بیان بازیاں کرتے ہوئے فی الفور چلے گئے کہ کہیں درجۂ حرارت بڑھ نہ جائے۔ دراصل آج کل کچھ سیاسی جماعتوں پر افتاد آن پڑی ہے۔انھیں تم سے زیادہ اپنی پارٹیوں کا دفاع عزیز ہے۔ وہ تم سے زیادہ اپنی پارٹیوں کو مقدم رکھتے ہیں ۔ان کے پاس اپنی پارٹیوں کے دفاع کے لیے تو وقت ہے۔ مگر تمھارے لیے بالکل نہیں ہے۔

اے شہر بے اماں کے مرحوم ساکنانِ بہشت ! تمھاری تعداد بڑھتی جارہی ہے۔جو تمھاری موت کے حقیقی ذمہ دار ہیں وہ ضرور بالضرور اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ جہاں رحمان و رحیم ہے، وہاں وہ وہ منصفِ حقیقی بھی ہے۔

## آپ ﷺ کے عہدِ مبارکہ میں لکھے گئے احادیث کے ن

درحقیقت کتابتِ حدیث کا آغاز عہدِ رسالت مآب ﷺ میں شروع ہو گیا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف کتابتِ حدیث کے کام کی حوصلہ افزائی کی ، بلکہ آپ ﷺ نے چند مواقع پر خود اپنی سرپرستی میں احادیث لکھوائیں۔
رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارکہ میں لکھی گئیں چند احادیث کی کتابیں درج ذیل ہیں:

1۔ صحیفہِ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ

2۔ الصحیفۃ الصادقہ

3۔ کتاب الصدقہ

4۔ صحیفہِ علی رضی اللہ عنہ

اس کے علاوہ آں حضرت ﷺ کے دور میں احادیث کے سلسلے میں دیگر تحریری کام بھی ہوا تھا۔اس چھوٹی سی تحریر میں اس عہدِ مبارکہ کے تمام تحریری کام کا موازنہ کرنا محال ہے۔ درج بالا چار کتابوں میں سے پہلی اور تیسری کتاب آپ ﷺ نے لکھوائی تھیں۔جب کہ دوسری اور چوتھی کتاب آپ ﷺ کے دو صحابیوں ، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے

تحریر کی تھیں ۔اب ان چار کتابوں کا اجمالی طور پر جائزہ لیا جاتا ہے ۔

1۔۔ سن 10 ہجری میں یمن کا علاقہ نجران فتح ہوا۔آپ ﷺ نے حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو وہاں کا عامل مقرر فرمایا۔جاتے وقت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایک کتاب لکھوا کر ان کے حوالے کی ۔اس کتاب میں عام نصیحتوں کے علاوہ طہارت ، نماز ، زکوۃ ، عشر ، حج عمرہ ، جہاد ، غنیمت اور جزیہ کے احکام ، نسلی قومیت کے نظریہ کی ممانعت ، دیۃ (خوں بہا) ، بالوں کی وضع ، تعلیمِ قرآن اور طرزِ حکم رانی کے متعلق ہدایات درج تھیں ۔(تفصیل کے لیے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی الوثائق السیاسہ پڑھیے۔) حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت سترہ سال تھی ۔انھوں نے اس کتاب کی روشنی میں بہ طور عامل اپنے فرائض بہ حسن خوبی سرانجام دیے ۔ ان کے انتقال کے بعد یہ کتاب ان کے پوتے ابوبکر کے پاس رہی ۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مسودہ انھی سے پڑھا اور نقل کیا۔

2۔۔الصحیفۃ الصادقہ ، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا تحریر کردہ ہے ۔ ان کے بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : "نبی ﷺ کے صحابہ میں سے آپ ﷺ کی حدیثیں مجھ سے زیادہ کسی کے پاس نہیں ۔ سوائے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ۔ کیوں کہ وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہیں

لکھتا تھا۔" (بخاری، ترمذی، سنن دارمی)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اس صحیفے کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے شاگرد مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ایک مسودہ، جو آپ کے تکیے کے نیچے رکھا ہوا تھا، اٹھا کر ہاتھ میں لے لیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے مجھے روک دیا۔ میں نے کہا: "آپ تو مجھ سے کچھ نہیں چھپاتے۔"

اس پر آپ نے فرمایا: " یہ صادقہ ہے۔ یہ وہ کچھ ہے، جو میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست سنا ہے اور آپ کے اور میرے درمیان کوئی تیسرا راوی نہیں ہے۔ اگر یہ کتاب اللہ (یعنی وہی حدیث کی کتاب) اور وہظ (آپ رضی اللہ عنہ کی زرعی زمین) میرے لیے موجود رہیں تو پھر مجھے باقی دنیا کی کچھ پروا نہیں ہے۔" (جامع البیان العلم، اسد الغابہ)

روایات بتاتی ہیں کہ انھوں نے اپنی یہ کتاب آں حضرت ﷺ کی اجازت سے تحریر کی تھی۔ قریش کے لوگوں نے انھیں الصحیفۃ الصادقۃ لکھنے سے منع کیا تو انھوں نے آپ ﷺ سے اس بات کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: " قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ ان دونوں لبوں کے درمیان (جو زبان ہے اس) سے حق کے

سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اس لیے تم لکھا کرو۔" (ابنِ سعد، ابو داؤد، المحدث الفاصل، (مستدرک

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یہ مسودہ آپ کی اولاد کے پاس رہا۔ان کے پڑپوتے حضرت عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ اس سے درسِ حدیث دیا کرتے تھے۔ مشہور محدثین یحیٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ اور علی بن المدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن شعیب کی روایت کردہ ہر حدیث، خواہ وہ کسی بھی کتاب میں ہو، حضرت عبد اللہ بن عمرو کے صحیفۃ الصادقۃ سے لی گئی ہے۔ (تہذیب التہذیب)

3۔۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ نے کتاب الصدقۃ لکھوائی۔آپ ﷺ اسے اپنے عاملوں کے پاس نہ بھیجنے پائے تھے کہ آپ ﷺ کی انتقال ہوگیا۔آپ ﷺ نے اسے اپنی تلوار کے ساتھ منسلک کر لیا تھا۔آپ ﷺ کی وفات کے بعد اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عمل کیا۔یہاں تک کہ وفات پائی۔ پھر اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمل کیا۔ یہاں تک کہ وفات پائی۔" (سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، الابل والغنم)

الصحیفۃ الصادقۃ کی طرح، کتاب الصدقۃ کا بھی درس دیا جاتا تھا۔ اس کتاب

کا درس مشہور محدث ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ (51 ہجری ۔۔۔125 ہجری) دیا کرتے تھے ۔انھوں نے یہ کتاب حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے حضرت سالم رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھی ۔ جسے انھوں نے حفظ کر لیا تھا۔

۔۔یہ بات بھی مشہور ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس احادیث کا تحریر کردہ 4 مجموعہ تھا۔ جو "صحیفہِ علی " کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بھی رسول اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں لکھا گیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اس صحیفے کے متعلق فرمایا : ہمارے پاس کچھ نہیں ، سوائے کتاب اللہ اور اس صحیفے کے جو نبی ﷺ سے منقول ہے" (۔" ( صحیح بخاری شریف

امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں چھے مقامات پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زبانی اس صحیفے اور اس کے مضامین کا ذکر کیا ہے۔ مشہور مورخ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ (اپنے دور خلافت میں ) مسجد میں کھڑے ہوئے اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ پھر لوگوں سے پوچھا: کون ایسا ہے، جو محض ایک درہم کے عوض علم خریدنا چاہتا ہو ؟" اس جملے سے آپ کی مراد یہ تھی کہ تحصیلِ حدیث کا طالبِ علم محض ایک درہم کا کاغذ خریدے اور آپ رضی اللہ عنہ کے پاس احادیثِ نبوی لکھنے کے لیے آجائے۔

بیان کیا گیا ہے کہ حارث الاعوار نے کاغذ خریدا اور آپ رضی اللہ عنہ کے پاس آگیا
۔طبقات ابنِ سعد میں ہے کہ اسلامی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں لفظ "علم" محض
علمِ حدیث کے لیے بولا جاتا تھا۔

: نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے )

۔کتابتِ حدیث عہدِ رسالت ﷺ اور عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ۔۔ مفتی محمد 1
رفیع عثمانی

۔حجیتِ حدیث ۔۔۔ مفتی محمد تقی عثمانی 2

(۔تاریخِ تدوینِ حدیث ۔۔ مولانا عبد الرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ 3

# "اسلام نافذ ہو گیا۔۔۔"

"پیارے بھائیو! اب ہم اس ملک کے چپے چپے پر اسلام کا نفاذ کریں گے۔ اس کے لیے ہمیں جان دینی پڑے تو دے دینی چاہیے۔ اسلام قربانی مانگتا ہے۔ اگر ہم قربانی نہیں دیں گے تو کون دے گا۔ سو اٹھ کھڑے ہوں اور اسلام کا علم اٹھا کر دشمنوں کی صفوں میں گھس جائیں۔ یہ صرف نام کا اسلامی ملک ہے۔ یہاں کے لوگ مسلمان نہیں ہیں۔ یہ مرتد ہو چکے ہیں۔ انھیں مارنا فرض ہو چکا ہے۔ یہ ہمارے بھائی نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ یہ ہمارے دشمنوں کو دوست بناتے ہیں۔ قرآن جنھیں ہمارا دشمن کہتا ہے، وہ ہمارے دوست کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ اس لیے اب یہ بھی ہمارے بدترین دشمن ہیں، جن سے انتقام لینا از حد ضروری ہے۔" مزاحمتی تنظیم کے ایک جوشیلے نوجوان نے اپنے ساتھیوں کو جذبات دلانے کے لیے یہ جملے کہے۔ جوشیلا نوجوان بیٹھ گیا۔ 40 سے 45 لوگوں کا یہ گروہ سوچ و بچار میں مصروف ہو گیا۔ قدرے توقف کے بعد ایک نوجوان کی آنکھیں چمکیں۔ جیسے اس کے ذہن میں کوئی فاتحانہ خیال آگیا ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے گویا ہوا: "جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں چند غیر ملکی باشندے آئے ہوئے ہیں۔ انھیں قتل کرنا ہم پر فرض ہے۔ کیوں کہ یہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ یہ ہمارے بدترین دشمن ہیں۔ اگر ہم ان پر ایک زور آور اور جان لیوا خود کش حملہ کر

دیں تو ہماری بے چین روح شانت ہو جائے گی۔ ہمیں قرار آجائے گا۔" نوجوان خاموش ہوا تو مجمع میں سے آواز آئی: "ہاں ہاں، یہ اقدام اسلام کے نفاذ کی طرف ایک اہم قدم ثابت ہوگا۔" ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ ذرا سی دیر کے بعد ایک نو جوان کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے یوں مخاطب ہوا: آپ تو جانتے ہیں کہ ایک فرقے کے لوگوں نے ہمارے کئی علاقوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ علاقے امریکا بہادر کی مداخلت سے پہلے ہمارے ہاتھ میں ہوا کرتے تھے۔ اب انھوں نے قبضہ کر لیے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمان بھی نہیں ہیں۔ انھوں نے اسلام کی روح گھائل کی۔ یہ سوادِ اعظم سے الجھے۔ ان کا وجود دنیائے اسلام کے لیے سخت خطرناک ہے۔ ان کو نیست و نابود کرنا فرض ہے۔ ہم اس جمعہ کو ان کی عبادت گاہ پر خود کش حملہ کریں گے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ قدم بھی اسلام کے نفاذ کے لیے کارگر ثابت ہوگا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ خود کش حملے کے لیے کون تیار ہے؟" نوجوان کے سوال پر تقریباً سارے نوجوانوں کے ہاتھ بلند ہو گئے۔ نوجوان سبحان اللہ، سبحان اللہ، کہتا ہوا بیٹھ گیا۔

پھر سوچ و بچار کی گئی۔ ہر ایک کو اس کا ٹاسک بتایا گیا۔ کس کو کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے، یہ سب کچھ بتا دیا گیا۔ دو دن بعد اخبارات اور میڈیا کے ذریعے معلوم ہوا کہ ایک ملک میں یکے بعد دیگرے دو حملے ہوئے۔ ایک غیر ملکی وفد پر اور دوسرا عبادت گاہ پر۔ عبادت گاہ پر حملہ دورانِ نماز ہوا

۔ کئی لوگ ہلاک اور شہید ہوئے ۔ مگر حملہ آوروں کے نزدیک مردار ہوئے ۔ عالمی میڈیا چیخ اٹھا۔ اس ہول ناک واقعے کی عالمی طور پر مذمت کی گئی ۔ مگر زیادہ مذمت غیر ملکی وفد پر کیے جانے والے حملے کی کی گئی ۔ کچھ عالمی میڈیا کی مذمت کا دباؤ تھا اور کچھ دوست ملک کی دوستی کے بھرم کا دباؤ تھا کہ ایک اسلامی ملک میں کئی مساجد پر تالے لگا دیے گئے ۔ یعنی نماز پر قدغن ۔ وہ بھی ایک مسلم ملک میں ۔ وجہ یہی حملے ٹھہری ، جو نفاذِ اسلام کے نام پر کیے گئے ۔ایک طرف ایک مزاحمتی گروپ کی نا عاقبت اندیشی تھی تو دوسری طرف مسلم ملکوں کے حکم رانوں کی بے وقوفی تھی ۔ بھلا مساجد پر بھی تالے ڈالے جا سکتے ہیں !!

ایک بوڑھا دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں ظہر کی نماز ادا کرنے جا رہا تھا۔ بوڑھے کی آنکھوں سے بزرگی چھلکتی تھی ، جو اس بات کی غماز تھی کہ یہ بوڑھا پابندِ صوم و صلوۃ ہے ۔ اس نے چند نقاب پوشوں کو دیکھا۔ آن کی آن میں اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی ۔اس کا پورا وجود غصے سے بھر گیا۔ وہ مسلح نقاب پوشوں پر بغیر کوئی خوف کھائے برس پڑا: "ارے سنتے ہو ۔۔ اسلام نافذ ہو گیا۔ ہاں پورے ملک میں ۔۔ پورے ملک کے ہر شہر میں ۔۔۔ ہر قریے میں ۔۔۔ ہر گاؤں میں ۔۔۔ یہاں تک کہ ہر گلی میں ۔۔۔ اب نہ کوئی شراب پیتا ہے ، نہ کوئی جوا کھیلتا ہے ۔۔۔ لوگ نیک ہو گئے ہیں ۔۔۔ بھیڑیا اور بکری ایک ہی گھاٹ سے پانی

پی رہے ہیں ۔۔۔۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں تازہ ہونے لگی ہے ۔۔۔ فضائیں معطر ہیں ۔۔۔ رحمتِ الٰہی کا نزول ہو رہا ہے ۔ نہ کوئی خوف ، نہ کوئی خطرہ ۔۔۔ زمین پر سونے کے سکے گرے پڑے ہیں ، کوئی اٹھانے والا نہیں ۔۔۔ تم نے تو تاریخ رقم کر دی ہے ۔۔۔۔ تمھیں جتنی داد دی جائے کم ہے ۔۔۔۔۔

مسلح لوگوں کا دستہ بوڑھے کو یوں ہی بولتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے ۔ انھیں معلوم تھا کہ بوڑھا ان پر زبردست تنقید کر رہا ہے ۔ بوڑھا کی جراءتِ گفتار ان کے جبر پر غالب آ گئی ۔ وہ چاہتے ہوئے بھی بوڑھے کو کچھ نہ کہہ سکے ۔ اس لیے وہ آگے بڑھ گئے ۔ ویسے بھی وہ اپنا وقت بوڑھے کی فضول گوئی سننے میں ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ کیوں کہ انھیں کچھ اور حملے کرنے تھے ۔ کچھ عبادت گاہیں گرانی تھیں ۔ کچھ مقتل خونِ انساں سے سجانے تھے ۔ کچھ غیر ملکی مہمانوں کو "مردار کرنا" تھا ۔ ابھی ان کو بہت سے کام کرنے تھے ۔ کیوں کہ اسلام کا نفاذ ابھی تک نہیں ہوا تھا ۔۔۔۔

گذشتہ تحریر میں عنوان غلط لکھ دیا گیا تھا ۔ یہ غلطی ناچیز سے ہوئی ۔ اصل عنوان یہ ) تھا : "آپ ﷺ کے عہدِ مبارکہ میں لکھے گئے احادیث کے نسخے "۔۔ قارئین سے معذرت (

## الحمد للہ۔۔۔الحمد للہ

رات کے گہرے سناٹے میں اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ کبھی دائیں کروٹ لیتا اور کبھی بائیں طرف مڑ جاتا۔ دراصل اس کا ذہن منتشر تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن سو نہیں پا رہا تھا۔ ذہن خیالات کی آماج گاہ بن جائے تو نیند کہاں سے آتی ہے۔ کچھ دیر بعد اسے پیاس محسوس ہوئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، فریج کے پاس گیا، وہاں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی، گلاس میں اپنی ضرورت کے مطابق پانی انڈیلا اور پی لیا۔ پانی پینے کے بعد اس کی زبان سے بے ساختہ "الحمد للہ" کا کلمۂ خیر نکلا۔ اس کلمۂ خیر نے اس کی سوچ کا زاویہ یک سر تبدیل کر دیا۔ وہ "الحمد للہ" کے بارے میں سوچنے لگا۔ ویسے الحمد للہ کا مطلب ہوتا ہے، "سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں"۔ لیکن یہ ایک کلمۂ شکر ہے۔ جو ایک مسلمان اس وقت ادا کرتا ہے، جب اسے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا احساس ہوتا ہے۔

وہ سوچنے لگا، دیکھا جائے تو انسانی زندگی کا ہر ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پر ہے۔ ہم دن میں رب تعالیٰ کی کتنی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں

ہمارے دستر خوان مختلف کھانوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ہمیں پیاس لگے تو ٹھنڈا پانی، حاضر ہوتا ہے۔ ہمیں بھوک لگے تو ہر قسم کا کھانا موجود ہوتا ہے۔ کہیں جانا ہو تو سواری مل جاتی ہے۔ سونا ہو تو نرم و گداز بستر میسر آ جاتا ہے۔ رب تعالیٰ نے تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے دیے ہیں۔ رہنے کے لیے عالی شان گھر دیا ہے۔ غرض ہر طرح کی نعمتوں اور رحمتوں سے نوازا۔ یہ رحمتیں اور نعمتیں محدود نہیں، لا محدود ہیں۔ ہم ان نعمتوں اور رحمتوں کو شمار بھی نہیں کر سکتے۔ اگر یہ نعمتیں اور رحمتیں ایک لمحے کے لیے روک دی جائیں تو شاید ہمارا جینا محال ہو جائے۔ لیکن ہم ان نعمتوں اور رحمتوں کے بدلے میں ایک کلمہِ شکر بھی ادا نہیں کرتے۔ نادانستہ طور پر زبان سے شکر کے کلمات نکل جائیں تو نکل جائیں۔ لیکن دانستہ طور پر ہم ایسا نہیں کرتے۔ رب تعالیٰ کے بہت ہی کم بندے ایسے ہیں، جو ہر لمحہ رب تعالیٰ کی نعمتوں اور رحمتوں پر زبانِ حال و قال سے اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اب وہ دن کو پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ دیکھتا ہوں ایک دن میں کتنے لمحات ایسے آتے ہیں، جن میں اللہ کی رحمت اور نعمت ساتھ نہ دیتی تو کام بگڑ جاتا۔ عام نعمتیں تو الگ سے ہیں، جن پر ہر لمحے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ لیکن کچھ خاص لمحات بھی ہوتے ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بھی خاص ہوتی ہیں۔ اس لیے انسان کو ان

مواقع پر خاص طور پر شکر ادا کرنا چاہیے ۔ اب اس کے ذہن میں دن کے واقعات تازہ ہونے لگے ۔ وہ صبح کو اٹھا۔ نمازِ فجر ادا کی ، دفتر میں جانے کی تیاری کی ، ناشتا کیا۔ پھر اپنے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر دفتر کو روانہ ہو گیا۔ ہمارے ملک میں ٹریفک کے قوانین پر بہت کم لوگ عمل کرتے ہیں ۔ خصوصا بڑی گاڑیاں ۔ شاید بڑی گاڑیوں کی وجہ سے ہی حادثات زیادہ ہوتے ہیں ۔ موٹر سائیکل چلاتے ہوئے وہ صرف آج نہیں ، روزانہ گاڑیوں سے بچ جاتا تھا۔ آج بھی وہ تین چار بار بچ گیا۔ ایسے مواقع پر وہ گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو کوستا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن اب رات کو اسے احساس ہوا کہ ایسے مواقع پر تو اسے اللہ تعالٰی کا خاص شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ اس کی جان بچا لیتا ہے۔ لیکن وہ اپنا وقت صرف ڈرائیوروں کو کوسنے میں صرف کر دیتا ہے ۔ بہر حال غصہ بھی انسانی فطرت میں شامل ہے۔ اس کی زبان سے ایک بار پھر "الحمد للہ" کا کلمہِ شکر ادا ہوا۔

دفتر میں داخل ہوتے ہی اس نے بڑی مہارت سے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ اپنی کمپنی کے پڑھے لکھے آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسے اپنے کام میں خاص مہارت حاصل تھی ۔ کام کے دوران اکثر لوگ اس سے اپنے مسائل شئیر کرتے ۔ اور وہ چٹکی میں ان کے مسائل حل کر دیتا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کے پاس لوگ آتے گئے اور وہ ان کے مسائل حل کرتا گیا۔ پڑھا لکھا ہونے

کی وجہ سے باس بھی اس کی عزت کرتا تھا۔ اس نے سوچا: پڑھا لکھا ہونا بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ کتنے لوگ ہیں، جو پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ دور کیا جائیں، اپنی کمپنی میں ہی بہت سے لوگ ایسے ہیں، جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔ میں پڑھا لکھا ہوں، اس لیے لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ اور میں کام بھی صحیح طور پر کرتا ہوں۔ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔ اس کی زبان سے ایک بار پھر "الحمد للہ" کا کلمہِ شکر ادا ہوا۔

شام کو وہ گھر صحیح سلامت واپس آگیا۔ اس کا گھر بھی صحیح سلامت تھا۔ اس کے بچے بھی صحیح سلامت تھے۔ حالاں کہ اس کا علاقہ ایک خطرناک علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ وہاں آئے روز لاشیں گرتی ہیں۔ فائرنگ ہے کہ تھمتی نہیں۔ اس کے علاقے کے کئی بے گناہ لوگ موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل سے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کے گھر کا کوئی نقصان ہوا۔ اس کے گھر کو ایک آنچ بھی نہیں آتی۔ اس کے بچے باہر گلیوں میں کھیلتے رہتے ہیں۔ اسکول جاتے ہیں اور مدرسہ جاتے ہیں۔ مگر واپس بھی آجاتے ہیں۔ بے شک یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی رحمت پر کبھی کلمہِ شکر ادا نہیں کیا تھا۔ اس کی زبان سے ایک بار پھر "الحمد للہ" کا کلمہ شکر ادا ہوا۔

اسے جمائی آئی۔یعنی اب نیند اس کے سر پر منڈلانے لگی۔ وہ بستر پر جا کر سو گیا۔کچھ دیر بعد زور دار خراٹے لینے لگا۔

## قصور اسکینڈل ۔۔۔ ہمیں کیا ہو گیا ہے ؟؟

میرے سامنے قصور اسکینڈل اپنی تمام تر ہیبت اور وحشیانہ منظر کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔ میں اس منظر سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں ۔ اس خبر سے دور بھاگنا چاہتا ہوں ۔ لیکن یہ کام بہت مشکل نظر آتا ہے ۔ ارادہ تھا کہ یوم آزادی پر لکھوں گا ۔ اپنے پڑھنے والوں کو کچھ تاریخی واقعات کی سیر کراؤں گا ۔ لیکن ایسا نہیں کر سکتا ۔ مجھے طوعاً کرہاً بابا بلھے شاہ کے قصور میں ہونے والے وحشیانہ سانحے پر کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑے گا ۔ اس بھیانک واقعے سے راہِ فرار اختیار کرنا میرے مشکل کیا، نا ممکن ہو چکا ہے ۔
قوموں کی تاریخ میں کچھ ایسے واقعات بھی گزرتے ہیں ، جب پوری قوم کا سر شرم سے جھک جاتا ہے ۔ بعض اوقات ایسے لمحات بھی آتے ہیں کہ جب قوم کا سر شرمندگی سے اتنا جھک جاتا ہے کہ پھر بہت دیر سے یہ سر اٹھتا ہے ۔ بلا شبہہ قصور کا یہ الم ناک ۔۔۔ بلکہ ہیبت ناک واقعہ ایسا واقعہ ہے کہ پوری قوم کا سر شرم سے اتنا جھک گیا ہے کہ اب نہ جانے یہ سر کب بلند ہو گا ۔ کہاں گئے مسلم اقدار ؟ ۔۔۔ کہاں گئیں مشرقی روایات ؟

۔۔۔

اس اسکینڈل سے پہلے میں ہمیشہ اپنے جاننے والوں کو کہتا کہ تم امریکا اور یورپ کے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ وہ ہم سے ہر میدان میں آگے ہیں۔ لیکن اخلاقی اقدار میں ہم سے پیچھے ہیں۔ ہم اخلاقی گراوٹ کی اس سرحد کو چھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے، جسے مغرب پار کر چکا ہے۔ میرے دوست مجھے اس پر ٹوکتے۔ وہ کہتے، تمھاری سوچ غلط ہے۔ ہم اخلاقی طور پر بھی دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ میں کہتا، نہیں۔ تم غلط کہتے اور سوچتے ہو۔ وہ کہتے تم ایک غلط دن غلط ثابت ہو جاؤ گے۔ تم نے جسے حقیقت سمجھا ہے، وہ ایک نہ ایک دن ضرور تمھارے سامنے قیاس یا مفروضے کی صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔ تم ساکت وجامد ہو جاؤ گے۔ قوم کے ضمن میں تمھارا اخلاقی تفاخر ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ میں کہتا، نہیں تمھاری سوچ قوم کے ضمن میں درست نہیں ہے۔ اپنی سوچ بدلو۔ پھر جب قصور اسکینڈل کا علم ہوا تو واقعی میری سوچ کی مخالفت کرنے والے جیت گئے۔ میں ہار گیا۔ میں واقعی ساکت و جامد ہو گیا۔ میری سوچ منتشر ہو گئی۔ میری حقیقت قیاس بن گئی۔ قوم کے ضمن میں میری ساری دانش وری محض ایک مفروضہ بن کے رہ گئی۔ پہلی بار مجھ پر یہ راز کھلا کہ ہم تو اخلاقی گراوٹ میں مغرب سے بھی کئی قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ جو حرکت میرے ملک کے باسیوں نے کی ہو، مغرب والے شاید ایسی حرکت کرنے کا تصور بھی نہ کریں۔ اب شاید میرے

منھ سے کبھی یہ بات نہ نکلے کہ ہم کم سے کم اخلاقی اقدار میں ان سے آگے ہیں ۔ اب ہم تمام شعبوں میں ان سے پیچھے ہو گئے ہیں ۔ کیا سائنس ، کیا ٹیکنالوجی ، کیا معاش اور کیا سماج ۔۔۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ہم سے بہت آگے بڑھے گئے ہیں ۔

دو سو اسی بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی !!! اتنی بری اور گھٹیا حرکت ! ہمیں ہو کیا گیا ہے !! "بچوں" کا لفظ استعمال کر کے کلیجہ منھ کو آتا ہے ۔ پھر اس سے بھی گھٹیا اور ذلیل حرکت یہ کہ ان گندے مناظر کو فلمایا گیا ۔ کیا کبھی کوئی ایسی حرکت پہلے بھی دیکھی اور سنی گئی تھی ؟ اس سوال کا جواب "ہرگز نہیں" میں ہوگا ۔ پھر اس سے بھی گھٹیا اور ذلیل حرکت یہ کہ ان فحش فلموں کو چائلڈ پورنو سائٹس کو فروخت کر دیا گیا ۔ ایک خبر بتاتی ہے کہ پینتیس کروڑ میں یہ فلمیں فروخت کی گئیں ۔ ساتھ ساتھ والدین کو بلیک میل کر کے جو رقم کمائی گئی ، وہ الگ ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم روز بہ روز اپنی اخلاقی اقدار بھول رہے ہیں ۔ ہم روز بہ روز وحشی ہوتے جا رہے ہیں ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے اسلام کی حقیقی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا ہے ۔ کیوں کہ اتنی گھٹیا حرکت کی نہ صرف اسلام اجازت نہیں دیتا ، بلکہ اس طرح کے کام کرنے والوں کو اسلام سخت سزا

کا مستحق بھی سمجھتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے مشرقی اقدار بھی بھول گئے ہیں۔ جب سے مغرب کا خام اخلاقی مال ہماری بازاروں میں بکنے لگا ہے، ہم اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ اب صورت حال اس جگہ آ پہنچی ہے کہ ہم نے اخلاقی گراوٹ میں مغرب کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ مغرب نے ہم سے اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ مشرقی اقدار بھی چھین لیے ہیں۔

قصور اسکینڈل بہت بڑا واقعہ ہے۔ ملزموں کو تحقیق و تفتیش کے بعد سزا ضرور دینی چاہیے کہ وہ اس کے مستحق ہیں۔ لیکن ایسے واقعات کی مکمل طور پر روک تھام کے لیے بہت ماہرینِ نفسیات اور مفکرین و دانش وران کو اس بارے میں بہت زیادہ غور وخوض کی ضرورت ہے کہ آخر ایسے واقعات رونما کیوں ہوتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم روز بہ روز اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوتے جا رہے ہیں۔ کافی سوچ و بچار کے بعد اس قسم کے واقعات کی روک تھام کے لیے جو اقدامات کیے جائیں گے، وہ ضرور موثر ثابت ہوں گے۔ قصہ مختصر یہ کہ اس ضمن میں صرف جذبات سے نہیں، جذبات سے ہٹ کر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

# جنرل حمید گل بھی "مرحوم" ہو گئے

موت قدرت کا اٹل فیصلہ ہے۔ موت برحق ہے۔ چودہ صدیاں قبل دنیا کی سب سے اہم ترین کتاب نے انسانوں کو ان کے خالق کا یہ پیغام سنایا کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ کئی لوگ روزانہ مر جاتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ مر کر بھی امر ہو جاتے ہیں۔ لاریب ان کا جسم فانی ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ کتابوں میں، نصابوں میں اور لوگوں کے ذہنوں میں زندہ رہتے ہیں۔ ان کے زندہ رہنے کی وجہ ان کے کارنامے ہوتے ہیں۔ ملک و قوم کے ضمن میں ان کی خدمات ہوتی ہیں۔ انھوں نے انسانیت کے دکھوں کی چارہ جوئی کے لیے اپنی زندگی وقف کی ہوتی ہے۔

بے شک جنرل حمید گل مر کر بھی امر ہو گئے ہیں۔ ان کا جسم فانی ہو چکا ہے۔ لیکن وہ اب تک اپنی قوم کے لوگوں کے ذہنوں میں زندہ ہیں۔ ان کی پر حسرت وفات پر ان سے اختلاف رکھنے والوں نے بھی افسوس اور غم کا اظہار کیا۔ ایسے لوگ خال خال ہوتے ہیں، جن کی وفات پر ان کے مخالف بھی اشک بہائیں۔ ان کے جذبۂ حب الوطنی پر نہ ان کی زندگی میں آنچ آئی نہ ان کی وفات کے بعد آنچ آئی۔ بلاشبہہ وہ ایک محبِ وطن شخص تھے۔ محبِ وطن شخص وطن کے دشمنوں کے خلاف تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر بات نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا

۔ اگر وہ بھارت کے خلاف تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حب الوطنی کے جذبات سے سرشار تھے ۔ ان کی حب الوطنی یہ تقاضا کرتی تھی کہ وہ کھل کر اپنے موقف کا اظہار کریں ۔ اپنے خفا ہوں تو ہو جائیں ۔ غیر بے گانہ ہوں تو ہو جائیں ۔ مگر زہر ہلاہل کو قند نہ کہا جائے ۔

حمید گل مرحوم کھرے انسان تھے ۔ وہ کثیر المطالعہ شخص تھے ۔ایک دن میں دس اخباروں کا مطالعہ کرتے تھے ۔ وہ اس بات کا ضرور ادراک رکھتے ہوں گے کہ اس وقت پوری دنیا میں سیکولر ازم کا غلبہ ہے ۔ ایسے وقت میں ایک ایسے شخص کو، جس کی پوری زندگی پاک فوج جیسے مضبوط ادارے سے وابستہ رہی ہو، کھل کر مذہبی لوگوں کی حمایت کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے ۔ لوگ کیا کہیں گے ؟؟۔۔۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے ساری زندگی کھرے پن کا مظاہرہ کیا ۔ جسے صحیح سمجھا، اس کا برملا اظہار کیا ۔ مذہبی لوگوں کی کھل کر حمایت کی ۔ 11/9 کے بعد طالبان کو بھرپور سپورٹ کیا ۔ 2012ء میں دفاعِ پاکستان کونسل بنی تو دنیا نے دیکھا کہ آئی ایس آئی کے سابق چیف "مولویوں" کے ساتھ کھڑے ہوگئے ۔ لوگوں نے طعنے سنائے ۔ انھیں بھٹکا ہوا راہی قرار دیا ۔ مگر انھوں نے وہی کیا، جس پر ان کا ضمیر مطمئن تھا ۔ لوگوں کے طعنوں اور "حقائق کا ادراک" رکھنے والے "دانشوروں" کی باتوں نے ان پر ذرا اثر نہیں کیا ۔

جنرل حمید گل مرحوم 20 نومبر 1936 ء کو پیدا ہوئے۔ 1954 ء میں انھوں نے آرمی جوائن کی۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم دور 1987 ء سے 1989 ء تک کا ہے۔ اس دوران وہ پاکستان کی سب سے اہم انٹیلیجنس ایجنسی آئی ایس آئی کے سربراہ رہے۔ انھیں ضیاء الحق مرحوم نے آئی ایس آئی کا سربراہ بنایا تھا۔ شروع سے ہی ان کا جھکاؤ مذہب کی طرف زیادہ تھا۔ ان کے ناقدین ان پر دو وجوہات کی بناء پر تنقید کرتے ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انھوں نے 1988 ء میں، جب کہ وہ آئی ایس آئی کے سربراہ تھے، انتخابات میں پیپلز پارٹی کو شکست دینے کے لیے اسلامی جمہوری اتحاد کی تشکیل کرنے والوں کا ساتھ دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انھیں "فادر آف طالبان" سمجھا جاتا تھا۔ اپنی بات کروں تو مجھے فادر آف طالبان کا خطاب صرف مولانا سمیع الحق صاحب پر جچتا ہے۔ "فادر آف طالبان" ایک انگریزی لفظ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انھیں یہ خطاب انگریز سرکار نے دیا۔ انگریز کی اصطلاح 11/9 سے پہلے تک برطانوی گوروں کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ مگر آج کل یہ اصطلاح امریکی گوروں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں دیسی سے زیادہ بدیسی اشیاء زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ یہ بات صرف اشیاء تک محدود نہیں۔ اس عمل کا دائرہ کار علم، عقل اور افکار تک جا پہنچا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ امریکا نے انھیں فادر آف طالبان کہا تو ہمارے لوگوں نے بھی کہنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا جھکاؤ طالبان سے زیادہ گلبدین حکمت یار گروپ کی طرف تھا۔ جب وہ

آئی ایس آئی کے سربراہ تھے تو اس وقت طالبان کا وجود ہی نہیں تھا۔ افغان طالبان کا ظہور ان کی فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد ہوا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ 2001ء میں جب نہتے افغانیوں پر امریکا نے بم باری کی تو اب وہ اس گروپ میں کھڑے ہوگئے، جو امریکا کا مخالف، اور طالبان کے موافق تھا۔ انھوں نے ہر پلیٹ فارم پر بڑی بے باکی اور جراءت سے امریکا کی مخالفت کی۔ امریکا کی ایک عادت یہ ہے کہ جو بھی اس کے خلاف بات کرے، وہ اس کو بہت سے القابات سے نوازتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی امریکا کے حلیف انڈیا کے خلاف اپنے موقف کا کھل کر اظہار کرے تو امریکا اسے بھی آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔ اس ضمن میں امریکا حافظ محمد سعید صاحب کو عالمی دہشت گرد قرار دے چکا ہے۔ حالاں کہ کشمیر کے بارے میں ان کا موقف پاکستان کے موقف کے عین مطابق ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ رب تعالیٰ حمید گل کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

(آمین)

## ڈیمین موران کا جراء ت مندانہ اقدام

انصاف یہ ہے کہ برا کام اپنے بھی کریں تو مذمت کی جائے اور اچھا کام غیر بھی کریں تو تعریف کی جائے۔ یہ انصاف نہیں کہ اگر کوئی ان جان یا آپ کا حریف کوئی اچھا کام کرے تو اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی ناانصافی ہے کہ آپ کا کوئی جاننے والا یا آشنا یا آپ کی قوم کا فرد کوئی برا کام کرے تو آپ اس کی حمایت میں بولنے لگیں۔ غیر جانب داری بھی اسی عمل کا نام ہے کہ آپ انصاف کا ثبوت دیتے ہوئے مذمت اور تعریف کا وہ معیار اپنائیں، جس کا ذکر اوپر کی سطروں میں ہوا ہے۔ پچھلے دنوں ایک خبر نے میری ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرادی۔ اس خبر سے معلوم ہوا کہ ایک برطانوی شہری نے اسرائیلی وزیرِ اعظم بنجمن نیتن یاہو کے خلاف آن لائن پٹیشن دائر کر دی۔ ظاہر ہے، اس خبر کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ میری دانست میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ اسرائیل جیسے ملک کے وزیرِ اعظم کے خلاف کسی عام شہری نے اس طرح کا جراء ت مندانہ اقدام کیا ہو۔ پھر یہ شخص مسلمان نہ ہو تو یہ بات مزید عجیب لگتی ہے۔ اسی دن ہی میں نے ذہن بنا لیا کہ اس موضوع پر ضرور لکھنا چاہیے۔ ڈیمین

موران کے اس جرائے ت مندانہ اقدام کو جتنا سراہا جائے، کم ہے۔

اسرائیل اور فلسطین کے درمیان نصف صدی سے کشا کش جاری ہے۔ جب بھی اسرائیل اور فلسطین کی محاذ آرائی ہوئی ہے، اسرائیل کا پلڑا بھاری رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عالمی طاقتوں نے ہر محاذ پر اسرائیل کی حمایت کی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسرائیل ہی قصور وار ہے۔ اقوامِ متحدہ میں امریکا اسرائیل کے خلاف جانے والی ہر قرار داد کو ویٹو کر دیتا ہے۔ در حقیقت فلسطین کی سرزمین پر آزادی کا سورج اسی وقت طلوع ہوگا، جب عالمی طاقتیں اسرائیل کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں گی۔ اسرائیل کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا تو بہت بڑی بات ہے، صرف اسرائیل کے ضمن میں عالمی طاقتیں خود کو غیر جانب دار کر دیں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اس وقت حال یہ ہے کہ اسرائیل جب چاہتا ہے، فلسطین پر گولا باری شروع کر دیتا ہے۔ جس طرح کشمیر کا مسئلہ جنوبی ایشیا کا سب س اہم مسئلہ ہے، اسی طرح فلسطین کا مسئلہ مشرق وسطیٰ کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں قیامِ امن کے لیے اسرائیل، فلسطین تنازعے کا حل ہونا ضروری ہے۔

اب آتے ہیں ڈیمین موران کی آن لائن پٹیشن کی جانب۔ اس پٹیشن کا سرنامہ یہ ہے:
جب بنجمن نیتن یاہو لندن پہنچیں تو انھیں جنگی جرائم کی بناء پر

گرفتار کیا جائے۔ سرنامے کے نیچے اس آن لائن پٹیشن کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ بین الاقوامی قانون کے تحت 2014ء میں 2000 عام شہریوں کے قتلِ عام کی وجہ سے.برطانیہ میں آمد کے موقع پر بنجمن نیتن یاہو کو گرفتا کر لینا چاہیے۔ ڈیمین موران کا اشارہ جولائی 2014ء میں غزہ پر ہونے والی اس بے رحم اسرائیلی بم باری کی طرف تھا، جس نے 2200 فلسطینیوں کی جان لے لی تھی۔ اقوامِ متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق اکیاون روز تک جاری رہنے والی اس جنگ میں فلسطین کے 1500 عام شہری ہلاک۔۔۔ میرے مطابق شہید ہوئے تھے۔ جن میں 283 عورتیں اور بچے تھے۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ یہ بھی بتاتی ہے کہ اس جنگ میں اسرائیل کے 521 صرف 70 شہری ہلاک ہوئے تھے۔ جب کہ الجزیرہ کی ایک خبر کے مطابق اسرئیل کے شہریوں نے اس جنگ میں جان کی بازی ہاری۔ جن میں 66 فوجی تھے اور 5 71 عام شہری تھے۔ ایک طرف 2200 انسانوں کی موت ہے۔۔۔ دوسری طرف 70 یا لوگوں کی ہلاکتیں ہیں۔ انصاف آپ ہی کر دیجیے۔ کون ظالم ہے اور کون مظلوم 71 ؟؟

اگست 2015ء کو الجزیرہ نے اپنی سائٹ پر ڈیمین موران کی پٹیشن سے متعلق خبر 23 شائع کی تو اس وقت اس پٹیشن کو 76 ہزار ووٹ مل چکے تھے۔ 25 اگست کو پاکستان کے انگریزی اخبار روزنامہ ڈان کی ویب سائٹ نے اس موضوع پر خبر نشر کی تو معلوم ہوا کہ ووٹوں کی تعداد 80 ہزار ہو چکی ہے۔ جس سے ڈیمین موران

کی اس آن لائن پٹیشن کی پذیرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نیوز ویک ڈاٹ کام کی 26 اگست کو شائع ہونے والی ایک خبر بتاتی ہے کہ اس آن لائن پٹیشن نے 85 ہزار ووٹ لے لیے۔ یعنی صرف ایک دن میں 5 ہزار ووٹ مل گئے۔ یہ کالم لکھنے سے پہلے میں نے اس آن لائن پٹیننشن کے ووٹوں کو چیک کیا تو ان کی تعداد نواسی ہزار سات سو ساٹھ تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس آن لائن پٹیشن پر ووٹ ڈالنے کے لیے برطانوی شہری ہونا شرطِ اول ہے۔ برطانوی قانون کے تحت اگر اس پٹیشن کو 7 فروری 2016 ء تک ایک لاکھ ووٹ مل گئے تو اس پر برطانیہ کے پارلیمنٹ میں بحث کی جا سکے گی۔

اسرائیلی وزیرِ اعظم کے خلاف آن لائن پٹیشن دائر کرنے والے ڈیمین موران کہتے ہیں کہ مجھے اپنی اس مہم سے کوئی خاص توقع نہیں ہے۔ بین الاقوامی عدالتی اختیارات کی وجہ سے مجھے نہیں لگتا کہ بنجمن نیتن یاہو کو گرفتار کیا جا سکے گا۔ میں صرف غزہ پر ہونے والے اسرائیل کے ملٹری حملے کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ڈیمین موران اپنے ملک کی حکومت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ برطانیہ کے سیاست دان اسرائیل کی حمایت کرتے ہیں۔ وزیرِ اعظم ڈیوڈ کیمرون بھی اسرائیل کے حمایتی ہیں۔ برطانوی حکومت نے حال ہی میں اسرائیل سے ہتھیاروں کا معاہدہ کیا۔

ڈیمین موران کا موقف اس وقت حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا، جب برطانوی حکومت کی طرف موقف آیا کہ بنجمن نیتن یاہو کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ جب وہ برطانیہ میں قدم رنجہ فرمائیں گے تو انھیں سفارتی استثنا حاصل ہوگا۔ لہٰذا "قانون" کہتا ہے کہ انھیں گرفتار نہ کیا جائے۔ یہ قانون بھی عجب الجھیڑا ہے۔ ڈیمین موران کا قانون کہتا ہے کہ اسرائیلی وزیرِاعظم کو گرفتار کیا جائے۔ سفارتی قانون کہتا ہے کہ انھیں گرفتار نہ کیا جائے۔

آخر میں میں ایک بار پھر میں ڈیمین موران کے اس جرء ات مندانہ اقدام کو سراہتا ہوں۔

## "کس قوم کو للکارا ہے؟"

6 ستمبر 1965 ء کا دن پاکستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ آج سے ٹھیک پچاس سال قبل اس دن پاکستان نے اپنے سے پانچ گنا بڑے دشمن کو شکست دے دی تھی۔ پوری دنیا ورطۂ حیرت میں تھی کہ پاکستان نے اتنا بڑا کام کیسے کر دیا۔ کیوں کہ بھارت ہم سے ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ اس کے پاس فوج بھی زیادہ تھی۔ اسلحہ بھی زیادہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ پاکستان کے ایک علاقے پر بھی قبضہ نہ کر سکا۔ اسے ہر جگہ منھ کی کھانی پڑی۔ 17 دنوں تک جنگ جاری رہی۔ بالآخر پاکستان کو فتح حاصل ہو گئی۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض شعبے ایسے بھی تھے جس میں بھارت ہم پر 11 گنا برتری کا حامل تھا۔ پاکستان نے مصلحت کا ثبوت دیتے ہوئے اس جنگ میں پہل کرنے سے گریز برتا۔ یہ بھارت تھا، جس نے جنگ میں پہل کرتے ہوئے زندہ دلوں کے شہر لاہور پر دھاوا بول دیا۔ مگر اس کے قبضے کی کوشش ناکام ہو گئی۔

1965ء کی جنگ میں ہمیں فتح کیوں حاصل ہوئی؟ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ لیکن سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم من حیث القوم متحد تھے۔ اسی اتحاد نے ہمیں فتح سے ہم کنار کیا۔ کیا حزبِ اقتدار۔۔ کیا حزبِ اختلاف۔۔۔ کیا حکومت۔۔۔

کیا عوام ۔۔۔ سب کے سب جنرل ایوب کے جملے "انھوں نے کس قوم کو للکارا ہے ۔" پر متحد و متفق ہو گئے ۔ سب کا مطمعِ نظر یہ بن گیا کہ اب بھارت کو ضرور شکست دینی ہے ۔ کیوں کہ بھارت پاکستان پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر ہم اس جنگ میں نا اتفاقی اور انتشار کا ثبوت دیتے تو ہم کبھی بھی یہ معرکہِ حق نہ جیت سکتے ۔

1965 ء کی جنگ میں ہم نے بہت سے کارنامے سرانجام دیے ۔ اس جنگ کے حوالے سے کئی کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جاتی رہیں گی ۔ اپنوں اور غیروں ، سب نے ہمارے کارناموں کو داد دی ۔ اس چھوٹی سی تحریر میں ان تمام کارناموں کا مکمل ذکر محال ہے ۔ الطاف حسن قریشی لکھتے ہیں : " ہماری فضائیہ جس کی تربیت ائیر مارشل اصغر خان نے کی تھی اس نے اس سترہ روزہ جنگ میں 35 بھارتی طیارے آمنے سامنے کی جنگ میں ، 43 ہوائی اڈوں پر اور 32 بھارتی طیارے پاکستانی طیارہ شکن توپوں کے ذریعے تباہ کیے ۔ اس کے علاوہ ہماری فضائیہ نے دشمن کے 149 ٹینک 600 بڑی گاڑیاں 60 توپیں تباہ کر ڈالیں ۔ ان کے مقابلے میں پاکستان کے 19 طیارے تباہ ہوئے ۔ "اس کے علاوہ محمد محمود عالم المعروف بہ ایم ایم عالم سے کون واقف نہیں ، جنھوں نے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہندوستان کے پانچ جنگی طیارے مار گرائے ۔ جنگوں کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی ۔ 1965 ء کی جنگ کا جب بھی ذکر ہوگا ، راجا عزیز بھٹی شہید کا

ذکر بھی ضرور ہوگا۔ جنھوں نے دفاعِ وطن کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ بڑی بہادری اور دلیری سے پیش کیا، اور دشمن کی پیش قدمی کو روکا۔

آج 6 ستمبر کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جائے گا۔ میں یہاں تفصیل میں جانے کا رسک " نہیں لے سکتا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ پچاس سال گزرنے کے بعد بھارت ایک " بار پھر پاکستان کو للکار رہا ہے۔ 2003ئے؁ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ ہوا تھا۔ مگر اس جنگ بندی کے معاہدے کے باوجود بھارت کئی بار کنٹرول لائن اور ورکنگ باؤنڈری پر اس معاہدے کی دھجیاں بکھیر چکا ہے۔ جب سے پاک چین معاہدہ ہوا ہے، بھارت کے اشتعال میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ رواں سال اگست کے مہینے میں بھارت نے 90 بار اس جنگی معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ جس میں 20 پاکستانی شہری شہید اور 97 زخمی ہوئے۔ جب کہ جولائی میں 36 بار بھارت نے خلاف ورزی کی۔ جولائی میں 36 بار اور اگست میں 90 بار۔۔۔ نہ جانے اس وقت بھارت پر کیوں جنگی جنون سوار ہے؟

بھارت کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جب ہم پر کوئی دشمن ٹوٹ پڑتا ہے تو ہم سب متحد ہوجاتے ہیں۔ ہم مشتعل قوم نہیں ہیں۔ ہم اپنے پڑوسیوں سے بنا کر رکھتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ بھارت اس معاہدے کی پاس داری کرے۔ تاکہ امن کو فروغ ملے اور دونوں ملکوں کے باسی سکون کے ساتھ رہیں۔ آخر کنٹرول لائن

اور ورکنگ باؤنڈری پر اشتعال سے بھرپور فائرنگ کا کیا جواز ہے۔ بھارت کو یہ بات بھی سمجھنی چاہیے کہ جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ جنگ سے دونوں طرف اموات واقع ہوں گی۔ جانی نقصان ہوگا۔ مالی نقصان ہوگا۔ دلوں کی کدورتیں بڑھیں گی۔ بہتر یہی ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان ہم سایوں جیسے تعلقات ہوں۔ ہم نے بھی آپ کے پہلو میں رہنا ہے اور آپ نے بھی ہمارے پہلو میں رہنا ہے۔

# وہ جو سوئے حرم چلے اور واپس نہ آئے

قوی ارادہ تھا کہ اس دفعہ سپریم کورٹ کے اردو کے حق میں دیے گئے فیصلہ پر لکھوں گا ۔کیوں کہ پچھلے دنوں معلوم ہوا کہ سپریم کورٹ نے اردو کو سرکاری و دفتری زبان کے طور پر رائج کرنے کا حکم دے دیا۔ظاہر ہے کہ یہ خبر مجھ جیسے اردو کے شائق کے لیے ایک بہترین خبر تھی ۔لیکن بروزِ ہفتہ کے اخبارات کی سیاہ سرخیوں نے ارادہ یکسر تبدیل کر دیا۔ کبھی کبھی یوں ہی ہوتا ہے کہ اخیر لمحے میں موضوع تبدیل کرنا پڑتا ہے ۔ پھر کالم جتنے تازہ موضوع پر ہوگا، اتنی ہی لوگوں کی توجہ حاصل کرے گا۔ اس کے علاوہ میرا نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ حرمِ پاک سے مسلمانوں کا روحانی اور دینی رشتہ ہے۔ اگر وہاں کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو اس پر ضرور لکھنا چاہیے ۔

یہ سانحہ کس طرح رونما ہوا ؟ یہ نہایت اہم سوال ہے۔ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے متحدہ عرب امارات کی ویب سائٹ العربیہ ڈاٹ نیٹ کی اردو سروس سے مدد لیتے ہیں ۔العربیہ ڈاٹ نیٹ کے مطابق، "شام پانچ بج کر دس منٹ پر نمازی اور عازمینِ حج مسجدِ حرام میں نمازِ مغرب کے لیے جمع ہونا شروع ہوئے تو موسم نہایت خراب تھا۔ گرج چمک کے ساتھ تیز بارش اور آندھی ایک

ریلے کی شکل میں جاری تھی ۔ماہرین موسمیات کے مطابق تیز بارش کے ساتھ ساٹھ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے آندھی چل رہی تھی۔ موسم کی خرابی کے پیش نظر محکمہ موسمیات و تحفظ ماحولیات کی جانب سے پیشگی احتیاطی تدابیر کی سخت تاکید بھی کی گئی تھی۔ خاص طور پر مقامات مقدسہ اور مکہ مکرمہ میں عازمین حج کے تحفظ کے لیے سخت اقدامات کیے گئے تھے۔ اسی اثناء میں مسجد حرام کی مشرقی سمت میں زیر تعمیر حصے میں لگی میٹر بلند کرین ٹوٹ کر مسجد کے اندرونی احاطے میں آ گری۔ دسیوں ٹن وزنی کرین 60 کے گرنے سے مسجد حرام کا مشرقی حصہ اس کی زد میں آیا۔ حادثے کی وجہ سے مطاف اور مسعی بھی متاثر ہوئے۔" متحدہ عرب امارات کی ویب سائٹ العربیہ نے اس اس حادثے کی ایک فرضی ویڈیو بھی بنائی، جس سے اس حادثے کی پوری نوعیت اور تفصیل جانی جا سکتی ہے۔

تازہ اطلاعات کے مطابق اس حادثے میں اب تک 107 افراد شہید اور 238 افراد زخمی ہو گئے ہیں۔ بعض ذرائع کے مطابق شہید ہونے والوں میں ایک پاکستانی بھی تھے۔ جب کہ بعض ذرائع کہتے ہیں کہ 52 پاکستانی زخمی ہوئے ہیں۔ جن میں سے چھے کی حالت نازک ہے۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شہید ہونے والوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ ان کے مرحومین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور زخمیوں کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ بے شک یہ خوش قسمت ترین لوگ

تھے۔ جو مناسکِ حج کی ادائیگی کے لیے سوئے حرم گئے۔ لیکن پھر انھیں اس مقدس مقامات میں موت آ گئی۔ اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ یہ سعادت بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم دراصل مادی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں، جو روحانیات اور وجدان کے اسرار ورموز سمجھتے ہیں۔ ہم اگر مادی نقطۂ نگاہ سے اس واقعے کو دیکھیں گے تو ہمیں غم بھی ہوگا۔ افسوس بھی ہوگا۔ دل رنجیدہ بھی ہوگا۔ غصہ بھی آئے گا۔ لیکن اگر ہم اس واقعے کو روحانی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو ہمیں نہ غم ہوگا، نہ افسوس۔ نہ دل رنجیدہ ہوگا، نہ غصہ آئے گا۔ یہ جو اوپر کی لائن میں میں نے اپنے ان شہید ہونے والے بھائیوں کے لیے "خوش قسمت ترین لوگ" کا فقرہ استعمال کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اس وقعے کو روحانی نقطۂ نگاہ سے دیکھا تو مجھے یہ خوش قسمت ترین لوگ ہی محسوس ہوئے۔

کچھ لوگ سعودی حکومت پر سخت تنقید کر رہے ہیں۔ ان کے خیال میں اس واقعے کی ذمہ دار سعودی حکومت ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اس نوعیت کا واقعہ پہلے کبھی نہیں ہوا۔ یہ بالکل صحیح بات ہے کہ اس طرح کا واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان دنوں حرم پاک کی توسیع کا کام جاری ہے۔ سعودی حکومت گاہے بگاہے حرم پاک کے توسیعی منصوبوں پر کام کرتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آئے سال حجاج کی تعداد میں اضافہ

ہوتا جارہا ہے۔ سعودی حکومت کو حجاج اکرام کی سہولت کے لیے یہ کام لازما کرنا پڑتا ہے۔جب کرین گرنے کا حادثہ پیش آیا تو اس وقت بھی 22 لاکھ حجاج کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے حرم مکہ کی تاریخ کے سب سے بڑے توسیعی منصوبے پر کام جاری تھا۔یہ بھی واضح رہے کہ جس وقت یہ حادثہ پیش آیا، اس وقت موسم کی صورت حال بہت خراب تھی۔ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم کیوں کر سعودی حکومت کو دوش دے سکتے ہیں۔ لیکن ان تمام حقائق کے باوجود یہ ضروری ہے کہ اس واقعے کی پوری پوری تحقیقات کرائی جائیں۔مکہ مکرمہ کے گورنر بھی کہہ چکے ہیں کہ اس واقعے کی پوری پوری تحقیقات ہوں گی۔ سعودی حکومت کی سیاسی پالیسیوں سے قطعِ نظر ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ رب تعالیٰ نے اپنے گھراور اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آرام گاہ کی خدمت کا کام سعودی حکومت کے ہی سپرد کیا ہوا ہے۔ اور سعودی حکومت یہ کام بہ حسن و خوبی سرانجام دے رہی ہے۔

## بڈھ بیر کا سانحہ

جمعۃ المبارک کے بابرکت دن کو پاکستان میں ایک اور سانحہ ہوا۔ پشاور کے علاقے بڈھ بیر میں پاک فضائیہ کے کیمپ پر دہشت گردوں نے حملہ کیا۔ جس کے نتیجے میں 30 افراد شہید اور 29 زخمی ہو گئے۔ جب کہ دوسری طرف 13 حملہ آور ہلاک کر دیے گئے۔ حملہ آوروں نے ایف سی کی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ یہ حملہ آور فجر کے وقت کیمپ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے آتے ہی مسجد میں موجود نمازیوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ کے ساتھ ساتھ دستی بموں سے حملہ بھی کیا۔ جس کی وجہ سے 16 نمازی شہید اور 10 زخمی ہو گئے۔ پھر پاک فوج کے جوانوں اور حملہ آوروں کے درمیان دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ حملہ آوروں کے عزائم خطر ناک تھے۔ وہ پاک فضائیہ کے افسران کے گھروں تک پہنچ کر ان کے بچوں کو یر غمال بنانا چاہتے تھے۔ اگر پاک سکیورٹی فورسز کے جوان بر وقت کارروائی نہ کرتے تو شاید یہ حملہ آور اپنے مقاصد میں کام یاب ہو جاتے۔ قدرے توقف کے بعد کوئیک ریسپانس فورس کے دستوں نے پہنچ کر پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ اور حملہ آوروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حملہ آوروں کے خلاف پاک فضائیہ کے دو ٹیکنیشن بھی آخر وقت تک لڑتے رہے۔ بالآخر دونوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ حالاں کہ ٹیکنیشن کا کام لڑنا نہیں

ہوتا۔ مگر آفرین ہے ان دو ٹیکنیشنز کو، جنھوں نے لڑتے لڑتے جان دے دی۔
یہاں دو نوجوانوں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ ان میں سے ایک نوجوان کیپٹن اسفند یار بخاری ہیں۔جو حملہ آوروں کے خلاف فرنٹ لائن پر لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ وہ اپنی جان کی پرواکیے بغیر لڑتے رہے۔ بالآخر جام شہادت نوش کیا۔ کیپٹن اسفندیار بخاری کا تعلق پاکستان کے علاقے ضلع اٹک سے تھا۔ وہ 14 اگست 1988ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پی ایس کیڈٹ کالج حسن ابدال سے حاصل کی۔ ان کا شمار بہترین کیڈٹس میں ہوتا تھا۔انھیں 25 اکتوبر 2008ء کو پاسنگ آؤٹ پریڈ میں سابق آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے اعزازی شمشیر عطا کی۔ کیپٹن اسفند یار بخاری بہترین کھلاڑی بھی تھے۔ وہ پنجاب انڈر 19 کی ہاکی ٹیم کے لیے بھی کھیلتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ زمانہِ طالب علمی میں کالج کی شطرنج ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے والد ڈاکٹر فیاض بخاری نے ان سے متعلق بڑی اچھی باتیں بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ اسفندیار نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ اسفندیار کو ملنے والی اعزازی تلوار حق کی تلوار تھی، جو دشمن پر گری۔ دوسرے شہید ہونے والے نوجوان شان علی شوکت ہیں ۔ شان علی شوکت کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔ وہ 1990ء میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ ماہ قبل ہی ان کی شادی ہوئی تھی۔ 6 سال قبل ایئر فورس جوائن کی تھی۔ 7 ستمبر کو ایک ماہ کی چھٹیاں گزار کر گھر سے آئے

تھے۔ یہ اگرچہ ٹیکنیشن تھے۔ لیکن حملہ آوروں کے خلاف بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ ان کے چھوٹے بھائی اسامہ کا کہنا تھا کہ انھیں اپنے بھائی کی شہادت پر فخر ہے۔ اس کے علاوہ جماعتِ نہم کے اس طالبِ علم نے اپنے بڑے بھائی کی طرح ملک و قوم کی خاطر اپنی جان تک وار دینے کے بلند پایہ عزم کا اظہار بھی کیا۔ ایسے نوجوان واقعی خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ جو عین شباب کے عالم میں جان کی پروا کیے بغیر ملک و قوم کے لیے جان تک قربان کر دیتے ہیں۔

ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے کہ حملہ آوروں نے فوجیوں کی وردیاں پہن کر حملہ کیا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا، جب حملہ آوروں نے اس طرح بھیس بدل کر حملہ کیا۔ پاک فوج کو اس نکتے پر نظر مرکوز رکھنی چاہیے۔ بڈھ بیر میں پاک فضائیہ کے کیمپ پر ہونے والا حالیہ حملہ اس امر کی بھی نشان دہی کرتا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ابھی تک یہ جنگ ختم نہیں ہوئی۔ یہ جنگ روایتی جنگ سے بھی زیادہ شدید ہے۔ یہ نظریات کی جنگ ہے۔ روایتی جنگ سے زیادہ شدید نظریات کی جنگ ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر 65ء اور 71ء کی جنگ میں ہمارا اتنا نقصان نہیں ہوا، جتنا اب کے ہوا ہے۔ اس جنگ میں ہم ساٹھ ہزار سے زائد جانیں گنوا چکے ہیں۔ ہماری معیشت مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ جانے اور کیا کیا کرنا پڑے گا۔ یہ حملہ آور بہ آسانی اپنے ٹارگٹ تک

پہنچ گئے۔ اس پر بھی کافی سوچ و بچار کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر یہ کس طرح بہ آسانی پاک فضائیہ کے کیمپ تک پہنچ گئے۔ نہ صرف پہنچ گئے، بلکہ کافی سارا جانی نقصان بھی کر دیا۔ بڈھ بیر میں پاک فضائیہ کے کیمپ پر حملہ ہونے کے بعد پاک فوج کے ترجمان میجر جنرل عاصم باجوہ نے بتایا کہ اس حملے کی منصوبہ بندی افغانستان میں کی گئی۔ پاک فوج کے ترجمان کے اس بیان کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے بہت سے دشمن بیرون ملک بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ بہ آسانی ہم پر حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان سے نمٹنا از حد ضروری ہے۔ یہ ہمارے لیے بہت خطرناک ہیں۔ مستقبل میں جب ہماری سکیورٹی فورسز کے افسران دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے منصوبہ بندی کریں تو یہ سب باتیں ملحوظ رکھ کر کریں۔ تاکہ دہشت گردی کے ممکنہ خطرات سے مکمل طور پر بچا جا سکے۔

# خطبۂ حج۔۔۔سانحۂ منیٰ

وقوفِ عرفہ کے دوران سعودی مفتیِ اعظم شیخ عبدالعزیز آل الشیخ نے خاص طور پر فریضۂ حج ادا کرنے والوں کو اور عام طور پر پوری امتِ مسلمہ کو بڑا بصیرت افروز خطبہ دیا۔ اگر اس خطبے میں کہی گئیں باتوں پر عمل کیا جائے تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ شیخ عبدالعزیز آل الشیخ نے اس خطبۂ حج میں اسلام کی حقیقی تصویر کشی کی۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات امن، محبت اور آشتی کا درس دیتی ہیں۔ لیکن اسلام کے دشمن دنیا کو یہ باور کرانے کے درپے ہیں کہ اسلام معاذ اللہ جنگ و جدل کا درس دیتا ہے۔ اسلام بہت سخت مذہب ہے۔ جب کہ کچھ اپنے لوگ بھی ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں اسلام کی تعلیمات اب فرسودہ ہو گئیں ہیں۔ اس لیے یہ قابلِ عمل نہیں رہیں۔ ہمارے ہاں بہت سے لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ اسلام صرف عبادات تک محدود رہے۔ معاملات میں ہمیں مغرب اور دیگر ترقی یافتہ اقوام کی پیروی کرنی چاہیے۔ حالاں کہ یہ سوچ درست نہیں ہے۔ اسلام عبادات اور معاملات دونوں کا مجموعہ ہے۔ اسلام عبادات کا بھی درس دیتا ہے اور معاملات کو بھی بہ حسن و خوبی سرانجام دینے کے طریقے اور سلیقے سکھاتا ہے۔ ہماری حقیقی کام یابی صرف اور صرف اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل کرنے میں ہے۔

بات کہاں سے چلی اور کہاں پہنچ گئی۔ سعودی مفتیِ اعظم شیخ عبدالعزیز آل الشیخ نے خطبہِ حج کے دوران امتِ مسلمہ کو جو نصیحتیں کیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں: انھوں نے کہا کہ نوجوانوں کو انارکی پھیلانے والوں کی آوازوں پر کان نہیں دھرنے چاہئیں۔ اس کے بجائے انھیں تعمیری سرگرمیوں پر اپنی توانائیاں صرف کرنی چاہئیں اور اسلام کے حقیقی پیغام کو پھیلانا چاہیے۔ حضرت محمد ﷺ نے ہر قسم کی ناانصافیوں کو حرام قرار دیا ہے اور کوئی بھی انسان دوسرے انسان کی ناحق جان لینے کا حق نہیں رکھتا۔ قبلہِ اول کو آزاد کرانے کے لیے ہماری کوششیں کم زور پڑ چکی ہیں۔ مقہور مسلمان صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں۔ کیوں کہ ان کی مشکلات کے خاتمے کا وقت قریب ہے۔ دشمنانِ اسلام، اسلام کا لبادہ اوڑھ کر دنیا میں فساد پھیلانے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور داعش ایک گمراہ گروہ ہے جو اسلام کے نام پر امت کو تباہ کرنے میں لگا ہے۔ ایسے وقت میں علماء پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بہتر انداز میں دین کی دعوت عام کریں اور تبلیغِ دین میں اپنا کردار ادا کریں۔ یہودی اسلامی قوتوں اور دین و اخلاق کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ آج امتِ مسلمہ فساد کی لپیٹ میں ہے۔ اے مسلمانو! دینِ اسلام ہی وہ دین ہے جس نے مسلمانوں کو متحد کیا ہے۔ ہمیں اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اتحاد و یک جہتی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ ہماری عبادتیں اخلاص پر مبنی ہونی چاہئیں

۔ اللہ کی نظر میں اسلام حق اور سچ کا دین ہے۔ والدین اپنی اولاد کی اچھی تربیت کریں۔ اے لوگو! اللہ کا شکر ادا کرو۔ اسلامی تعلیمات اختیار کرو اور گناہوں سے بچو۔ عبادتیں خالص اللہ کے لیے ہونی چاہئیں۔ وہ جسے چاہے دولت دے اور جس سے چاہے دولت واپس لے لے۔ اے مسلمانو! تقویٰ اختیار کرو اور شرک و بدعت سے بچو۔ جس کا نتیجہ جہنم کے سوا کچھ نہیں۔ سعودی مفتیِ اعظم نے صحافیوں کو یہ بھی نصیحت کی کہ وہ صرف حق کی آواز عوام تک پہنچائیں۔

درج بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعودی مفتیِ اعظم نے بڑے جامع انداز میں اسلام کی حقیقی تعلیمات کی منظر کشی کی ہے۔ انھوں نے بڑے دلنشین انداز میں خطبہِ حج کا پیغام ہم تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن اصل چیز عمل ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ہر اچھی بات بڑے ادب سے سن لیتے ہیں۔ وقتی طور پر اس کا تھوڑا تھوڑا اثر بھی ہم پر ہو جاتا ہے۔ لیکن عمل کے میدان میں ہم ہمیشہ پیچھے رہتے ہیں۔ شاید اسلام کے ضمن میں عمل کے میدان میں پیچھے رہنے کا ہی شاخسانہ ہے کہ غیروں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اب اسلام کی تعلیمات قابلِ عمل نہیں رہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں ہی کچھ ایسے عناصر ہیں، جو اسلام کی حقیقی تعلیمات کو صحیح معنوں میں پیش نہیں کر رہے۔ جس کی وجہ سے غیر مسلم اقوام نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اسلام معاذاللہ جبر و تشدد کا درس دیتا ہے ۔غیر مسلم اقوام کو سمجھنا چاہیے کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کا سب

سے بڑا منبع قرآنِ حکیم ہے۔ پھر ہمارے رسول اکرم ﷺ کی اسوہِ حسنہ ہے۔ قرآنِ حکیم میں "دین میں کوئی جبر نہیں "اور " تمھارے لیے تمھارا دین، اور ہمارے لیے ہمارا دین " جیسی آفاقی تعلیمات ہیں۔ جب کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کی صفتِ رحمت کا سب سے بڑا مظہر فتحِ مکہ کا واقعہ ہے، جب آپ ﷺ نے اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو معاف کر دیا تھا۔

اس سال حج کے دوران ایک دوسرا سانحہ پیش آیا۔ جس میں جانی نقصان پہلے سانحے سے بھی زیادہ تھا۔ اب کی بار 769 نفوس شہید ہوئے۔ اور 934 زخمی ہو گئے۔ یہ واقعہ وادیِ منیٰ میں پیش آیا۔ جب حجاج اکرام شیطان کو کنکریاں مارنے جارہے تھے تو بھگدڑ مچ گئی۔ جس سے یہ اتنا بڑا نقصان ہوا۔ اس واقعے میں ایران اور مراکش کا سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ ایران کے ایک سو چھتیس اور مراکش کے ستاسی حجاج اکرام شہید ہوئے۔ ابتدائی اطلاعات کے مطابق کراچی کی دو خواتین سمیت 7 پاکستانی شہید ہوئے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حجاج اکرام کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور انھیں کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ بعض لوگ سانحہِ منیٰ کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے نازک مواقع پر ایسی نازک باتیں نہیں کی جاتیں۔ اس سال یہ دوسرا واقعہ ہوا ہے۔ ہم اس میں سعودی حکومت کو قصور وار نہیں ٹھہراتے۔ لیکن پھر بھی اس واقعے کی تحقیق کرنی چاہیے۔ اور کچھ ایسے

اقدامات اٹھانے چاہئیں کہ آئندہ ایسے واقعات نہ ہوں۔ اسی پر اکتفا ہے۔

## یولوجیس کی جنونی تحریک کا احوال

اندلس کے چوتھے اموی سلطان عبد الرحمان دوم کے عہدِ حکومت میں اندلس میں ایک عجیب و غریب جنونی تحریک کا آغاز ہوا۔ اگرچہ بہت سے مورخین نے اس کو "مذہبی جنون" قرار دیا ہے۔ مگر میں اسے "مذہبی جنون" نہیں، بلکہ "جنونی تحریک" کہوں گا۔ کیوں کہ کوئی مذہب اس طرح کے جنون کی اجازت نہیں دیتا۔ اگرچہ اس جنون کو اپنانے والا کتنا ہی مذہب کا نام لے۔ ہمارے ہاں یہ غلط فہمی عام ہو چکی ہے۔ جب لوگ مذہب کے نام پر شدت کو اپناتے ہیں تو ہم ایسے لوگوں کو "مذہبی شدت پسند" قرار دے دیتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ عام لوگ مذہب سے برگشتہ ہو جاتے ہیں اور نادانستہ طور پر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ واقعی مذہب ایسا ہی ہوتا ہے۔ دانشور طبقے کو چاہیے کہ مذہب کا نام لیتے ہوئے ذرا احتیاط سے کام لے۔

بات کہاں سے چلی اور کہاں پہنچ گئی۔ بات ہو رہی تھی عبد الرحمان دوم کے عہدِ حکومت میں اندلس کی ایک جنونی تحریک کی۔ اس تحریک کا مقصد رسول اکرم ﷺ، اسلام اور قرآن کریم کو معاذ اللہ سب و شتم کا نشانہ بنانا تھا۔ اسلامی دنیا میں ہمیں اس سے پہلے اس قسم کی تحریک کا احوال نہیں ملتا۔ گویا یہ

اسلامی دنیا کی پہلی جنونی تحریک تھی جس کے ماننے والے سر عام اسلام، قرآنِ مجید اور رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرتے تھے۔ اس تحریک کا آغاز شمالی اندلس کے عیسائیوں نے کیا۔ اس تحریک کا بانی قرطبہ کا ایک راہب یولو جیس تھا۔ لین پول کے مطابق اندلس میں عیسائیوں کو اپنے مذہبی مراسم آزادی سے انجام دینے کی جو رعایتیں حاصل تھیں، ان کی طبائع کی کج روی سے اس کا عجیب بر عکس قسم کا نتیجہ ظاہر ہوا۔ دراصل لین پول یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں نے عیسائیوں کو کھلم کھلا مذہبی آزادی دی تھی۔ انھوں نے اس کا غلط فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ عیسائی مذہب کی بنیادی تعلیمات کو مسخ کرکے پیش کیا اور رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس اور اسلام پر سب وشتم کا آغاز کر دیا۔ اب میں اس تحریک کے اولین لوگوں کا ذکر کرتا ہوں۔

یولو جیس:

جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں ذکر ہوا کہ اس تحریک کا بانی یولو جیس نامی قرطبہ کا ایک راہب تھا۔ اندلس کی عیسائی کیمونٹی میں اس کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ اس نے نوجوانوں میں عجیب و غریب تعلیمات پھیلائیں۔ اس کی تعلیمات یہ تھیں کہ جو شخص بھی دینِ اسلام اور اور اس کے داعی (ﷺ) پر سب وشتم کرے گا، تو اس کے نتیجے میں وہ قتل ہو جائے گا۔ (اسلامی تعلیمات کی رو سے رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والی کی سزا قتل ہے۔) جس سے اس کی

روح پاک ہو جائے گی۔ایسا شخص شہادت کے مرتبے پر فائز ہو جائے گا۔

یولو جیس کی اس جنونی تحریک کو کامیاب بنانے میں جن لوگوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان کا ذکر تفصیل سے یہاں نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہم اس کی تحریک کے تین اہم لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔

فلورا:

فلورا کا باپ مسلمان اور ماں عیسائی تھی۔ ماں کی تعلیم نے فلورا کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ فلورا کا بھائی تو اپنے دین پر قائم رہا۔ مگر وہ عیسائی بن گئی۔ ایک دن وہ گھر سے بھاگ نکلی اور عیسائیوں کے درمیان رہنے لگی۔ جب اس کے فرار ہونے کی ذمہ داری عیسائی پادریوں پر لگی تو وہ گھر واپس آئی۔ اور اپنے عیسائی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بھائی نے اس کو سمجھایا۔ مگر وہ نہ مانی۔ معاملہ شرعی عدالت تک گیا تو قاضی نے اس کو درے لگوائے اور شرعی حکم کے مطابق اس کو گھر واپس کیا کہ اس کے سامنے اسلام دوبارہ پیش کیا جائے۔ مگر وہ فرار ہو گئی۔ اور کسی عیسائی کے گھر میں رہنے لگی۔ یہاں پہلی مرتبہ اس کی ملاقات یولو جیس سے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کے دلوں میں مسیحی رشتے کی معصوم اور پاک محبت پیدا ہو گئی۔اس طرح فلورا یولو جیس کی جنونی تحریک میں شامل ہو گئی۔

:پر فیکٹس

پر فیکٹس نامی پادری پر یولوجیس کی جنونی تحریک کا گہرا اثر مرتب ہوا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی جان دے دی۔ یہ پادری عید کے دن مسلمانوں کے مجمعے میں گھس گیا۔ اور دینِ اسلام اور رسولِ اکرم ﷺ کی شان میں گستاخانہ کلمات زبان سے نکالنے لگا۔ ظاہر ہے، اس طرح کی حرکت سے مجمعے کا مشتعل ہونا ایک فطری عمل تھا۔ لوگوں نے اس پادری کا کام تمام کر دیا۔ قرطبہ کا بشپ اس کی لاش اٹھالے گیا۔ اور سینٹ کسکلس میں مسیحی تبرکات کے ساتھ اس کو دفن کیا گیا۔ عیسائیوں نے اس پادری کو شہیدِ ملت کا درجہ دے دیا۔

:آئیزک

ائزک بھی ایک پادری تھا۔ اس نے بھی یولوجیس کی مذہبی تحریک کے زیرِ اثر اپنی جان تک گنوا دی۔ یہ پادری ایک دن مسلمانوں کی عدالت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن جب اس کے سامنے اسلام کے عقائد بیان کیے گئے تو اس نے اسلام پر سب و شتم شروع کر دی۔ قاضی کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ اس نے ایک طمانچہ مار کر کہا کہ اسلام میں تمھارے اس عمل کی سزا قتل ہے۔ اس نے کہا کہ وہ جان بوجھ کر یہاں آیا ہے۔ اس لیے کہ خدا فرماتا ہے کہ مبارک ہیں وہ لوگ، جو دین داری کے لیے ستائے جاتے ہیں۔

آسمان کی بادشاہت ان ہی کے لیے ہے۔ آئزک نے بھی اپنے جرم کی سزا پائی۔
اندلس کی تاریخ میں 237 ہجری بہ مطابق 851 عیسوی وہ سال تھا، جب یولوجیس کی تحریک عروج پر تھی۔ اس سال اس کی تحریک کے سبب گیارہ عیسائی لقمۂ اجل بنے۔ لیکن یہ تحریک اندلس میں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکی۔ جنونی تحریکوں کے عمریں ویسے بھی طویل نہیں ہوتیں۔ قرطبہ اور اشبیلیہ کے سنجیدہ مزاج اور ثقہ پادریوں نے جب دیکھا کہ لوگ جنونی تحریک کے زیرِ اثر لقمۂ اجل بن رہے ہیں تو انھوں نے ایک عظیم الشان مذہبی جلسے کا انعقاد کیا۔ اس جلسے میں تمام بڑے۔بڑے پادریوں کو مدعو کیا گیا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ آیا عیسائی مذہب کی رو سے رسول اکرم ﷺ اور قرآن مجید کو گالیاں دینا کارِ ثواب ہے یا نہیں؟ اور جو لوگ اس طرح مقتول ہو رہے ہیں وہ شہید یا شاہِ ولایت کہلانے کے مستحق ہیں یا نہیں؟ اس پر عیسائیوں کے پادریوں نے خوب تقریریں کیں اور اس حرکت کو مذہبِ عیسوی کے بالکل خلاف قرار دے دیا ۔ اس مجلس میں عیسائی پادریوں نے ایک عجیب و غریب فیصلہ کیا۔ ان کا عجیب فیصلہ یہ تھا کہ جو لوگ اب تک مقتول ہو چکے ہیں، وہ تو شہید اور شاہِ ولایت سمجھے جائیں گے۔ لیکن جو عیسائی اس کے بعد اس طرح کی ناشائستہ حرکت کے مرتک ہوگا تو وہ بد معاش سمجھا جائے گا اور گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا۔ پادریوں کی کونسل کے اس فیصلے نے اندلس کے عیسائیوں کو بہت متاثر کیا۔

اس طرح یولو جیس کی جنونی تحریک کا زور کسی حد تک ٹوٹ گیا۔

: نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے)

تاریخِ اندلس ۔۔ مولانا ریاست علی ندوی

(تاریخِ اسلام ۔۔ اکبر شاہ نجیب آبادی

## پاکستان میں بھارتی نصاب

نوجوان کی ساری تعلیم پاکستان کی تھی ۔ اس وقت بھی وہ پاکستان کی ایک اعلا درس گاہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ وہ قانون دان بننا چاہتا تھا۔ اس لیے وکالت کی تعلیم حاصل کر رہا تھا ۔ وہ اعلا تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ کبھی ملک سے باہر نہیں گیا تھا۔ ہمیشہ یہیں رہا۔ یہیں کی چیزیں کھائیں ۔ یہیں کا پانی پیا۔ یہیں پلا بڑھا۔ اس کے آباء واجداد پچھلے کئی سو سالوں سے پاکستان کی سرزمین پر رہ رہے تھے ۔ کتنے سو سالوں سے ؟ اس کا جواب اس کے پاس بھی نہیں تھا تو میرے پاس کیا ہو گا۔ یعنی کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس کے باپ دادا ہجرت کرکے پاکستان نہیں آئے تھے ۔ اس کے سارے دوست بھی یہیں کے تھے ۔ ہو سکتا ہے، کبھی کبھار اسے انڈیا اور دیگر ملکوں کے لوگ انٹرنیٹ پر مل جاتے ہوں ۔ اس کے علاوہ اس کا تعلق کبھی بھی انڈیا یا کسی ملک سے نہیں رہا۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نوجوان سو فی صد نہیں تو ننانوے فی صد پاکستانی تھا۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کی سوچ پاکستانی نہیں تھی ۔ گویا اس کا جسم پاکستانی تھا ۔ مگر دل اور دماغ ہندوستانی تھا۔ اس کا جسم یہاں رہتا تھا، مگر دل اور دماغ انڈیا میں رہتے تھے۔ وہ اپنی نشستوں میں دوستوں کے سامنے

بھارت کی وکالت کرتا تھا۔ اس کے سارے دلائل پڑوسی ملک کے لیے ہوتے تھے۔ پاکستان کے حق میں وہ کبھی نہیں بولتا تھا۔ اسے یہاں کا نظام، یہاں کے لوگ، یہاں کی فضا، یہاں کی آب و ہوا، یہاں کی تعلیم، یہاں کے افکار، یہاں کے ادیب، یہاں کے دانشور، یہاں کے علماء اور یہاں تک کہ یہاں کا مذہب بھی عجیب اور مضحکہ خیز لگتے تھے۔ اسے یہاں کی ہر چیز سے نفرت تھی اور بھارت کی ہر شے سے محبت۔ یہ الگ بات تھی کہ اسے دن میں کئی کام پاکستانی نظام کے تحت کرنے پڑتے تھے۔ کیوں کہ اس کی فطرت میں بزدلی تھی۔ وہ کم زور دل کا مالک تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر وہ کوئی کام پاکستان کے قانون اور نظام کے خلاف کرے گا تو اسے جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔ اس لیے جب شہر میں ڈبل سواری پر پابندی لگتی تو وہ خاصا محتاط ہو جاتا۔ جب ڈبل سواری سے پابندی ہٹ جاتی تو وہ ڈر کے مارے تین دن تک کسی کو اپنے موٹر سائیکل پر سوار نہیں کرتا تھا۔ وہ یاروں دوستوں کی محفلوں میں پاکستان کے نظامِ تعلیم پر کھو کھلی تنقید کرتا تھا۔ مگر اس کی ساری تعلیمی ڈگریاں پاکستانی تھیں۔ اسے یہاں کے علماء سے نفرت تھی، مگر جب اس کے دادا کا انتقال ہوا تو وہ بھاگ کر محلے کی مسجد کے امام صاحب کے پاس گیا تھا، اور ان سے نمازِ جنازہ پڑھانے کی درخواست کی تھی۔

اس کے دوستوں کو اس وقت بہت غصہ آتا تھا، جب وہ کشمیر کے ضمن میں پاکستانی

موقف کی کھل کر مخالفت کرتا تھا اور اس سلسلے میں بھارت کے موقف کی حمایت کرتا تھا۔ اس کے دوستوں کا اس وقت خون کھول اٹھتا تھا، جب وہ بلوچستان کے پہاڑوں اور سندھ کے گوٹھوں میں پھیلی قوم پرستی کے حق میں دلیلیں دیتا تھا۔ اس کے یار دوست اس وقت اس سے متنفر ہو جاتے تھے، جب وہ پاکستان کے آئین سے اسلامی شقوں کو ختم کرنے کی بات کرتا تھا۔ اس کے دوست اس وقت اسے بالکل پسند نہیں کرتے تھے، جب وہ بھارت کے ہر اچھے، برے واقعے کی حمایت کرتا تھا۔

اس کے دوست اس کی پاکستان کے خلاف نفرت اور تضحیک پر مبنی سوچ کے سلسلے میں خاصے پریشان تھے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ ان کی سوچ اور اس کی سوچ میں اتنا فرق کیوں ہے؟ وہ اس بات کا کھوج لگانا چاہتے تھے کہ ان کا یہ دوست اس طرح کیوں ہے؟ اسے کیوں یہاں کی ہر شے سے نفرت ہے؟ کس چیز نے اس کی رگوں میں وطن سے نفرت بھر دی ہے؟ وہ پڑوسی ملک کی اتنی وکالت کیوں کرتا ہے؟ وہاں کی ہر بری شے کو اچھا اور یہاں کی ہر اچھی شے کو برا کیوں کہتا ہے؟

اب انھوں نے کھوج لگانا شروع کیا۔ بالآخر ایک دن وہ اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچ گئے۔ انھوں نے وہ راز پالیا، جس کا ان کو کئی سالوں سے انتظار تھا۔

ان کو ان سوالات کے جوابات مل گئے، جن کا ان کو شدت سے انتظار تھا۔ انھیں معلوم ہوا کہ ان کے اس دوست نے جس اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، وہاں کا نصاب بھارتی تھا۔ وہاں کوئی غیر ملکی این جی او متحرک تھی۔ جس نے وہاں سے پاکستانی نصاب کو بے دخل کر دیا تھا۔ اس کی جگہ بھارتی نصاب رائج کر دیا گیا تھا۔ یعنی اس نے پاکستان میں رہ کر بھارتی نصاب پر اپنی تعلیمی بنیاد رکھی تھی۔ وہیں سے اس کی سوچ تبدیل ہوئی تھی۔ ایسی تبدیل ہوئی کہ اتنا کچھ پڑھنے کے بوجود بھی وہ اپنے ابتدائی خیالات سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔

آخر میں ایک خبر پڑھیے۔ سندھ کے تعلیمی اداروں میں بھارتی کتابیں پڑھائے جانے کا انکشاف ہوا ہے۔ کتابیں غیر ملکی این جی اوز کی جانب سے تعلیمی اداروں میں مفت تقسیم ہوئی ہیں۔ غیر ملکی این جی او سے معاہدے پر صوبائی سیکریٹری تعلیم کے دست خط بھی موجود ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ کتابیں غیر اخلاقی مواد پر مشتمل ہیں۔ ان کتابوں میں شامل الفاظ کے معانی سندھی زبان میں غیر اخلاقی اور نازیبا ہیں۔ اسی پر اکتفا ہے
۔

# جیالا

ہر طرف گہما گہمی تھی، کیوں کہ انتخابات قریب تھے۔ سرکار کی طرف سے انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ لوگ شدت سے انتخابات کے دن کا انتظار کر رہے تھے۔ من چلے نوجوان بڑے جوش و خروش سے اپنی پارٹی کی حمایت کر رہے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے جھنڈے اور کارڈ وغیرہ لے رکھے تھے۔ انتخابات ہونے میں کچھ دن رہتے تھے۔ دلچسپیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ نعرے بازیاں عام ہو رہی تھیں۔ کبھی دن ڈھلے، کبھی سر شام اور کبھی رات کو۔ پارٹی کے سربراہان کے جذبات بھی قابلِ دید تھے۔ جہاں آتے، مخالف پارٹیوں کی خوب دھجیاں اڑاتے۔ عوام کو سبز باغ دکھاتے۔ ان کے بیانات سے یوں لگتا تھا، جیسے انتخابات کے بعد واقعی سب کچھ بدل جائے گا۔ غربت ختم ہو جائے گی۔ اداسیاں روٹھ جائیں گی۔ زرد چہرے خوشی سے تمتما اٹھیں گے۔ دہشت گردی اور قتل و غرت گری کبھی نہیں ہو گی۔ عوام ایک گیلن پانی کے لیے سڑکوں سڑکوں نہیں بھٹکیں گے۔ مہنگائی اپنی موت آپ مر جائے گی۔ غرض ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔ بہاریں ہی بہاریں ہوں گی۔ بوڑھے پیشین گوئیاں کرنے میں مصروف تھے۔ یعنی ان کو پہلے سے معلوم تھا کہ کون جیتے گا اور کون ہارے گا۔ اس ضمن میں ان کا پچاس سالوں سے زیادہ تجربہ تھا۔ حکم رانوں کی بیان بازی پر ان بوڑھوں کا تبصرہ بڑا پر مغز ہوتا تھا۔

کیوں کہ یہ بوڑھے پچھلے ساٹھ ستر سالوں سے یہی کچھ تو سنتے آ رہے تھے۔ ساٹھ ستر سالوں سے کچھ بھی نہیں بدلا تھا تو اب اچانک کیوں کر انقلاب آ جائے گا؟

مگر وہ بالکل ساکت تھا۔ پہاڑ سے زیادہ خاموش تھا۔ نہ اس میں جوش تھا، نہ جذبہ۔ نہ اس نے کوئی جھنڈا لیا تھا، نہ کوئی کارڈ بنوایا تھا۔ اس دفعہ اس نے کوئی نعرے بازی بھی نہیں کی تھی۔ اخبار پڑھنا اور خبریں دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ گم صم رہتا تھا۔ یہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ ہر دفعہ انتخابات سے پہلے اس کے جذبات، اس کا جوش، اس کا خروش قابلِ دید ہوتا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنی پارٹی کی محبت میں شدید ہوتا تھا۔ اپنی پارٹی کی حمایت میں مخالفین سے گرما گرم بحث کرتا تھا۔ پارٹی کی محبت میں سرشار ہو کر جب وہ نعرے بازی کرتا تو خود بھی جذبات کے دریا بہاتا اور دوسرے حامیوں کو بھی جذباتی کر دیتا، مگر اس دفعہ تو وہ بالکل بدل گیا تھا۔ پارٹی کے مخالفین اس کی پارٹی اور اس کے حکم رانوں کا مذاق اڑاتے، لیکن وہ ان کو کچھ بھی نہ کہتا۔ بس خاموش رہتا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے پارٹی کی طرف سے اسے کوئی بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ شاید اس لیے وہ گم صم اور خاموش رہتا تھا۔

بچپن میں اس کے گھر میں سیاسی موضوعات پر بحث ہوتی تھی۔ اس کے گھر میں

انواع و اقسام کے اخبارات آتے تھے۔ وہ بچپن ہی سے سیاسی بحث سننے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹا تھا، مگر اس کو پاکستان کی قریبا تمام پارٹیوں کے نام آتے تھے۔ کچھ بڑا ہوا تو اخبارات پڑھنا اس کا بہترین مشغلہ بن گیا تھا۔ اس کی تعلیم اچھی سی تھی، مگر اخبارات کے صفحات میں موجود خبریں، تجزیے اور تبصرے پڑھ بھی لیتا تھا اور سمجھ بھی لیتا تھا۔ اس فن میں وہ طاق ہو چکا تھا۔ اخبارات پڑھتے ہوئے ایک سیاسی رہنما کے کارناموں پر اس کی نظریں پڑتی رہتی تھیں۔ شروع شروع میں تو سرخیاں پڑھ کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ اس سیاسی رہنما سے متعلق قدرے تفصیل سے پڑھنے لگا۔ جہاں اس کا نام دیکھا، بس پڑھنے بیٹھ گیا۔ نادانستہ طور پر یہ سیاست دان اس کے دل میں گھر کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اس سیاست دان اور اس کی پارٹی کا جیالا" بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پارٹی کے کارکن ہونے کا حق ادا کر دیا۔ اس کے " جذبات، اس کے احساسات، اس کا چین، اس کا سکون، اس کی محبت، اس کے دن، اس کی راتیں۔۔۔ سب کچھ پارٹی کے لیے وقف ہو گیا تھا۔ جب اس کا رہنما انتخابات سے پہلے غربت، مہنگائی اور قتل و غارت گری وغیرہ کے خاتمے کی بات کرتا تو وہ سمجھتا کہ واقعی یہ سب کچھ بدل جائے گا۔ وہ ہمیشہ اپنی پارٹی سے آس لگائے رکھتا تھا۔ وہ غریب تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی پارٹی اس کی سیاسی وابستگی اور جذبات کو دیکھتے ہوئے اس کے حال پر ضرور رحم کھائے گی۔ جب اس کی پارٹی برسر

اقتدار آئے گی تو وہ امیر کبیر ہو جائے گا۔ اس کو اس کے جذبات اور وابستگی کا صلہ ضرور ملے گا۔

پھر ایک دن انتخابات ہو گئے۔ اس کی پارٹی جیت گئی۔ وہ خوش ہو گیا کہ اب اس کی امیری اور ٹھاٹھ کے دن شروع جائیں گے۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ جس لیڈر پر وہ جان چھڑکتا تھا، اس کے کچھ کام نہ آیا۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔ سب کچھ وہیں رہا۔ اس کے گھر میں انتخابات سے پہلے بھی غربت کے اندھیرے تھے اور انتخابات کے بعد جب اس کی پارٹی برسر اقتدار آ گئی، تب بھی وہ غریب رہا۔ اس کا بیٹا سخت بیمار ہو گیا۔ اپنے بیٹے کی یہ حالت اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس طرح وہ پارٹی کا مخالف بن گیا۔ بلکہ سخت ترین مخالف اس کی محبت، نفرت میں بدل گئی۔ ایک دن وہ غربت اور بے روزگاری سے تنگ آ کر خود کو فروخت کرنے نکل پڑا!!!

آخر میں ایک خبر پڑھیے۔ سندھ کے علاقے سکھر میں پیپلز پارٹی کا ایک کارکن غربت اور بے روزگاری سے تنگ آ کر خود کو فروخت کرنے نکل پڑا۔ پرویز میرانی نے اپنے بیٹے کے ہم راہ سکھر پریس کلب پہنچ کر روتے ہوئے میڈیا کو بتایا کہ میں آج خود کو فروخت کرنے آیا ہوں۔ میں غربت اور بے روزگاری سے تنگ آ گیا ہوں۔ میرے بیٹے کی حالت خراب ہے۔ پتا نہیں، اس کو کون سی بیماری لگ گئی

ہے۔ اس کے منھ سے خون آرہا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھے خرید لے اور میرے بیٹے کی زندگی بچالے۔ میں یہ سب کچھ اپنے بچوں کے لیے کر رہا ہوں۔ میرے گھر میں غربت ہے اور اب مجھ سے بچوں کا سسکنا اور بلکنا دیکھا نہیں جاتا۔ مخیّر حضرات مجھے خرید لیں۔ میں ان کی پوری عمر غلامی کروں گا۔ حکمران ووٹ لے کر بھاگ جاتے ہیں۔ میری زندگی بچالو۔

(نوٹ: ایک خبر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ فرضی کہانی بنائی گئی ہے۔)

# بارہ ربیع الاول

میرے آنے سے قبل ہر طرف خوشیاں چھا جاتی ہیں۔ لوگ مسرور ہوتے ہیں
۔فضاؤں میں نعتوں کے زمزمے گونجتے ہیں۔ مسلمان اپنے اپنے طریقے سے اپنے آقا
علیہ السلام سے عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ میں آتا ہوں تو سب کو خوش
کر دیتا ہوں۔ میرے اثرات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ میرے آنے پر اخبارات رنگ
برنگے ایڈیشن شائع کرتے ہیں۔ میگزینوں کے سر ورق روضہِ رسول ﷺ سے سج
جاتے ہیں۔ ٹی وی پر گراموں میں نعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ گلی محلوں میں سیرت کے جلسے
اور نعتوں کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ بچوں، بوڑھوں اور جوانوں ۔۔ سب کا ذوق
دیدنی ہوتا ہے۔ میں سب کو خوش کر دیتا ہوں۔ خزاں کو بہار کر دیتا ہوں۔ عقیدت
اور محبت کو عام کر دیتا ہوں

اپنی آمد پر اس قدر جوش و خروش دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ امتیوں کی اپنے
پیارے رسول ﷺ سے اس قدر والہانہ محبت دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ مجھے
یوں محسوس ہوتا ہے،اب سب کچھ بدل جائے گا۔ ہر ایک اسوہِ رسولِ اکرم ﷺ کی
پیروی کرے گا۔ جس کی وجہ سے امت کا مستقبل سنور جائے گا۔ امت کی حالت میں
بہتری آجائے گی۔ اس سے بڑی خوشی کی بات کیا ہوگی۔ آقا علیہ

السلام نے امت کو درسِ اخوت دیا تھا۔ امت اپنے مہربان رسول ﷺ کے اس درس پر عمل کرے گی۔ رسولِ مہربان سراپا اخلاق تھے۔ آپ ﷺ کے اخلاق سب سے اعلا تھے۔ امت بھی اپنے اخلاق اپنے رسولِ اکرم ﷺ کے اخلاق کی طرح بنانے کی کوشش کرے گی۔ آقا علیہ السلام مہربان تھے۔ عفوو درگزر سے کام لیتے تھے۔ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو معاف کر دیا تھا۔ امت میں بھی یہ صفتِ رحمت پیدا ہو جائے گی۔ کیوں کہ جس طرح امت میری آمد پر رسولِ اکرم ﷺ سے عقیدت و محبت کا اظہار کر رہی ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے۔ اس عمل سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ امت یک سر بدل جائے گی۔ اب غربت نہیں ہوگی۔ امیر، غریب کا خیال رکھیں گے۔ مہنگائی نہیں ہوگی۔ لوٹ مار نہیں ہوگی۔ ناپ تول میں کمی نہیں کی جائے گی۔ سڑا ہوا مال، مہنگے داموں بیچنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ لوگ دکھ درد بانٹیں گے۔ گویا سب کچھ بدل جائے گا۔ میری آمد کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمانانِ پاکستان ایک مثالی معاشرہ تشکیل دیں گے۔ ایک ایسا معاشرہ، جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملے گی۔ مگر میری تمام امیدوں پر اس وقت پانی پھر جاتا ہے، جب میں دیکھتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں بدلتا۔ سب کچھ جوں کا توں رہتا ہے۔ وہی مسئلے، وہی الجھنیں، وہی مشکلیں۔ نہ نفرت ختم ہوتی ہے، نہ عداوت تھمتی ہے۔ نہ عفوو درگزر کے سوتے پھوٹتے ہیں، نہ دشمن کو معاف کرنے کی سنت کا اجرا ہوتا ہے۔ آقا

علیہ السلام کے درسِ اخوت پر بھی کوئی عمل نہیں کرتا۔ فرقہ وارانہ تفاوت جوں کا توں برقرار رہتا ہے۔ غریب غریب ہی رہتا ہے۔ امیر اس کا خیال نہیں رکھتا۔ مہنگائی کم نہیں ہوتی۔ ناپ تول میں کمی کی عادت جاری رہتی ہے۔ گویا کچھ نہیں بدلتا۔ باید و شاید ہی کوئی ہو، میری آمد جس کی زندگی پر کوئی مثبت اثر مرتب کرتی ہو۔ مجموعی سطح پر کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ درحقیقیت امت کے دن اس وقت پھریں گے، جب مجموعی سطح پر کوئی تبدیلی وقع ہوگی۔ بہ صورتِ دیگر کچھ نہیں بدلے گا۔

میرا حقیقی پیغام یہ ہے کہ امت اپنے پیارے رسول ﷺ کے نقشِ قدم پر چلے۔ ہر عمل میں، ہر فعل میں آپ ﷺ کی پیروی کرے۔ امت کی کام یابی اور کامرانی اسی میں مضمر ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی عمل نہیں، جس سے امت کو کام یابی اور کامرانی حاصل ہو۔ کاش !! رسولِ اکرم ﷺ کی امت اپنے پیارے آقا علیہ السلام کی سنتوں پر عمل کرتی !!

## دس مہینے کی بچی

بابا کی محفل میں سکوتِ مرگ چھایا ہوا تھا۔ وہ خود بھی خاموش تھے، ان کی مرید بھی چپ تھے۔ بابا کی محفلیں اکثر و بیشتر تبسم بانٹتی تھیں۔ جو بھی یہاں آتا، خوش وخرم ہو جاتا۔ مگر کبھی کبھار سکوت چھا جاتا۔ خاموشی اس محفل کو ہر طرف سے گھیر لیتی تھی۔ یہ اسی وقت ہوتا، جب کوئی جاں کاہ حادثہ پیش آتا۔ جب انسانوں کا خون ہوتا تو بابا سمیت اس کے مریدین اداس ہو جاتے۔ بابا ایسے واقعات کے بعد تبصرے بھی کرتے، جو بڑے پر مغز ہوتے۔ ان کے مریدین ان کی باتوں سے مستفید ہوتے۔ آج کا سکوت بھی یہ بتا رہا تھا کہ کسی کا خون ہو گیا ہے۔ تبھی تو یہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ جی ہاں، ایک ایسی بچی کا انتقال ہو گیا تھا، جس نے اپنی عمر کی پہلی بہار بھی نہیں دیکھی تھی۔ بچے تو روز ہی مرتے ہیں، مگر یہ دس ماہ کی بچی جس وجہ سے مری تھی، اس وجہ نے بابا کو سخت ملول کر دیا تھا۔ بابا کا اداسی بتا رہی تھی کہ اس واقعے نے انھیں غم زدہ کر دیا ہے۔

کافی دیر کی پر اسرار خاموشی کے بعد بابا گویا ہوئے، "جانتے ہو، جنگل کو جنگل کیوں کہا جاتا ہے؟" بابا نے سوال کیا تو سب مریدین سوچنے لگے۔ لیکن کسی سے جواب نہیں بن پڑا۔ قدرے توقف کے بعد بابا پھر بولے، " جنگل کو جنگل

اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہاں انصاف نہیں ہوتا۔ وہاں ہر ایک کے لیے الگ الگ معیارِ زندگی ہوتا ہے۔ 'جس کی لاٹھی، اس کی بھینس' کا دور دورہ ہوتا ہے۔ وہاں طاقت ور کے لیے الگ قانون ہوتا ہے، کمزور کے لیے الگ قانون ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو جنگل کہتے ہیں۔ یاد رکھیے، جب یہی سب کچھ انسانوں کی بستیوں، شہروں اور محلوں میں ہو تو وہ بھی جنگل بن جاتے ہیں۔ اگر ان جنگلوں کو انسانوں کی بستیاں بنانا ہے تو ایک ہی حل ہے۔ وہ یہ ہے کہ انصاف کا بول بالا کیا جائے۔ انصاف میں ایسی طاقت ہے کہ یہ جنگل کو شہر بنا دیتا ہے۔ بے سکونی کو سکون میں تبدیل کر دیتا ہے۔ انصاف امن و سکون کا ضامن ہے۔ انصاف آشتی کی علامت ہے۔ جب کہ ناانصافی ظلم ہے اور جہاں ظلم ہو، وہاں امن و سکون بھلا کیسے قائم ہو سکتا ہے؟" بابا یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ قدرے توقف کے بعد ایک شخص گویا ہوا، "یہ دس ماہ کی بچی تھی۔ اس طرح کے بچے روزانہ مرتے ہیں، مگر اس بچی پر اس قدر افسوس کیوں؟" بابا اس سوال پر مسکرانے لگے۔ پھر بولے: " بات یہ ہے کہ اس بچی کی موت نے ہمارے ملک میں پھیلے دوہرے معیار کا پول کھول کے رکھ دیا ہے۔ اس بچی کی موت میں ایک سبق ہے۔ سبق یہ ہے کہ ہمیں بہت کچھ تبدیل کرنا ہوگا۔ یہ دوہرا معیار ختم کرنا ہوگا۔ افسوس اس بات کا نہیں کہ ایک دس ماہ کی بچی کی موت واقع ہو گئی ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ کیوں کہ ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ مگر اس بچی کی موت جس طریقے سے ہوئی ہے، اس طریقے نے سب کو سوگ وار کر دیا ہے۔

اس لیے سب جذباتی ہو رہے ہیں۔ اس لیے سب پر غم اور غصہ چھایا ہوا ہے۔" بابا خاموش ہوئے تو ایک اور سوال داغا گیا، "ہو سکتا ہے، یہ میڈیا کی شرارت ہو؟ ہو سکتا ہے، اس واقعے کو اچھال کر ایک مخصوص سیاسی جماعت کی ساکھ کو متاثر کرنا ہو؟" بابا نے اس سوال پر ایک زور دار قہقہہ لگا کر کہا، " چلو مان لیا کہ یہ میڈیا کی شرارت ہے ۔اس واقعے کو اچھال کر انھوں نے ایک سیاسی جماعت کی ساکھ کو متاثر کیا ہے۔ لیکن کیا اس میں کوئی شک ہے ہمارے ملک میں دو الگ الگ معیار ہائے زندگی ہیں۔ یہاں غریبوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ جب کہ امیر سونے کے چمچ سے کھانا کھاتے ہیں۔ مانا کہ یہ تفاوت اور فرق قدرتی امر ہے۔ کوئی غریب ہوتا ہے تو کوئی امیر۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک باپ اپنی دس ماہ کی بیمار اور لاچار بچی کو گود میں لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔ اسے ہسپتال پہنچنے کے لیے سڑک نہیں مل رہی۔ دوسری طرف سڑکیں بلاک ہیں۔ ہسپتال میں تقریب ہو رہی ہے۔ اس طرح تو نہیں ہونا چاہیے ناں! ہو سکتا ہے کہ اس واقعے کی اس قدر زیادہ تشہیر کے پیچھے میڈیا کے زبردست مفادات کارفرما ہوں۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ یہاں غریب کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ کوئی جا کر اس باپ سے پوچھے، جس کی گود میں اس کی دس ماہ کی بچی نے جان دے دی ہے۔ باپ کی اس وقت کیا حالت ہوگی، جب اس کی ننھی منی بچی اس کی گود میں پڑی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہوگی۔ اس بچی کی ماں کیا حال ہوا ہوگا؟" بابا ایک بار پھر خاموش ہوئے

کے ساتھ ساتھ اداس بھی ہوگئے۔

پھر وہی پر اسرار خاموشی اور سکوت۔ مگر یہ خاموشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ ایک مرید کے سوال نے مہر سکوت توڑ دیا، " اب کیا ہوگا؟" بابا اس سوال پر گہری سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے، " غیب کا علم رب تعالیٰ کے پاس ہے۔ البتہ میری دانست میں یہ کام ضرور ہوں گے۔ سب سے پہلے اعلیٰ عہدے داران کی طرف سے اس واقعے کی تحقیقات کا حکم دیا جائے گا۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ پھر بچی کے والد کو سرکاری ملازمت دینے کا اعلان کیا جائے گا۔ یہ بھی حسبِ معمول امر ہے۔ اس طرح تو ہر واقعے کے بعد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتیں اس واقعے کو خوب اچھالیں گی۔ یہ بھی معمول کی بات ہے۔ ہمارے ملک میں اس طرح کے واقعات کے بعد کم از کم یہ تین کام ضرور ہوتے ہیں۔" بابا کے خاموش ہونے کے بعد ایک بار پھر سوال کیا گیا، " کیا بچی کے والد صاحب سرکاری نوکری لے لیں گے؟" بابا نے سوچ کر کہا، " مجھے نہیں لگتا کہ وہ والد، جس کے بازوؤں میں اس کی دس ماہ کی بچی نے دم توڑا ہو، سرکاری نوکری بہ خوشی قبول کرلے گا۔ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ باقی اللہ سائیں خوب جانتا ہے۔

## ڈی ایف اے ساؤتھ کی مثبت پیش رفت

کسی پس ماندہ علاقے سے مثبت خبر آئے تو اس کی ضرور تشہیر کرنی چاہیے ۔ غریب کی بستی میں روٹی تقسیم ہو رہی ہو تو خوب ڈھنڈورا پیٹنا چاہیے ۔ جہاں سے ہر وقت منفیت کی گونج سنائی دے ، اگر وہاں سے اثبات کی تھوڑی سی مہک بھی محسوس ہو ، اسی وقت سارے عالم کو بتا دینا چاہیے ۔ تاکہ ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ہو ، جو یہ کار ہائے خیر سرانجام دے رہے ہوں ۔ ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ کسی مثبت خبر کو موضوعِ سخن بناؤں ، لیکن یہ کوشش ہمیشہ نہیں تو اکثر اکارت جاتی ہے ۔ اب تو ہمارے لوگ بھی ایسے موضوعات پسند کرنے لگے ہیں ، جن میں مہنگائی کا رونا ہو ، غربت کی دہائی ہو ، لاشوں کے سانحے ہوں ، بھتہ خوری اور ٹارگٹ کلنگ کا مصالحہ ہو یا ان موضوعات سے ملتا جلتا کوئی موضوع ہو ۔

لیاری کو کون نہیں جانتا ؟ کون اس خطۂ بے اماں سے ناواقف ہے ؟ آپ لیاری کے لوگوں کو جاہل ، گنوار ، اور ان پڑھ کہہ لیں ، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ علاقہ کھیلوں کے حوالے سے ہمیشہ زرخیز رہا ہے ۔ اس کے علاوہ اس امر کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہاں کے پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے لوگوں کے دلوں

میں اس غریب بستی کے غریب لوگوں کا درد ہے۔ یہ لوگ اکثر و بیشتر اپنی مدد آپ کے تحت لیاری کے نوجوانوں اور خصوصاً طالب علموں کو منفی سرگرمیوں سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی یہ کوششیں نیک نیتی پر مبنی ہوتی ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ نہیں چاہتے ان کے نوجوان اور آنے والی نسل منفی سرگرمیوں میں ملوث ہو کر خود سے بھی بے گانہ ہو جائے۔ بلاشبہ یہ لوگ عزت و احترام کے قابل ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت ہی یہ کارہائے خیر سرانجام دے رہے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ لیاری کا علاقہ کھیلوں کے حوالے سے ہمیشہ زرخیز رہا ہے۔ لیاری کے پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے لوگ اس حقیقت کا اادراک کر چکے ہیں کہ کھیل ایک ایسی مثبت سرگرمی ہے، جس کے ذریعے ہر قسم کی منفی سرگرمیوں کو مات دی جا سکتی ہے۔ جب لیاری کے لوگ کھیلوں کی طرف راغب ہوں گے تو خود بہ خود ان منفی سرگرمیوں کو چھوڑ دیں گے، جنھوں نے ان کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ویسے تو یہاں ہمہ اقسام کی کھیلیں رائج ہیں، لیکن فٹ بال کا ذوق اور شوق بہت زیادہ ہے۔ جب فٹبال کا انٹرنیشنل ایونٹ سجتا ہے تو لیاری میں بڑی بڑی اسکرینیں سجتی ہیں۔ بچے، بوڑھے، جوان ۔۔ سب ہی فٹ بال کے یہ میچ ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں۔

لیاری کی نئی پود کو فٹ بال کی طرف راغب کرنے کے لیے ڈسٹرکٹ فٹ بال ایسو سی ایشن (ساؤتھ) اچھے اقدامات اٹھا رہی ہے۔ وجہ وہی ہے کہ نئی نسل منفی سرگرمیوں سے بچے۔ ڈی ایف اے ساؤتھ کے چیئر مین جمیل احمد ہوت صاحب نے بتایا کہ ناصر کریم بلوچ صاحب (ڈی ایف اے ساؤتھ کے سرپرستِ اعلیٰ) کی قیادت میں ڈی ایف اے ساؤتھ لیاری کے نوجوانوں کو فٹ بال کی طرف راغب کرنے کے لیے مثبت اقدامات اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ان کی وساطت سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ڈی ایف اے ساؤتھ پچھلے سال پانچ بڑے ایونٹس کرا چکی ہے۔ ان ایونٹس کے انعقاد کی وجہ سے لیاری کے نوجوان بڑی تیزی سے فٹ بال کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ بلا شبہہ ڈی ایف اے ساؤتھ کی یہ مثبت پیش رفت لیاری کے نوجوانوں کا مستقبل روشن کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ ڈی ایف اے ساؤتھ کے چیئر مین نے یہ بھی بتایا کہ لیاری کے تمام کھیلوں کے میدان آباد کر دیے گئے ہیں۔ لیاروں میں کھیلوں کے میدانوں کی شدید قلّت ہے۔ حکامِ بالا کو چاہیے کہ اس طرف توجہ دیں، تاکہ بچے گلیوں میں کھیلنے کی بہ جائے میدانوں میں کھیلیں۔ لیاری کے بچے گلیوں میں کھیلنے پر مجبور ہیں۔ جب کہ وہاں کھیلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس سے حادثات بھی ہو سکتے ہیں۔ جمیل احمد ہوت صاحب نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ ڈی ایف اے ساؤتھ عنقریب انڈر 12 اسٹریٹ فٹ بال ٹورنامنٹ کا انعقاد کرے گی۔ تاکہ چھوٹے بچے بھی اس طرف مائل ہوں۔ ڈی ایف اے ساؤتھ کا یہ اقدام بھی موثر ثابت ہوگا۔ اس طرح نو جوانوں کے ساتھ

ساتھ بچوں میں بھی کھیل کا شوق پیدا ہوگا۔ چیئر مین صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ڈی ایف اے ساؤتھ نے ایک وعدہ کیا تھا۔ وہ وعدہ یہ تھا کہ ٹرانسفر فارم کی کوئی فیس نہیں لی جائے گی۔ یہ وعدہ پورا کیا گیا۔اس عمل کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔ اب تک سات سو فارم بھرے جا چکے ہیں۔ جس سے ذوق و شوق کا بہ خوبی انداہ ہوتا ہے۔

لیاری کا علاقہ ہمیشہ سے پس ماندہ رہا ہے۔ اکثر و بیشتر یہ خطہ حکام بالا کی ترجیحات سے کوسوں دور رہا ہے۔ جب یہاں کے سلجھے ہوئے لوگوں نے محسوس کیا کہ کوئی نہیں ہے، جو ان کا پرسانِ حال ہو تو انھوں نے اپنی مدد آپ کے تحت آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش اس وقت بھی جاری و ساری ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ڈی ایف اے ساؤتھ بھی انھی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔ یہ بھی اپنی مدد آپ کے تحت چل رہی ہے۔ ڈی ایف اے ساؤتھ کے چیئر مین صاحب کے بہ قول ان کے ساتھ حکامِ بالا کی طرف سے کوئی مالی تعاون نہیں کیا جا رہا۔ بلکہ لیاری کے تمام فٹ بال کلبز اپنی مدد آپ کے تحت چل رہے ہیں۔ کاش! یہ خطۂ بے اماں حکامِ بالا کی توجہ اپنی طرف کھینچ لے !!

# شام میں ظلم کی شام کب ڈھلے گی؟

شام، جہاں پچھلے کئی سالوں سے موت کا کھیل کھیلا جارہا ہے، نہ جانے وہاں کب ظلم کی شام ڈھلے گی۔ جتنے منھ ہیں، اتنی باتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے،بڑی طاقتیں روس اور امریکا یہ جنگ کروارہی ہیں، تاکہ ان کا اسلحہ بک سکے۔ کوئی کہتا ہے، یہ شیعہ سنی قضیہ ہے۔ کوئی کہتا ہے، یہ عرب و عجم کی لڑائی ہے۔ کوئی کیا کہتا ہے، اور کوئی کیا۔ جو کچھ بھی ہے، ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ ان بد نصیبوں پر جو ظلم کی کالی رات چھائی ہوئی ہو، جلد از جلد امن و سلامتی کی سحر میں تبدیل ہو جائے۔ امتِ مرحومہ کے مسائل بڑھتے جارہے ہیں۔ پہلے فلسطین اور کشمیر کے مسائل تھے۔ اب شام کا مسئلہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سعودی، ایران کا مسئلہ بھی خطرناک صورت حال پیش کررہا ہے۔ جب تک مسلم امہ نااتفاقی کا شکار رہے گی، اس کے مسائل بڑھتے جائیں گے۔

ہم شام کی بات کررہے تھے۔ سوشل میڈیا پر آئی ہوئی ویڈیوز پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ شام سے متعلق آئی ہوئی خبریں بھی پریشان کردیتی ہیں۔ اس بات پر بہت افسوس ہوتا ہے کہ اس خطہِ بے اماں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ نہ اپنے، نہ بے گانے۔ ہر کوئی اس علاقہِ بے امن کو اپنے مقاصد کے

لیے استعمال کر رہا ہے۔اس ضمن میں سب گفتار کے غازی بنے ہوئے ہیں۔ کردار کا غازی خال خال ہی نظر آتا ہے۔ایسی گمبھیر اور پریشان کن صورت حال میں محسوس یہی ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ بہت دیر سے حل ہوگا۔

خبریں بتاتی ہیں کہ شام کے محصور علاقوں میں لوگ گھاس کھانے پر مجبور ہیں۔ کتنی افسردہ خبر ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ شام کے شمال مغرب میں حکومت کے زیرِ انتظام علاقوں میں شہری گھاس کھانے پر مجبور ہیں۔شام میں انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے ایک ادارے نے بتایا ہے کہ حالیہ ہفتوں کے دوران خوراک کی کمی کے باعث دس افراد ہلاک ہو چکے ہیں اور کھانے کی تلاش میں نکلنے والے دیگر 13 افراد حکومت کی حمایت یافتہ فوج کی فائرنگ اور سرنگ کے دھماکوں میں اپنی جانیں گنوا بیٹھے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ شام کے ایک گاؤں کے اندر مزید 1200 افراد دائمی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔جب کہ 300 سے زائد بچے غذائی قلت اور دیگر بیماریوں کا شکار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ شام ایک ایسا بد نصیب علاقہ ہے، جہاں شہری حرام جانور کھانے پر مجبور ہیں۔ایک امدادی کارکن نے بی بی سی کو بتایا کہ شہری مر رہے ہیں۔ وہ زمین سے کھانا کھانے پر مجبور ہیں۔ وہ بلیوں اور کتوں کو کھانے پر مجبور ہیں۔ بی بی سی کی ایک خبر کے مطابق ایک مقامی اہل کار نے امریکی خبر رساں ادارے اے پی کو بتایا ہے کہ بنیادی ضرورتوں کی چیزوں کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ایک کلو

آٹے کا تھیلا 250 امریکی ڈالر اور 900 گرام وزن والا بچوں کا کھانے کا تھیلا تقریباً 300 امریکی ڈالر میں فروخت ہو رہا ہے۔

شام کے کئی علاقے اور قصبے ہیں، جہاں ظلم ہی ظلم ہے۔ کھانے کی قلت ہے۔ بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ بچے مر رہے ہیں۔ لیکن کوئی ان کے پوچھنے والا نہیں ہے۔ اقوامِ متحدہ کی درخواستیں بار آور ثابت نہیں ہو رہیں۔ یہ عالمی ادارہ بھی کچھ نہیں کر پا رہا۔ سوائے تھوڑی بہت خوراک مہیا کرنے کے۔ شام کے قحط زدہ قصبے مدایا میں اقوامِ متحدہ نے امدادی سامان پہنچایا ہے۔ وہاں 30 ہزار سے زائد شہری گذشتہ کئی ہفتوں سے خوراک کی قلت کا شکار ہیں۔ ادلب بھی شام کا ایک علاقہ ہے، یہاں باغی فورسز کا کنٹرول ہے۔ یہاں مارچ 2015ء سے تقریباً بیس ہزار لوگ محصور ہیں۔ ادلب اور مدایا کی صورت حال عجیب ہے۔ مدایا پر حکومت کی حامی فورسز نے قبضہ کر رکھا ہے۔ جب کہ ادلب کے دو علاقوں فوا اور کیفریہ پر حکومت مخالف فورسز کا کنٹرول ہے۔ مگر ان دونوں علاقوں کے لوگوں کی حالت قابلِ رحم ہے۔ دونوں علاقوں کے لوگ ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ان دنوں پورا شام حکومت مخالف اور حکومت موافق فورسز کے زیرِ نگیں ہے۔ دونوں نہتے اور معصوم شہریوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ اقتدار کا نشہ بڑا خراب ہوتا ہے۔ یہ کئی انسانوں کی جانیں لے لیتا ہے۔ مگر پھر بھی نہیں اترتا۔

یہ بات تو حقیقت ہے کہ شام کا مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا، جب تک عرب شیوخ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے عملی اقدامات نہ اٹھائیں۔ ہمارے مسلمان حکم رانوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کے ہر مسئلے کے حل کے لیے اقوامِ مغرب کا منھ تکتے ہیں۔ جو کہ کوئی اچھا عمل نہیں ہے۔ مغرب سے آس لگائے رکھنے اور خود کچھ نہ کرنے کے ہی یہ نتائج ہیں کہ آج ہم کئی محاذوں پر شکست کھا چکے ہیں۔ شام کے مسئلے پر عرب شیوخ سے جن اقدامات کی توقع کی جارہی تھی، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسے اقدامات دکھائی نہیں دے رہے۔ نہ جانے شام میں ظلم کی شام کب ڈھلے گی؟

# سانحہِ چار سدہ۔۔۔۔ دورہِ عرب و ایران

سو فی صد توجہ اس طرف مرتکز تھی کہ اس بار وزیرِ اعظم نواز شریف اور آرمی چیف جنرل راحیل شریف کے دورہِ عرب و ایران پر لکھوں گا۔ لیکن کیا کروں اس خزاں رت کا۔۔۔ جو وطنِ عزیز میں بہار کو پنپنے ہی نہیں دیتی۔ کیا کروں اس حادثے کا ۔۔۔جس نے پوری قوم کو سوگ وار کرکے رکھ دیا ہے۔ سو آج کی میری تحریر دو موضوعات پر مشتمل ہوگی۔ یعنی سانحہِ چارہ سدہ اور اور وزیرِ اعظم اور آرمی چیف کا دورہِ عرب و ایران۔

بدھ کی صبح نو بجے چار مسلح لوگ پشاور کے ضلع چار سدہ میں باچا خان یونی ورسٹی کی عقبی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے اور فائرنگ شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں اب تک کی اطلاعات کے مطابق 21 لوگ شہید ہوگئے ہیں۔ ان 21 شہیدوں میں سے 19 طلبہ تھے۔ ایک لیب اسسٹنٹ تھا اور ایک پروفیسر تھے۔ یونی ورسٹی کے گارڈز اور پولیس نے مقدور بھر کوشش کی کہ مسلح لوگوں کے اس گروہ کو ختم کر ڈالیں، لیکن ان کا خاتمہ اس وقت تک نہ ہو سکا، جب تک پاک فوج کے جوان نہ آ گئے۔ ہاں، یہ ضرور ہوا کہ گارڈز اور پولیس کی کوششوں سے دہشت گرد کوئی بڑی کارروائی کرنے سے عاجز رہے۔ کچھ لوگ مر کر امر ہو جاتے ہیں۔ پھر شہید تو ویسے بھی زندہ ہوتے ہیں۔ مگر ہمیں ان کی زندگی کا شعور

نہیں ہوتا۔ باچا خان یونی ورسٹی کا ہر شہید زندہ ہے۔ کیوں کہ ان کو شہادت کے بعد حیاتِ جاودانی مل گئی ہے۔ یعنی نہ ختم ہونے والی زندگی۔ ایک ایسی زندگی جس کی کوئی انتہا نہیں۔

جب کوئی اہلِ علم اٹھتا ہے تو مجھے ذاتی طور پر بہت صدمہ ہوتا ہے۔ اس وقت تو اور زیادہ افسوس ہوتا ہے، جب علم کا نور پھیلانے والوں کو گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے۔ باچا خان یونی ورسٹی کے شعبۂ کیمیا سے منسلک پروفیسر ڈاکٹر سید حامد حسین کی شہادت کا احوال پڑھا تو تو آنکھیں بھیگ گئیں۔ شہید پروفیسر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انھوں نے انگلینڈ سے کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ زندہ رہتے تو نہ جانے کتنے طلباء ان کے علم سے مستفید ہوتے۔ مگر وہ بھی ان بے رحم گولیوں کا نشانہ بن گئے، جن کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ البتہ جو لوگ ان گولیوں کو چلاتے ہیں، ان کی آنکھیں ضرور ہوتی ہیں۔ شاید ان کے سینوں میں دل نہیں دھڑکتے ہوں گے۔ تبھی تو وہ بے ضرر اور علم کے نور سے جہالت کی تاریکیاں مٹانے والے عظیم لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ کیا قصور تھا، ڈاکٹر حامد حسین کا؟۔۔۔۔کیا قصور تھا ان طلبہ کا، جو علم سیکھ کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے؟؟

حملے کے بعد معلوم ہوا کہ حملہ آوروں نے افغانستان کی سمیں استعمال کیں۔

پاک فوج کے ترجمان لیفٹیننٹ جنرل عاصم باجوہ نے حملے کے بعد پریس کانفرنس کرتے ہوئے بتایا کہ حملہ آوروں کو کس نے بھیجا؟ دہشت گرد کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ ان کو کہاں سے کنٹرول کیا گیا؟ اس بارے میں کافی معلومات مل گئی ہیں۔ پاک فوج کے ترجمان نے اس واقعے پر انتہائی غم اور غصے کا اظہار کیا۔ آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے افغنستان کے صدر اشرف غنی، افغنستان کے چیف ایگزیکٹو ڈاکٹر عبد اللہ عبد اللہ اور امریکی کمانڈر جنرل جان کیمبل سے فون پر بات کی اور حملے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ دہشت گردوں کو افغنستان کے ایک مقام سے کنٹرول کیا گیا۔ اس لیے حملے کی پشت پناہی کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔

حملہ آوروں کے پاس افغنستان کی سمیں تھیں۔ یہی اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ کہ حملہ آوروں کو وہیں سے ہدایات ملتی رہیں۔ پاکستانی فوج نے دہشت گردی پر بڑی حد تک کنٹرول کر لیا ہے۔ لیکن ہم سایہ ملک افغنستان میں کچھ ایسے عناصر ضرو موجود ہیں، جو اب تک پاکستان کے خلاف محاذ گرم کیے ہوئے ہیں۔ پاکستانی فوج کا وہاں پہنچ کر ان عناصر کے خلاف اقدام اٹھانا محال ہے۔ اس لیے افغان حکومت کو چاہیے کہ وہ خود ہی وہاں پہنچ کر ان کا قلع قمع کرے۔ کیوں کہ یہ عناصر پاکستان کے ساتھ ساتھ افغنستان کے لیے بھی خطرناک ہیں۔ اگر افغنستان اپنے پڑوسی ملک کے ساتھ اچھے تعلقات کا خواہاں ہے تو

اسے ان عناصر کے خلاف ضرور کارروائی کرنی ہوگی، جو پاکستان کے تعلیمی اداروں کو بھی نہیں چھوڑتے۔

اب دوسرے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ سعودی عرب اور ایران کی حالیہ کشیدگی نے اس وقت جنم لیا، جب سعودی عرب نے شیخ النمر کو سزائے موت دی۔ شیخ النمر اہلِ تشیع میں سے تھے، لیکن ان کی پیدائش سعودی عرب میں ہوئی تھی۔اس سے پہلے جب سعودی عرب کی قیادت میں 34 اسلامی ممالک کا اتحاد قائم کیا گیا تو اس میں ایران کو نہیں رکھا گیا۔ ایران کو اس بات کا بھی غصہ تھا۔غصے کے ساتھ ساتھ تشویش بھی تھی کہ کہیں یہ اتحاد ایران کے خلاف محاذ گرم نہ کردے۔جب سعودی عرب نے شیخ النمر کی سزائے موت پر عمل درآمد کیا تو ایران سعودی عرب کی مخالفت میں کھل کر سامنے آگیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان حالات اتنے کشیدہ ہوگئے ایران میں سعودی عرب کے سفارت خانے پر حملہ کردیا گیا۔

کچھ روز قبل وزیرِ اعظم نواز شریف اور آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے پہلے سعودی عرب اور پھر ایران کا دورہ کیا۔تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ پاکستان دو برادر ملکوں کے درمیان کشیدگی کے خاتمے کا خواہاں ہے۔ سعودی عرب اور ایران کے دورے کے بعد وزیرِ اعظم نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے

کہا کہ دونوں ملکوں سے بات چیت نے ہمیں حوصلہ دیا ہے۔ ایران اور سعودی عرب سے ہمیں مثبت جواب ملا ہے۔ سعودی عرب اور ایران بات چیت کے لیے بھی تیار ہیں ۔ دونوں ملک ایک دوسرے کو دشمن نہیں سمجھتے۔ پاکستان میزبانی کرنا چاہتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ دو بھائی لڑیں تو ان کی صلح کراؤ۔ دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کا خاتمہ ہماری اولین ترجیح ہے۔ مسلم امہ کے درمیان اتحاد و یک جہتی ہونی چاہیے۔

درحقیقت اتحاد ہی مسلم امہ کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ مسلمان جب تک منتشر رہیں گے، کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔ مسلمانوں کے درمیان فرقہ واریت کا خاتمہ از حد ضروری ہے۔ جب تک مسلمان متحد تھے، کوئی ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی بھی جرءات نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن جب یہ منتشر ہوگئے تو دشمنوں کو موقع ہاتھ آگیا۔ انھوں نے اس حرماں نصیب قوم کا وہ حال کیا کہ زمانے بھر میں یہ قوم رسوا ہوگئی۔ عرب و عجم کی لڑائی بہت پرانی ہے۔ تاریخِ اسلام میں شاید ہی کوئی ایسا دور آیا ہو، جب یہ لڑائی تھمی ہو۔ عرب و عجم کے درمیان فرقہ واریت کی اتنی بڑی اور تاریخی خلیج دیکھ کر مشکل لگتا ہے کہ پاکستان کی کوششوں کے سو فی صد نتائج نکلیں گے۔ لیکن کسی حد تک اس کشیدگی کا خاتمہ ضرو ہو جائے گا۔ بلکہ ان کوششوں کے مثبت اثرات نظر آنے شروع ہوگئے ہیں۔ میری نظر سے ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ علی خامنائی کا

ایک بیان گذرا ہے۔ ان کے مطابق ایران میں سعودی سفارت خانے سے اسلام کو نقصان پہنچا ہے۔ حالیہ کشیدگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو ایران کے سپریم لیڈر سے ایسے بیان کی توقع نہیں تھی۔ درحقیقت یہ پاکستان کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

اب دیکھتے ہیں، آگے کیا ہوتا ہے!!!

# غربت کی ایک بڑی وجہ اور اس کا سدِ باب

ان دنوں سندھ اور پنجاب حکومت کے درمیان 'مک مکا' کا میچ جاری ہے۔ جب کہ خیبر پختون خوا کی حکومت اس میچ کے انجام کی بڑی شدت سے منتظر ہے۔ ہمارے وفاقی وزیرِ داخلہ پچھلے کچھ دنوں سے بیمار تھے۔ جب وہ صحت یاب ہوئے تو انھوں نے اس بات کا برملا اظہار کر دیا کہ قائدِ حزب اختلاف خورشید شاہ نے وفاقی حکومت سے مک مکا کیا تھا۔ دوسری طرف ہمارے قائدِ حزب اختلاف بھی بڑی جوشیلی طبیعت کے مالک ہیں۔ انھوں نے چوہدری صاحب کو وزیرِ اعظم کے آستینوں کے سانپوں میں سے ایک سانپ کہہ دیا۔ تیسری طرف خان صاحب کو موقع مل گیا۔ انھوں نے مک مکا کی قیمت کی بابت دریافت کر لیا۔ انھوں نے سوال کر دیا کہ حکومت نے خورشید شاہ کو خریدنے کے لیے کتنی قیمت ادا کی؟ بہر حال ایک عجیب تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ تناؤ دو طرفہ نہیں، سہ طرفہ ہے۔ 'مک مکا' فی الوقت پاکستان میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ کالم نگار کی حیثیت سے مجھے بھی حالاتِ حاظرہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے 'مک مکا' پر لکھنا چاہیے۔ لیکن اس ساری صورت حال کے باوجود میں جان بوجھ کر آج کے کالم میں کوئی اور موضوع اٹھا رہا ہوں۔ جو یقیناً اس موضوع سے کم اہم ہے۔

پچھلے دنوں بی بی سی اردو کی آفیشیل سائٹ پر ایک خبر شائع ہوئی تھی۔ جس کا عنوان یہ تھا، 'ایک فیصد افراد کی دولت، 99 فیصد کے برابر'۔ اس خبر سے معلوم ہوا کی بین الاقوامی شہرت یافتہ فلاحی ادارے اوکسفیم کے مطابق دنیا کے امیر ترین ایک فیصد افراد کی دولت اب دنیا کے باقی 99 فیصد افراد کی دولت کے برابر ہے۔ اس ادارے نے اپنی رپورٹ کے لیے کریڈٹ سوئس کے اکتوبر کے اعداد و شمار کو بنیاد بنایا ہے۔ اس ادارے نے ڈیوس میں ہونے والی کانفرنس، جو اب ہو چکی ہے، میں عالمی رہنماؤں سے اس عدم مساوات کے خلاف اقدامات کرنے کی اپیل کی ہے۔ اس ادارے کی مذکورہ رپورٹ یہ بھی بتاتی ہے کہ دنیا کے امیر ترین 62 افراد کے پاس عالمی سطح پر موجود 50 فیصد غریبوں جتنی دولت ہے۔ ادارے کی رپورٹ کے مطابق جس کے پاس 6880 امریکی ڈالر نقدی یا اتنی مالیت کے اثاثے ہیں وہ دنیا کے دس فیصد امیر ترین لوگوں میں شامل ہے۔ دنیا کے سر فہرست ایک فیصد امیر افراد کی صف میں شامل ہونے کے لیے سات لاکھ ساٹھ ہزار امریکی ڈالر کے اثاثے یا نقدی درکار ہے۔ یہاں یہ بات واضح کر دی جائے کہ 2010ء میں 50 فیصد غریبوں جتنی دولت 388 افراد کی مجموعی دولت کے برابر تھی۔ "تمام لوگوں کی خوش حالی، آنے والی نسلوں اور کرہِ کے لیے معیشت بنانے کے بجائے ہم نے ایک ایسی معیشت بنائی ہے جو صرف ایک فیصد کے لیے کام کرتی ہے۔" یہ الفاظ ہیں اوکسفیم کے۔

اوکسفیم نے امیر اور غریب کے درمیان اس ظالمانہ فرق کے سدِ باب کے لیے چند تجاویز بھی دیں۔ اس بین الاقوامی فلاحی ادارے کے مطابق مزدوروں کی اجرت اور ایگزیکٹو افسران نے انعامات کے درمیان کی خلیج کو کم کیا جائے۔ اس ادارے نے جنس پر مبنی تنخواہ کے فرق کو بھی کم کرنے، بے اجرت خدمات کا بدلہ دینے اور وراثت میں خواتین کے مساوی حق کی بات کی ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارے نے ادویہ کی قیمتیں کم کرنے اور عدم مساوات سے نمٹنے کے لیے دولت پر ٹیکس لگانے کی بات کی ہے۔

غربت کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ تاہم جس نکتے کی طرف اس بین الاقوامی فلاحی ادارے نے لوگوں کی توجہ مرکوز کی ہے، وہ واقعی غربت کی اہم ترین وجوہات میں سے ایک ہے۔ یہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی ہی شاخسانہ ہے کہ دنیا میں غربت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ دولت کی یہ ناجائز تقسیم کس وقت وقوع پذیر ہوتی ہے؟اس وقت جب، امیر اپنی دولتوں میں سے غریب کے لیے کوئی حصہ مختص نہیں کرتے۔ جب سود اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ سود کو یوں ہی اللہ اور رسول ﷺ سے جنگ کے مساوی قرار نہیں دیا گیا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قبیح عمل کی وجہ سے امیر، بغیر کوئی محنت کیے غریب کی دولت ہتھیا لیتا ہے۔ یوں امیر ہمیشہ امیر رہتا ہے، اور غریب ہمیشہ غریب۔

یہ حقیقت ہے کہ غربت کا کلی طور پر سدِ باب کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ اسی صورت ممکن ہے، جب امیروں سے اس معاملے میں سختی سے نمٹا جائے کہ انھوں نے کیوں کر اتنی ساری دولت جمع کر لی۔ وہ تمام راستے بند کرنے پڑیں گے، جن کے ذریعے امیر بے جاچارے غریب کی دولت پر قبضہ کرلیتا ہے۔ اگر ان تمام راستوں کو بند کر دیا جائے تو غربت خود بہ خود ختم جائے گی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں پوری اسلامی دنیا میں کوئی غریب نہیں تھا۔ یہ بات بڑی عجیب ہے۔ لیکن حقیقت ہے۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی اپنی کتاب تاریخِ دعوت و عزیمت میں لکھتے ہیں : "عمر بن عبد العزیز کی مختصر مدتِ خلافت میں یہ حال ہو گیا تھا کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں زکوۃ کی لے کر آتے تھے کہ جس کو مناسب سمجھا جائے دے دیا جائے، لیکن مجبوراً واپس کرنی پڑتی تھیں کہ کوئی لینے والا نہیں ملتا۔ عمر کے زمانے میں سب مسلمان غنی ہو گئے اور زکوۃ کا کوئی مستحق نہیں رہا۔ "

حضرت عمر بن عبد العزیز نے دراصل وہ تمام راستے بند کر دیے، جن کے باعث غریبوں کی دولت امیروں کے پاس چلی جاتی تھی اور غریب اس ضمن میں خود کو مطلق العنان سمجھتے تھے۔ انھوں نے امیروں کی طرف سے غریبوں پر لگائے گئے تمام ٹیکس معاف کر دیے۔ انھوں نے بیگار کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا۔

ان سے پہلی امراء اور شاہی خاندان کے افراد نے سلطنت کی زمین کا خاصا حصہ شکار گاہ یا چراگاہ کے لیے گھیر رکھا تھا۔ خلیفہ نے اس کو عوام کی ملکیت قرار دے دیا۔ حکام کو تحفے تحائف لینے سے منع کر دیا اور حکم دیا کہ اگر وہ کبھی تمہارے لیے تحفے تھے تو اب رشوت کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہی وہ انقلابی اصلاحات تھیں، جن کی وجہ سے انھوں نے کلی طور پر غربت کا خاتمہ کر دیا۔ دراصل آج دنیا کو غربت کے کلی خاتمے کے لیے عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاحات کی ضرورت ہے!!

## کشمیر کا مسئلہ

بازار میں اسی چیز کی رسد زیادہ ہوتی ہے، جس کی مانگ زیادہ ہو۔ جس چیز کی مانگ ہی نہ ہو، تاجر اس کو کیا بیچے گا۔ بازارِ صحافت میں 5 اور 6 فروری کو "کشمیر" کی مانگ زیادہ تھی ۔ سو اس کے نام پر شہرت کا خوب کاروبار سجا۔ جس طرح ہر سال سجتا ہے۔ 5 فروری کو ٹی وی پر اور 6 فروری کو اخباروں میں کشمیر کے سلسلے میں بہت کچھ کہا گیا، سنا گیا، لکھا گیا اور پڑھا گیا۔ اب اس کے بعد طلب اور رسد کا اصول مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے کشمیر پر کچھ نہیں لکھنا چاہیے ۔ ویسے بھی ہمارے عوام حالاتِ حاضرہ پر مبنی تحریریں پڑھتے ہیں ۔ 5 فروری کے گذر جانے کے بعد کشمیر کا موضوع حالاتِ حاضرہ کا موضوع نہیں رہا۔ کہاں 6 فروری کی یہ شب، جب میں اس موضوع پر چند جملے قلم بند کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور کہاں 5 فروری ۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ زمانے کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے۔ لمحوں لمحوں میں کئی حادثات و واقعات جنم لیتے ہیں ۔ مجھے فی الحقیقت تازہ سے تازہ تر اور تازہ تر سے تازہ ترین واقعے پر لکھنا چاہیے ۔ بازارِ صحافت کا اصولِ طلب و رسد بھی مجھ سے اسی عمل کی توقع رکھتا ہے ۔

مگر کیا کروں ۔۔۔ کچھ موضوعات پیچھا ہی نہیں چھوڑتے ۔ لاکھ کوشش کرتا ہوں

کہ ذہن کے پردے سے ان تلخ موضوعات کے نقوش معجزاتی طور پر مٹ جائیں۔ دامنِ دال ان سے چھٹکارہ پالے۔ تاکہ میں آگے بڑھوں۔ خوب سے خوب تر اور خوب تر سے خوب ترین کی تلاش کروں۔ مگر ناکامی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ ان میں سے ایک موضوع مسئلہِ کشمیر ہے۔ میں چاہتے ہوئے بھی اس موضوع سے اغماض نہیں برت سکتا ۔ سو مجھے اس بات کی کوئی فکر لاحق نہیں کہ ایک پرانے موضوع پر لکھ کر میں قارئین کو خود اس بات کی دعوت دے رہا ہوں کہ میری تحریر کو کراس کرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں۔ لیکن میریر دانست میں کشمیر کا موضوع اس وقت تک پرانا ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک کشمیر آزاد نہیں ہو جاتا۔ میں عقیدتوں، محبتوں اور جذبوں کو محض ایک دن میں مقید کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ عقیدتیں وہی سچی ہوتی ہیں، جو ہر وقت دلوں کو گرماتی رہیں۔ محبتیں وہی حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں، جن سے قلب و جگر ہمیشہ شاداں و فرحاں رہے۔ جذبے وہی اصل ہوتے ہیں، جن کا تلاطم کبھی نہ تھمے۔ ہم صرف 5 فروری کو یومِ کشمیر کیوں منائیں۔ ہمارے لیے تو ہر دن 5 فروری ہونا چاہیے۔

کہا جاتا ہے کہ 5 فروری کو بہ طورِ یومِ کشمیر منانے کا آغاز 1990ء میں جماعتِ اسلامی کا سابق امیر قاضی حسین احمد مرحوم نے کیا تھا۔ 1990ء سے یہ دن ہر سال منایا جاتا ہے۔ اس دن کشمیر کے نام پر ریلیاں نکلتی ہیں، جلسے ہوتے ہیں، "کشمیر بنے گا پاکستان" کی نعرے بازی ہوتی ہے۔ بابائے قوم

کے قول "کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے" کو دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ کی نشستوں پر براجمان شخصیات کشمیر کے حق میں گرما گرم تقریریں کرتے ہیں۔ کشمیر کمیٹی تھوڑی تھوڑی متحرک ہو جاتی ہے۔ ہم سب چیختے ہیں کہ کشمیر کو حقِ خود ارادیت دیا جائے۔ بھارت اقوامِ متحدہ کی قرار دادوں پر عمل کو یقینی بنائے۔ لیکن ان سب سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے جذبات سچے ہوتے ہیں، لیکن ان میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ کشمیر کی شبِ غلامی کو صبحِ آزادی سے متغیر کر دیں۔ اتنی طاقت تو اقوامِ متحدہ کی ان قرار دادوں میں بھی نہیں ہے، جو کشمیر کے سلسلے میں منظور کی گئی ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ آج کل کی بات نہیں ہے۔ کشمیر کے جسم پر یہ ناسور 67 سال پہلے ظاہر ہوا تھا، مگر آج تک سیاست کے میدان کا کوئی حکیم اس کی مسیحائی نہ کر سکا۔ ہمارے بڑے قائد قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہم سے روٹھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد کسی سیاست دان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس مسئلے کو حل کر سکے۔ مسئلہِ کشمیر کی سب سے بڑی وجہ اس قیادت کا فقدان ہے، جس کے اخلاص میں اتنی طاقت ہوتی تھی کہ آن کی آن میں نہ سہی، کچھ تاخیر سے غلامی کی ساری زنجیریں توڑ سکتی تھی۔ قصہِ مختصر یہ کہ بڑے قائد جیسا کوئی مخلص رہنما نہیں آیا۔ اس لیے کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ اب تو ہم اور ہمارے قائدین صرف 5 فروری کو ہی کشمیریوں کو یاد رکھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے وفا کا حق ادا کر دیا۔ اس طرح تو کبھی بھی یہ

مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

دراصل ظلم سے آزادی کی تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ ظلم نہ ہو تو کبھی آزادی کی تحریک نہیں چلتی۔ اگر بھارت نہتے کشمیریوں پر ظلم وستم کرنا بند کردے اور انھیں حقِ خود ارادیت دے دے تو سب کچھ بدل جائے گا۔ کشمیر میں ہندوستان کی پندرہ ہزار سے زائد فوج تعینات ہے۔ یہ فوج کشمیریوں پر ظلم وستم کرتی ہے۔ ظلم نہ ہو تو چیخنے، چلانے اور دھاڑنے کا کسی کو شوق نہیں ہوتا۔ لیکن جب ظلم ہوگا تو مظلوم ضرور چیخ چیخ کر دنیا والوں کو بتائے گا کہ مجھ پر ظلم کیا جارہا ہے۔ کیوں کہ دنیا عالمی گاؤں بن چکی ہے۔

بھارت نے کشمیریوں پر اب تک جو ظلم کیا ہے، اگر اس پر لکھنا شروع کیا جائے تو ہزاروں صفحات کالے کیے جا سکتے ہیں۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق بھارت نے کشمیر میں گذشتہ 27 برسوں میں 94 ہزار 305 کشمیریوں کو شہید کیا۔ یعنی اوسطا ماہانہ 291 کشمیریوں کو شہید کیا گیا۔ اسی طرح اوسطا ماہانہ 331 بچے یتیم ہوئے، 70 خواتین بیوہ ہوئیں، 32 خواتین کو بھارتی فوج کی طرف سے ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ جب کہ 328 گھر تباہ کیے گئے۔ ایک بار پھر باور کرادوں کہ یہ 27 سال کی اوسطا ماہانہ رپورٹ ہے۔

مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے جہاں مخلص قیادت کی اشد ضرورت ہے، وہاں اس بات

کی بھی ضرورت ہے کشمیر کے سلسلے میں باقاعدہ کام کیا جائے۔ ہم توقف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور توقف کشمیر کے مسئلے کو حل ہونے ہی نہیں دیتا۔

## نجکاری کی کہانی

کسی ملک میں حکومت نے ایک ادارہ بنایا۔ اس پر خوب محنت کی گئی۔ اس کی نوک پلک سنوارنے کے لیے خوب سرمایا لگایا گیا۔ کیوں کہ روزی روٹی کا مسئلہ تھا۔بڑے لوگ سمجھتے تھے کہ محنت کریں گے تو کچھ ہاتھ لگے گا۔ سرمایہ خرچ ہوگا تو کچھ ملے گا۔ سو حکومت کی محنت رنگ لائی۔ ادارہ بن گیا۔ لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔یہ ادارہ کافی منافع بخش ثابت ہوا۔ اس نے کئی لوگوں کی روزی روٹی کا مسئلہ حل کیا۔ کئی خاندانوں کو سہارہ دیا۔ اس ادارے نے حکومت کو بھی فائدہ دیا، عوام کو بھی مالا مال کیا۔ وجہ اس کا معیار تھا۔ جس ادارے پر محنت کی جائے گی تو خود بہ خود اس کا معیار بن جائے گا۔ یہ معیار ہی تھا کہ اس نے بین الاقوامی سطح پر اس ادارے کو مشہور کر دیا ۔دیگر ممالک کے ادارے، یہاں کے عملے سے مستفید ہونے لگے۔ یوں اس ادارے نے بہت سے ممالک کے دوسرے اداروں کو بنایا اور سنوارا۔ کہتے ہیں کہ محنت کا پھل ملتا ہے۔ بے شک ملتا ہے۔ اس ادارے پر جس طرح محنت کی گئ، اس محنت نے اس کو ہر جگہ سرخرو کر دیا۔

وقت گزرتا گیا اور گزرتا گیا۔ کیوں کہ وقت کا کام گزرنا ہی ہوتا ہے۔ وقت کوئی روک نہیں سکتا۔ رفتہ رفتہ محنت پر تسہل پسندی غالب آنے لگی۔ پرانی

حکومتیں چلی گئیں ، نئی حکومتیں آنے لگیں ۔ نئی حکومتوں میں محنت کی کمی اور تسہل پسندی کی زیادتی تھی ۔ نئی حکومتوں بھولتی گئیں کہ اس ادارے کو کتنی محنت اور جاں فشانی سے بنایا گیا تھا۔ انھوں نے اس ادارے کے سلسلے میں اپنی دل چسپیاں کم کر دیں ۔ جب حکومتوں کی دل چسپیاں کم ہو گئیں تو ملازمین کی دل چسپیاں بھی کم ہونے لگیں ۔ تسہل پسندی کی سحر کاری تھی اور دل چسپیوں کا فقدان ۔۔۔ کہ اس کا معیار گرنا شروع ہو گیا۔ جب معیار گرا تو بین الاقوامی سطح پر اس کی ساکھ مجروح ہو گئی ۔ منظر بدلا تو بہت کچھ بدل گیا۔ اب کوئی نہیں تھا، جو اس ادارے کے عملے کو اپنا استاد مانتا یا اس سے کچھ سیکھتا۔ کیوں کہ معیار گر رہا تھا۔ اب مقامی لوگوں کے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچنے لگی تھی ، جو اس ادارے کے معیار کے قائل تھے اور لوگوں کو یہ بتاتے نہیں تھکتے تھے کہ ہمارے ملک میں ایک ایسا ادارہ ہے، جس کے معیار پر کوئی حرفِ تنقید آ ہی نہیں سکتا۔

وقت نے کچھ زقندیں اور بھریں تو منظر یک سر بدل گیا۔ اب یہ ادارہ مالی بحران کا شکار تھا۔ یہ ادارہ اربوں روپے کا مقروض ہو گیا۔ یہ اوروں کا پیٹ کیا بھرتا کہ اس کا اپنا پیٹ ہی خالی ہو گیا۔ اب تو کوئی بہ مشکل ہی اس ادارے کے معیار پر کچھ نہ کچھ بھروسا کرتا تھا ۔ اس ادارے کی بد قسمتی تھی کہ یہ حکومتوں کی ترجیحات کو اپنی طرف مرتکز نہ کر سکا۔

ملازمین کا پیٹ

خالی ہونے لگا، ان کی تنخواہیں روکی جانے لگیں، ان کے گھروں کے چولھے ٹھنڈے ہونے لگے تو وہ سراپا احتجاج بن گئے۔ اول اول انھوں نے زبانی کلامی حکومتوں کو آگاہ کیا کہ ہمارے پیٹ خالی ہو رہے ہیں اور ہمارے گھروں کے چولھے ٹھنڈے ہونے لگے ہیں۔ لیکن کچھ نہ ہوا۔ ملازمین پہلے سے غم اور غصے میں مبتلا تھے کہ جلتی پر تیل چھڑک دیا گیا۔

ایک حکومت آئی اور اس ادارے کو فروخت کرنے کی بات کرنے لگی۔ ملازمین کو حیرت ہوئی کہ جب حکومت ان کے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتی تو وہ سرمایہ دار انھیں کیا دے گا، جس کا کام ہی مزدوروں کے خونِ جگر سے فصلِ کاروبار کو سینچنا ہوتا ہے ۔ مشاہدہ بینوں کو یہ بات پریشان کرنے لگی کہ یہ حکومت سڑکوں کی تعمیرات میں اربوں روپے خرچ کر رہی ہے، لیکن اس ادارے کو دینے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک حکومت جب مالی بحران کا شکار ایک ادارہ نہیں سنبھال سکتی تو عوام کو کیا سنبھالے گی۔ یہ حکومت دیگر ممالک سے اپنے ملک کو معاشی طور پر مستحکم کرنے کے لیے نت نئے معاہدے کرتی ہے، مگر اس ادارے کے نہیں سنبھال سکتی۔ بلکہ اس کو بیچنے پر تلی ہوئی ہے۔ حکومت کے اس اقدام پر ملازمین سراپا احتجاج ہو گئے۔ اب ریاست اور ملازمین کے درمیان تلخیاں اس حد تک بڑھیں کہ نوبت مار پیٹ تک آ گئی۔ یہاں تک کہ احتجاج کرنے والوں کو بھاری جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت بہ ضد تھی کہ ادارے کی

نج کاری کرنی ہے۔ اس نے اس کے لیے ہتھیار کا استعمال بھی کر دیا۔ اس خیال سے بے خبر کہ یہ اسی ملک کے باشندے ہیں۔ اس خیال سے بھی بے خبر کہ اس سے اشتعال جنم لے گا۔ دوسری طرف ملازمین نج کاری نہیں چاہتی تھی۔

پھر اچانک سب کچھ بدل گیا۔ ادارے کے ملازمین کسی 'مہربان' کی کوششوں کی بدولت احتجاج سے کنارہ کش ہو گئے۔ حکومت نج کاری کرے گی یا نہیں ؟ اس سوال کا جواب ہنوز تشنۂ تکمیل تھا کہ کسی مہربان کی کوششیں بار آور ثابت ہو گئیں۔ بہ ظاہر حکومت جیت گئی۔ ملازمین ہار گئے۔ اب تو مشاہدہ بینوں کے ذہنوں کو کئی سوالات ڈسنے لگے۔ سوالات کچھ اس نوعیت کے تھے : جب حکومت کی بات ماننی ہی تھی تو کیا ضرورت تھی احتجاج کرنے کی ؟ کیا ضرورت تھی اپنا جانی نقصان کرنے کی ؟ احتجاج سے اس ادارے کا مالی نقصان ہوا، جو پہلے سے خسارے میں جا رہا تھا۔ کیا ضرورت تھی اس نقصان کا موجب بننے کی ؟؟

# عوام سب کچھ سمجھ گئے

نئی حکومت نے آتے ہی منادی کی کہ ہم کرپشن کا خاتمہ کر دیں گے ۔ توانائی کا بحران ٹال دیں گے ۔ہم ملک میں شہد کی نہریں بہا دیں گے ۔ ہم ملک کا خزانہ لوٹنے والوں کا سخت احتساب کریں گے ۔ کسی کو ملک کا خزانہ لوٹنے نہیں دیں گے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔یہ تو معمول کی باتیں تھیں ۔ جو ہر آنے والی حکومت اپنی سیاست پر چار چاند لگانے کے لیے اور عوام کے دل جیتنے کے لیے کیا کرتی تھی ۔ لیکن اہلِ بصیرت جانتے تھے کہ کچھ نہیں ہونے والا۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہی رہے گا۔ کچھ نہیں بدلے گا۔ کرپشن اور لوٹ مار جوں کی توں جاری رہے گی ۔ کیوں کہ یہ مسئلہ تو کئی سالوں پرانا تھا۔ ہر حکومت آنے سے پہلے اس مسئلہ کو ختم کرنے کے دعوے کرتی ۔ لیکن جب وہ حکومت رخصت ہوتی تو یہ کرپشن پہلے سے بڑھ چکی ہوتی ۔ اس لیے اب کی بار بھی سلجھے ہوئے لوگ سمجھ چکے تھے کہ یہ مسئلہ بالکل ختم نہیں ہوگا۔ چاہے اس کے لیے جتنی بھی باتیں کی جائیں ۔

بہر حال ۔۔۔ نئی حکومت نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو اس نے احتسابی ادارے کو حکومت کی مخالف جماعتوں کی تحقیقات اور جانچ پڑتال پر لگا دیا۔ اس احتسابی ادارے کو اختیارات دیے گئے کہ وہ مخالف جماعتوں کے معزز لوگوں کی

بد عنوانیوں کے سلسلے میں خوب چھین بین کرے۔ تاکہ ملک سے کرپشن کا خاتمہ ہو۔ دیانت داری کے چرچے ہوں اور ہر کوئی حکومت کی امانت داری پر واہ واہ کرے۔ حکومت پر داد و تحسین کی بارشیں ہوں اور اس کی عوامی پذیرائی میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہو۔ احتسابی ادارے نے خوب تحقیقات کیں۔ حکومت مخالف جماعتوں کے کئی لوگوں کی مالی بد عنوانی کے پول کھولے۔ جس پر مخالف جماعتیں چیخنے لگیں۔ یہ چیخیں حزب اقتدار جماعت کو خوش گوار محسوس ہونے لگیں۔ کیوں کہ مخالف چیخے تو خوشی ہوتی ہے۔ اس لیے خوب خوش ہوئی۔ جب کہ حزبِ اختلاف جماعتوں کے برے دن شروع ہوگئے تھے۔ انھوں نے کئی طریقوں سے برسر اقتدار معززین کو باور کرانے کی کوشش کی کہ آپ اچھا نہیں کر رہے۔ آخر ہم اور آپ ایک ہی تو ہیں۔ کرپشن ہم بھی کرتے ہیں، آپ بھی کرتے ہیں۔ بد عنوانی کے ہم بھی مرتکب ہیں، آپ بھی ہیں۔ جب ہم اور آپ ایک ہی ہیں تو ہم پر یہ افتاد کیوں کر؟ مت بھولیے کہ آج آپ سیاہ و سفید کے مالک ہیں، کل ہم ہوں گے۔ آج آپ ہماری چیخوں پر مت ہنسیے۔ ورنہ کل ہم آپ کی چیخوں پر قہقہے لگائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ "مک مکا" کر لیا جائے۔ کرپشن نہ ختم ہونے والی چیز ہے۔ اس لیے ہم پر کچھ رحم کیجیے۔ ہم مل کر احتسابی ادارے کے اختیارات محدود کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی پارلیمنٹ پر ہمارا تصرف ہے۔ قوانین جب ہم بناتے ہیں تو توڑ بھی سکتے ہیں۔ جب ہم اس احتسابی ادارے کے اختیارات محدود کر دیں گے تو آپ اور ہم دونوں فائدے میں رہیں گے۔

مگر حکومت مخالفین کا درد نہ سمجھ سکی یا سمجھنے سے قاصر تھی۔ حکومت بس اس پر خوش تھی کہ ہمارے مخالفین دب رہے ہیں۔ ان کی عوامی پذیرائی پر آنچیں آ رہی ہیں۔ یہ آنچیں ان کے لیے اس طرح مفید ہوں گی کہ اگلے پانچ سالوں کے لیے ایک بار پھر وہ سیاہ و سفید کے مالک بن کر ملک کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔ اقتدار میں آتے ہی حکومت کے معززین سمجھنے لگے کہ ان میں تو کوئی خامی ہے ہی نہیں۔ حزبِ اختلاف کی جماعتیں بس یوں ہی تنقید کرتی ہیں۔ کیوں کہ ان کا کام ہی تنقید کرنا ہوتا ہے۔ ہم میں کوئی کم زوری نہیں ہے۔ ہم غلطیوں سے مبرا ہیں۔ ہم نے وہ کچھ کیا، جو اس سے پہلے کوئی اس ملک میں نہ کر سکا۔ ویسے بھی اقتدار میں آنے کے بعد لوگوں کو اپنی غلطیاں نظر نہیں آتیں۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ملک کے معززین اقتدار میں آنے کے بعد خود کو بہترین اور اپنے مخالفین کو بدترین سمجھنے لگتے ہیں۔

پھر رفتہ رفتہ منظر بدلنے لگا۔ حکومت مخالفین کا حکومت کو جاری کردہ انتباہ حقیقت کا روپ دھارنے لگا۔ مخالفین کی یہ باتیں بالکل سچ تھیں کہ بدعنوانی کے مرتکب آپ بھی ہیں، ہم بھی ہیں۔ کرپشن ہم بھی کرتے ہیں، آپ بھی کرتے ہیں۔ احتسابی ادارے نے اپنی تحقیقات کا رخ حزبِ اقتدار جماعت کی طرف کر دیا۔ حکومت کے معززین پہلے حیران اور پھر پریشان ہو گئے۔ حیران اس لیے کہ

اس ادارے کی اتنی ہمت کیسے ہو گئی کہ وہ ہم پر ہاتھ ڈال رہا ہے۔ پریشان اس لیے کہ اب ہمارا کیا ہوگا؟ ہم اپنے دامن میں لگے داغ کیسے دھوئیں گے؟ حکومت کی حیرانی اور پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ کیوں کہ اب بہت سے ایسے لوگوں کا احتساب ہونے جارہا تھا، جو ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ حیرانی اور پریشانی اتنی بڑھی کہ غیض اور غضب کا ظہور ہوگیا۔ ملک کے سب سے طاقت ور ترین شخص نے کھلم کھلا اس احتسابی ادارے کو وارننگ دے دی کہ یہ ادارہ اپنے دائرے میں رہے، ورنہ کارروائی کریں گے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ ایک طرف حکومت نے ہی اس ادارے کے چیئرمین کا انتخاب کیا تھا۔ دوسری طرف حکومت ہی اسے اپنے دائرۂ کار میں رہنے کی تنبیہ کر رہی تھی۔ اور تنبیہ بھی سب کے سامنے، یعنی جلسۂ عام میں۔ حالاں کہ اگر اپنے متعین کردہ کسی شخص کا قصور ہو تو اسے بند دروازوں میں چھپ چھپ کر تنبیہ کی جاتی ہے، تاکہ سبکی نہ ہو۔ اب میڈیا کو محسوس ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ جب سب کے سامنے ایک احتسابی ادرے کو اپنے دائرۂ کار میں رہنے کی تنبیہ کی جارہی ہے تو کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوا ہے، جو حکومت کی دانست میں نہیں ہونا چاہیے تھے۔ بالآخر "اس حمام میں سب ہی ننگے" اور "کس کی دم پر پاؤں آیا ہے" جیسے محاورات جنم لینے لگے۔

اس طرح عوام سب کچھ سمجھ گئے!!

# بنیادی مسائل حل ہونے چاہئیں

وہ ایک عام علاقے کا عام آدمی تھا۔ غریب تھا، سو محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ صبح کو اٹھ کر ناشتا کرنا، پھر بچوں کو اسکول چھوڑنا، پھر محنت مزدوری کرنے کے لیے بازار کا رخ کرنا اور پھر شام کو گھر لوٹ آنا۔ یہی اس کا برسوں کا معمول تھا۔ کبھی کبھار شام کو وہ ٹی وی پر خبریں بھی دیکھ لیتا تھا۔ تاکہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے بارے میں اسے آگاہی حاصل ہو۔ وہ پانچ جماعتیں پاس تھا۔ اس نے کسی گورنمنٹ اسکول میں کافی عرصہ پہلے، جب وہ بچہ تھا، یہ پانچ جماعتیں پاس کی تھیں۔ لیکن اسے اپنی ان پانچ جماعتوں پر آج کی گریجویشن سے بھی زیادہ فخر تھا۔ اس کے خیال میں اُس کی پانچ جماعتیں، آج کے گریجویشن سے بھی بہتر تھیں۔ بہرحال یہ اس کا خیال تھا۔ اس کے اس خیال سے جزوی طور پر اتفاق کیا جاسکتا ہے، کلی طور پر نہیں۔ پاکستان کی سیاست پر اس کی گہری نظر نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ وہ اخباروں کا ڈھیر لگا کر سارا دن پڑھتا رہے۔ لیکن شام کو ٹی وی پر خبریں دیکھنے کی وجہ سے اس کو ملک میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں ضرور علم ہوتا تھا۔

ملک کے وزیرِ اعظم اس کے شہر یعنی کراچی میں آئے تو اسے معلوم ہوگیا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وزیرِ اعظم نے کراچی میں گرین لائن منصوبے کا سنگِ بنیاد رکھ دیا ہے۔ اس سے پہلے جب وہ "گرین" کا لفظ سنتا تو اس کے ذہن میں لاہور آ جاتا۔ لیکن اب اسے علم ہوا کہ وزیرِ اعظم کراچی میں بھی اس منصوبے کا آغاز کر رہے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس منصوبے پر 16 ارب روپے خرچ کیے جائیں گے۔ اس سے پہلے وزیرِ اعظم آزاد کشمیر گئے تھے، جہاں انھوں نے قومی صحت پروگرام کی بات کی تھی، وزیرِ اعظم نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس اسکیم سے مظفر آباد کے 82 ہزار لوگ مستفید ہوں گے۔ وہ وزیرِ اعظم کے ان مثبت کاموں سے بہت خوش ہوا۔ خصوصا وزیرِ اعظم کے قومی صحت پروگرام نے اس کا دل جیت لیا۔ کیوں کہ اس میں غریبوں کی بات کی گئی تھی اور وہ بھی ایک غریب شخص تھا۔ اس کا اس اسکیم پر خوش ہونا فطری بات تھی۔

مگر وزیرِ اعظم کے ان مثبت کاموں نے جہاں اسے خوش کیا، وہاں اسے اداس بھی کر دیا۔ وہ غریب تھا اور غریبوں کی طرح سوچتا تھا۔ اس کی اداسی کا تناسب اس کی خوشی سے زیادہ تھا۔ وجہ یہی تھی کہ وہ غریبوں کی طرح سوچتا تھا۔ جب حکومت کی طرف سے غریبوں کو کوئی نوید سنائی جاتی تو وہ یہ ضرور سوچتا کہ اسے کیا فائدہ ہوگا۔ جب اس کو معلوم ہوتا کہ اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو وہ اداس ہو جاتا اور بہت دنوں تک اداس رہتا۔ اب کی بار بھی اس نے یہی سوچا

۔ سو وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ ان اسکیموں میں اسے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے ۔ اس لیے وہ بہت اداس ہوگیا۔ وزیرِ اعظم کا قومی صحت پروگرام پاکستان کے صرف دو شہروں ، اسلام آباد اور مظفرآباد تک محدود تھا۔ جب کہ وہ کراچی میں رہتا تھا۔ اور کراچی کی کسی ایسی بستی میں رہتا تھا ، جو بڑوں کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت سے عاری تھی ۔ اس لیے اسے اس حقیقیت کا ادراک ہو گیا کہ قومی صحت پروگرام میں اس کے لیے اور اس کی بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں رکھا ہوا۔ ہاں ، اگر وزیرِ اعظم اس اسکیم سے پورے ملک کے غریبوں کو مستفید کریں تو واقعی یہ اسکیم اس کے لیے سود مند ثابت ہوگی ۔ مگر جب تک یہ اسکیم مظفرآباد سے کراچی تک پہنچے گی ، اس وقت تک شاید کوئی اور حکومت آجائے اور یہ اسکیم ختم ہوجائے ۔ کیوں کہ کراچی سے مظفرآباد کا راستہ خاصا طویل ہے ۔ گرین لائن بس منصوبے میں بھی اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ کسی غریب علاقے میں رہتا تھا۔ جب کہ گرین لائن بس کے روٹ میں اس کے علاقے کا نام ونشان تک نہیں تھا۔

اس کے اپنے بہت سے مسائل تھے ۔ جو برس ہا برس سے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے ۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے یہ مسائل ختم ہو جائیں ۔ اگر سارے نہیں تو کچھ نہ کچھ تو ضرور ختم ہونے چاہئیں ۔ مثال کے طور پر اس کے بچے پرائیویٹ اسکول میں پڑھتے تھے ۔ اسے ہر مہینے اپنی تنخواہ اور مزدوری کا بڑا حصہ بچوں کی

فیسوں میں دینا پڑتا تھا۔ اس کی غریب معیشت پر اس وقت ایٹم بم گر جاتا، جب اسے دو مہینوں تک ڈبل فیس ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس کی ہمت اس وقت جواب دے دیتی تھی، جب اسکولوں کا نیا سال شروع ہوتا تھا اور اسے بچوں کی کاپیاں کتابیں لینی ہوتی تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ گورنمنٹ اسکولوں کے اساتذہ پڑھانا شروع کر دیں، تاکہ وہ اپنے بچوں کو بغیر فیس کے اچھی تعلیم دلا سکے۔ مگر اس کی یہ خواہش برسوں سے پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے گھر میں اکثر و بیشتر پانی کا مسئلہ رہتا تھا۔ ہاں! پانی کا مسئلہ۔ کبھی کبھار تو پانی بالکل نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھار خراب اور بدبودار پانی آتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو وہ پانی نہیں پلاتا تھا کہ کہیں اس کے بچے بیمار نہ ہو جائیں، جب پانی بالکل نہیں آتا تھا تو وہ سخت اذیت کا شکار ہو جاتا تھا، اسے بڑی محنت اور کوشش کے بعد کسی حد تک پانی ملتا تھا۔ وہ پینے کے لیے باہر سے پانی خریدتا تھا، اس طرح پینے کے پانی میں اس کے کئی پیسے چلے جاتے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ پانی کا مسئلہ حل ہو جائے۔ لیکن یہ مسئلہ کافی عرصے سے حل نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ حکامِ بالا کو بنیادی مسائل پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ پانی کا مسئلہ بنیادی مسائل میں سے ایک ہے۔ جہاں پینے کا پانی نہ ہو، وہاں گرین لائن منصوبوں سے زیادہ پانی کے منصوبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ سب سے پہلے بنیادی مسائل حل ہونے چاہئیں۔ مگر کب حل ہوں گے؟ یہ سوچ کر اسے کافی مایوسی ہوتی تھی۔

## نا انصافی

قوموں کی نوک پلک سنوارنے میں انصاف اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ جنگل کو جنگل اس لیے کہا جاتا ہے، کیوں کہ وہاں انصاف نہیں ہوتا۔ یوں ہی نہیں کہا گیا کہ کفر پر قائم حکومت زندہ رہتی ہے، جب کہ ظلم اور نا انصافی پر قائم حکومت اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ کسی بھی حکومت کے لیے انصاف قائم کرنا ایک مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ انصاف کیا ہے؟ انصاف یہ ہے کہ سب کے حقوق کی پاس داری کی جائے۔ کسی کو کم تر نہ سمجھا جائے۔ سزا سب کے لیے یک ساں ہو۔ اگر کوئی امیر جرم کرے تو اسے وہی سزا ملنی چاہیے، جو غریب کو اسی جرم کے کرنے پر دی جاتی ہے۔ اگر کوئی حکومت نا انصافی کرتی ہے، تو وہ عوام سے زیادہ اپنا نقصان کرتی ہے۔ کیوں کہ عوام ایسی حکومت کو پسند ہی نہیں کرتی، جو انصاف نہ کرے۔ اور کبھی کبھار عوام کی یہی نا پسندیدگی حکومت کے لیے وبالِ جاں بن جاتی ہے۔ زیرک اور عقل مند حکم ران وہی ہوتا ہے، جو سب کو دیکھ کر چلتا ہے اور حتی الامکان اپنی راج دھانی میں انصاف پر مبنی نظامِ حکومت کو فروغ دینے کے لیے مصروفِ عمل رہتا ہے۔

ان دنوں ہمارے دانش وروں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ پاکستانی قوم نئے

سیاسی اور معاشرتی منظر کی وجہ سے دو انتہاؤں پر کھڑی ہے۔ کسی بھی قوم کے لیے یہ واقعی تشویش ناک صورت حال ہوتی ہے۔ لیکن ہماری قوم آج ان دو انتہاؤں پر کیوں کھڑی ہے ؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہماری قوم دو اانتہاؤں پر منقسم تھی نہیں ، بلکہ اس کو کیا گیا ہے۔ وجہ نا انصافی ہے۔ حکومت انصاف کرے تو قوم میں پھیلا خطرناک انتشار خود بہ خود ختم کیا جا سکتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ ناانصافی ایک خطرناک قسم کی انتہا پسندی کو بھی جنم دیتی ہے۔ جس سے قوم کی تقسیم در تقسیم کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ہم اپنی قوم کو ہی دیکھ لیں۔ لبرل لوگ اور مذہبی لوگ ایک دوسرے سے کتنے دور ہو چکے ہیں۔ یہ در حقیقت موجودہ حکومتی پالیسیوں کا ہی شاخسانہ ہے۔ حکومت نا انصافی کی مرتکب ہوئی۔اس لیے ہمیں یہ منظر دیکھنا اور سہنا پڑ رہا ہے۔

حکومت سے زیادہ عوام سے کون واقف ہوتا ہے ؟ پچھلے دنوں حکومت نے عوام کا مزاج جانتے ہوئے بھی ایک ایسے شخص کو پھانسی دے دی ، جس کو عوام اتنا جانتے نہیں تھے ، جتنا مانتے تھے۔جاننے اور ماننے کی بھی عجیب منطق ہے۔ جاننے والا عقل کو مرکز و محور سمجھتا ہے ، جب کہ ماننے والا عشق کو۔ معرکۂ عشق و عقل میں جیت باالآخر عشق کی ہی ہوتی ہے۔جب عشق کی جیت ہوتی ہے تو عقل استعجاب اور حیرت کے بحر بے کراں میں ڈوب جاتی ہے۔ عقل پریشان ہو جاتی

ہے کہ آخر عشق نے یہ معرکہ کیسے سر کر لیا، جو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا؟
میں بھی کیسی بحث میں پڑ گیا۔ بات ہو رہی تھی حکومت کی، جس نے پچھلے دنوں ایک ایسے شخص کو پھانسی دی، جس کی عقیدت ہمارے عوام کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب حکومت سے اس بابت دریافت کیا گیا تو جواب ملا کہ یہ عدالتی فیصلہ تھا۔ حکومت کا نہیں۔ بجا اور بالکل بجا۔ لیکن انصاف کا تقاضا پورا کرتے ہوئے بھی حکومت ناانصافی کی مرتکب ہوئی۔ وہ اس طرح کہ جو اس ساری جنگ وجدل کی اصل محرکہ ہے، وہ ابھی تک صحیح سلامت ہے۔ 4 جنوری 2011ء کو سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو قتل کیا گیا۔ ان کے انتقال سے پہلے توہینِ رسالت کی مرتکبہ آسیہ بی بی کا فیصلہ عدالت کر چکی تھی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ سلمان تاثیر کا کیس تو چار پانچ سالوں میں نمٹا دیا جائے لیکن اس سے بھی پہلے سے چلنے والے کیس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ جو لوگ ممتاز، قادری کی پھانسی پر آسیہ بی بی کی پھانسی یا سزا کی بات کر رہے ہیں، وہ اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ بلاشبہ انصاف بھی یہی ہے۔ میرے خیال میں حکومت اب بھی ۔۔۔اگر چہ بہت سارا وقت گزر چکا ہے ۔۔۔ یہ کام کر لیتی ہے تو ہمارے عوام کو دو انتہاؤں سے نکالنے میں کام یاب ہو جائے گی۔

میں نا انصافی کا رونا کہاں تک رووں؟ یہاں صرف حکومت ہی نہیں عوام بھی نا انصافی کی مرتکب ہوتی ہے۔ میڈیا کو ہی لے لیجیے۔ جب ممتاز قادری کی پھانسی کا واقعہ پیش آیا تو پیمرا نے بڑی سختی سے عوام کے احتجاج وغیرہ کی کوریج سے منع کر دیا اور جو میڈیا گروپ اس کا "مرتکب" ہوا، اس کا نوٹس لے لیا گیا۔ یہ کیا بات ہوئی؟ جب میڈیا حق و صداقت کا علم بردار ہے تو تو پھر یہ جانب داری کیوں کر؟ میرے خیال میں یہ بھی ایک قسم کی نا انصافی ہے۔ پیمرا کی طرف سے کہا گیا کہ میڈیا کے اس عمل سے ملکی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے پیمرا کی بات مان لی اور جو کچھ کہا گیا، اس پر من و عن عمل کیا گیا۔ اخبارات کے اداریوں میں ملکی کے موجودہ حالات میں بھونچال پیدا کرنے والے اس واقعے سے بڑی چابک دستی اغماز برتا گیا۔ ہمارے ملک کے دانش وروں اور قلم کاروں نے (سوائے چند کے) بھی اس ضمن میں محتاط" رہنے کی مکمل کوشش کی۔"

مگر سماجی میڈیا کا کیا جائے؟ یہ شتر بے مہار ہے۔ جو مواد ٹی وی پر ممنوع قرار دیا گیا، وہ یوٹیوب، فیس بک، واٹس ایپ وغیرہ پر آ گیا۔ مگر پیمرا کے پاس اس دردِ لادوا کے لیے کوئی علاج نہیں تھا۔

ممتاز قادری کے جنازے میں لاکھوں کا مجمع تھا۔ اس مجمعے کو دیکھ کر "ماننے

سے زیادہ" جاننے "پر یقین رکھنے والے حیران و ششدر رہ گئے۔ ان کو اس کی توقع" نہیں تھی۔ ہمارے میڈیا کے بڑے حصے نے ممتاز قادری کی پھانسی کے ضمن میں لبرل لوگوں کا ساتھ دیا۔ میڈیا سمجھ رہا تھا کہ شاید اس کی" رائے عامہ کی ہم واری " رنگ لائے گی۔ مگر ممتاز قادری کے جنازے میں اتنے بڑے عوامی اجتماع نے شرکت کر کے بتا دیا کہ پاکستان کے عوام کا جھکاؤ مذہب کی طرف زیادہ ہے۔ حکومت اور عوام کو سوچنا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان دونوں کی ناانصافیوں کی وجہ سے ممتاز قادری کو اتنی زیادہ عوامی پذیرائی ملی ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر دونوں کو اپنے رویوں میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔

# پانی کا بحران

پانی زندگی کے لیے کس قدر ضروری ہے، اس کا اندازہ سورۃ الانبیاء کی آیت نمبر 30 سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس آیتِ مقدسہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اور ہم نے ہر جان دار چیز کو پانی سے پیدا کیا ہے۔ تو کیا پھر یہ ایمان نہیں لائیں گے ؟" اس کے علاوہ بھی قرآنِ حکیم کی بہت ساری آیاتِ مبارکہ میں زندگی کی اس بنیادی ضرورت کا ذکر آیا ہے۔ ان آیات کی رشنی میں یہ کہنا بالکل حقیقت ہے کہ پانی زندگی کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا تصور محال ہے۔ اس عظیم نعمتِ خداوندی سے نہ صرف انسانوں کی زندگی وابستہ ہے، بلکہ دیگر جاندار بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا ہے۔ یعنی ہر جاندار کے بنیادی خمیر میں پانی رکھ دیا گیا ہے۔ اب بغیر پانی کے یہ جان دار کیسے زندہ رہ سکتے ہیں ؟

بد قسمتی سے ان دنوں بالعموم پورا پاکستان اور بالخصوص شہر قائد پانی کے بحران کا شکار ہے۔ پانی کا مسئلہ بنیادی مسئلہ ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے حکامِ بالا کی توجہ اس جانب نہیں ہے۔ گو اب تک یہ مسئلہ اتنا زیادہ سنگین نہیں ہوا ہے، لیکن اگر اس مسئلے سے اسی طرح لاپراوئی برتی گئی

تو آنے والے وقتوں میں یہ مسئلہ بہت زیادہ سنگین ہو جائے گا۔ہمارے حکم رانوں کو سوچنا چاہیے کہ ان شہریوں کے لیے وہ لمحہ کتنا اذیت ناک ہوگا، جب وہ کئی دنوں تک پانی جیسی بنیادی ضرورت سے محروم رہتے ہوں گے، جب انھیں ایک گیلن پانی کے لیے کتنی تگ و دو کرنی پڑتی ہوگی، جب بارشوں کے بعد انھیں کئی دنوں تک بدبو دار پانی پر گزارہ کرنا پڑتا ہوگا۔ صرف بارشوں کے بعد کیوں ؟ انھیں تو ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہوگا کہ کہیں اچانک ان کے گھروں کے نلوں سے بدبو دار پانی آنا شروع نہ ہو جائے ۔بنیادی ضرورت سے محرومی بہت بڑی محرومی ہوتی ہے۔ اگر عوام کو صاف پانی اور سستی روٹی مل جائے تو یقین کریں عوام بہت خوش ہو جائیں گے۔ انھیں کسی گاڑی اور بس کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی انھیں ملک کے طول و عرض میں پاس ہونے والے کسی قانون سے لینا دینا ہے۔یہ کتنی الم ناک صورت حال ہے کہ پینے کے لیے صاف پانی میسر نہیں ہے۔ یعنی عوام اب پینے کے پانی کے لیے بھی پیسے خرچ کرے۔ عوام پر پہلے منہگائی کا کم بوجھ ہے جو یہ اضافی بوجھ بھی ان پر ڈالا جا رہا ہے۔ منہگائی کا بھی عجیب مسئلہ ہے۔ ایک زمانے تک ہم سنتے آ رہے تھے کہ اگر پیٹرول سستا ہو جائے تو ہر شے سستی ہو جاتی ہے۔ مگر اب یہ حقیقت مفروضے کی صورت اختیا کر چکی ہے۔ پچھلے دنوں وزیر اعظم نے پیٹرول سستا کر دیا تو دوسرے دن ہمیں معلوم ہوا کہ دودھ منہگا ہو چکا ہے۔ آخر کار کراچی کے کمشنر اور ڈیری فارم کے مالکان کے مذاکرات ہوئے ۔ جس کی بنا پر یہ بلا ٹلی

۔ پیٹرول سستا ہوا تو عوام اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اب ہر شے سستی ہو گئی ۔ اب "نیا قانون" نافذ ہو جائے گا۔ دراصل عوام نے سعادت حسن منٹو کا "نیا قانون" نہیں پڑھا تھا۔ اگر وہ یہ پڑھ لیتے تو وہ کسی صورت "منگو کوچوان" نہ بنتے۔ بلکہ وزیرِ اعظم کے اس فیصلے پر معنی خیز قہقہہ لگا کر چپ سادھ لیتے ۔ مگر عوام تو پھر عوام ہوتے ہیں ۔

بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں پہنچ گئی ۔ ہم بات کر رہے تھے پانی کی اور پہنچ گئے منہگائی تک ۔ یہاں تک کہ "نیا قانون " اور "منگو کوچوان " کی بات بھی کر دی۔ چلو کوئی بات نہیں ۔ منہگائی بھی عوامی مسئلہ ہے۔ اگر جزوی طور پر اس کا ذکر ہو گیا تو کیا ہو گیا۔ پاکستان میں پانی کا مسئلہ شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں سپریم کورٹ نے شہر قائد میں غیر قانونی ہائیڈرنٹس سے متعلق اپنی درخواست کی سماعت کرتے ہوئے کہا کہ واٹر اینڈ سیوریج بورڈ نااہلی اور بد عنوانی کی وجہ سے تباہ ہو رہا ہے۔ سپریم کورٹ کے ججز کی یہ بات دل کو لگی کہ اگر شہر میں پانی کی قلت ہے تو پھر ٹینکرز کو پانی کہاں سے مل رہا ہے ؟ عدالت کا یہ نکتہ واقعی قابلِ غور ہے کہ ایک طرف عوام کے لیے پینے کا پانی نہیں ہے تو دوسری طرف ٹینکرز بھرے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ سپریم کورٹ نے یہ بھی کہا کہ اصل معاملہ یہ ہے کہ پمپوں کی عمر ختم ہونے کے باعث آپ پانی کی مقدار کا تعین نہیں کر سکتے ۔ کسی کو

درست طور پر نہیں معلوم کہ کہاں کتنا پانی دیا جارہا ہے۔ میٹر کیوں نہیں لگاتے۔
جسٹس امیر ہانی مسلم نے کہا کہ ہم آپ کی (واٹر بورڈ کی) کی کارکردگی اس وقت مانیں گے، جب شہر میں 100 فی صد گھروں میں پانی دست یاب ہوگا اور ٹینکرز ختم ہو جائیں گے۔
پانی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ مگر یہ اسی صور ممکن ہے، جب ہمارے حکم ران اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے عمل اقدامات اٹھائیں۔ واپڈا کے چیئرمین ظفر محمود کہتے ہیں کہ کراچی میں زیرِ زمین پانی استعمال کے قابل نہیں ہے۔ اگر اس شہر میں ڈی سیلینیشن پلانٹس لگائے جاتے ہیں تو مستقبل میں کراچی میں پانی کی قلت نظر نہیں آتی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں پانی ذخیرہ کرنے پر سب سے زیادہ وسائل خرچ کیے جاتے ہیں ۔کیا ہمارے حکم ران پانی کے بحران کے حل کے لیے سب سے زیادہ وسائل خرچ کر سکتے ہیں یا شہر قائد میں ڈی سیلینیشن پلانٹس لگا سکتے ہیں؟

# بھارتی وزیرِ اعظم کا اعترافِ حقیقت

اس میں شک نہیں کہ اسلام امن کا دین ہے۔ اس دین میں پوری انسانیت کی بقا پنہاں ہے۔ اس گئے گزرے دور میں یہی وہ دینِ متین ہے، جس میں انسانیت کے ہر مرض کی شفا ہے۔ ہر دکھ کا درد اس دین میں موجود ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں غیر مسلموں کے لیے بھی رحمت ہے۔ اس دین میں دہشت گردی نہیں ہے۔ مغرب، اور اسلام مخالف لوگ جتنا چاہیں، اس دینِ مبین سے دہشت گردی کو جوڑتے رہیں، لیکن جن کے سامنے حقیقیت عیاں ہو جائے گی، وہ پکار اٹھیں گے کہ بلاشبہہ دہشت گردی کا اس دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ لوگ اس دینِ مبین کی طرف کھنچتے چلے آئیں گے۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اہلِ مغرب کو پریشان کر دیا ہے۔ کئی مشہور لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں۔ غیر مشہور لوگ نہ جانے کتنے ہیں۔ یہ اسلام کا وہ اعجاز ہے، جو اس کی حقانیت و صداقت کی سب سے بڑی مثال ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ چیک ری پبلک سے تعلق رکھنے والی سابقہ مس ورلڈ، مارکیٹا کورینکووا مسلمان ہو گئی ہیں۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ ذہنی پریشانی کا شکار تھیں، مگر جیسے ہی وہ کلمہِ طیبہ پڑھ کر مسلمان ہوئیں تو ان کی سکون مل گیا۔ وہ خود کہتی ہیں کہ جب انھوں نے کلمہ طیبہ پڑھا تو ان کی ساری پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ سابقہ مس ورلڈ دبئی میں منتقل ہو گئی ہیں۔ وہ کہتی

ہیں کہ میں مستقل طور پر دبئ میں رہنا چاہتی ہوں اور اسلام کا مطالعہ جاری رکھنا چاہتی ہوں ۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد حجاب لینا شروع کر دیا ہے ۔ اب ان کا نیا نام مریم ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ جب انھیں معلوم ہوا کہ اسلام میں عورت کا رتبہ کتنا بلند ہے تو انھوں نے اسلام قبول کر لیا ۔ یہاں حیرت ناک بات یہ ہے کہ اسلام میں عورت کے بلند رتبے کے بارے میں سابقہ مس ورلڈ کو تو معلوم ہو گیا ، لیکن کچھ مسلمان پھر بھی مغرب کے بتائے ہوئے راستے اور روش میں عورت کا بلند رتبہ ڈھونڈنے پر مصر ہیں ۔ ان مسلمانوں کو یہ رویہ ترک کر دینا چاہیے اور اسلام کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہیے ۔ تاکہ انھیں بھی معلوم ہو سکے کہ اسلام میں عورت کا بہت بلند مرتبہ ہے ۔

موضوعات تو اور بھی بہت سارے تھے ۔ انڈیا کے ہاتھوں پاکستانی کرکٹ ٹیم کو شکست ہو گئی ۔ سابق صدر پرویز مشرف کا نام ڈرامائی انداز میں ای سی ایل سے خارج کر دیا گیا ۔ اب وہ دبئ میں ہیں ۔ پاکستان کی مذہبی جماعتوں نے پنجاب حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ 27 مارچ تک حقوقِ نسواں بل کو ختم کر دیں ، ورنہ 1977ء والی تحریک چلائی جائے گی ۔ یہ سارے ایسے موضوعات ہیں ، جن پر ملک کے دانش ور حضرات لکھ رہے ہیں اور تبصرے کر رہے ہیں ۔ اس خاک سار کا ارادہ بھی انھی موضوعات میں سے کسی ایک موضوع پر لکھنے کا تھا ۔ مگر ایک خبر نے ساری توجہ ان موضوعات سے ہٹا دی ۔ کیوں کہ خبر ہی ایسی تھی ، جو

مجھے مجبور کر رہی تھی کہ مجھے اِسی موضوع پر لکھنا چاہیے۔ یہ خبر اسلام کے بارے میں نریندر مودی کے خیالات سے متعلق تھی۔ نریندر مودی کسی زمانے میں بھارتی گجرات کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ اُن دنوں انھوں نے مسلمانوں پر عرصہِ حیات تنگ کیا تھا۔ لیکن اب وہ بڑی حد تک بدل گئے ہیں۔ گذشتہ دنوں ایک صوفی فورم پر انھوں نے دینِ اسلام کی تعریف کی تو من حیث المسلم مجھے بہت خوشی ہوئی۔ واضح رہے کہ وہ ایک ہندو اسٹیٹ کے وزیرِ اعظم ہیں۔ یہ بہت بڑا منصب ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسلام کی تعریف کی۔ بلاشبہہ ان پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی تھی کہ اسلام سے دہشت گردی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے اس وقت بہت خوشی ہوتی ہے، جب کوئی غیر مسلم دینِ اسلام، رسولِ اکرم ﷺ اور اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرتا ہے۔ جس طرح دینِ اسلام کے سلسلے میں بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی نے اعترافِ حقیقت کیا ہے۔

بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی میں آل انڈیا علماء اور مشائخ بورڈ کے زیرِ اہتمام ورلڈ صوفی فورم کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اللہ تعالی رحمان بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ اللہ تعالی کے 99 ناموں میں سے کسی ایک کا مطلب بھی تشدد اور طاقت کے معنی نہیں رکھتا۔ صوفیاء اکرام نے محمد ﷺ کا پیغام دنیا میں پہنچایا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کسی مذہب خصوصا مسلمانوں کے خلاف نہیں، بلکہ دہشت گرد دنیا کی سب سے چھوٹی

اقلیت ہیں۔ جسے ختم کرنا سب مذاہب کا فرض ہے۔ ہم ہر سال دہشت گردی کے خاتمے کے لیے 100 ارب ڈالر خرچ کر رہے ہیں۔ جب کہ یہ رقم غریبوں کی ترقی اور ان کی بحالی کے لیے استعمال ہونی چاہیے۔ صوفی فلسفے کے مطابق پوری دنیا ایک خاندان کا درجہ رکھتی ہے۔ جسے دہشت گردی کا بڑا خطرہ ہے۔ صرف 2015ء میں دنیا کے 90 سے زائد ممالک دہشت گردی کا شکار ہوئے ہیں۔ صوفی ازم بھارت میں اسلام کا اصل چہرہ ہے اور قرآن پاک کی تعلیمات کو عام کرنے میں پیش پیش ہے۔ کون ہے جو بھارت کی خوب صورتی کا اعتراف نہیں کرتا۔ بھارت دنیا میں جنت کی ایک مثال ہے۔ حضرت آدم (علیہ السلام) جنت کے محلات سے دنیا میں آئے اور سری لنکا م جو اُس وقت بھارت ہی تھا، وہاں آئے۔ مور جنت کا پرندہ ہے اور بھارت میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ بھارتی وزیرِ اعظم نے بابا بلھے شاہ، حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہم کا نام لے کر انھیں خراجِ تحسین پیش کیا اور انھیں ہر مذہب کے لوگوں کے لیے اتحاد کی علامت قرار دیا۔

اسلام کی حقانیت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ ایک ہندو اکثریت پر مشتمل ملک کے ہندو وزیرِ اعظم نے اسی ملک میں کھڑے ہو کر، ہندو ازم کی نہیں، اسلام کی حقانیت کا اعتراف کر دیا۔ سبحان اللہ

# اسلام یا سیکولرازم؟

بلجیم کا دارالحکومت برسلز دھماکوں سے لرز اٹھا۔ نتیجے میں 37 ہلاک اور 200 زخمی ہوئے۔برسلز کا شہر اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ یہ نیٹو کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ مبصر کہہ رہے ہیں کہ یہ واقعہ دوسرا نائین الیون ثابت ہوگا۔ ہماری دعا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ اللہ تعالٰی امتِ مسلمہ پر رحم فرمائے۔ آمین

14 اگست ہو یا 23 مارچ یا کوئی اور قومی دن ہو، نظریاتی بحث میں الجھنا ہمارے دانش وروں کی عادت بن چکی ہے۔ نظریاتی جنگ بھی بہت بڑی جنگ ہوتی ہے۔ اس سے انسانوں کا خون تو نہیں بہتا۔ البتہ نفرتیں ضرور پروان چڑھتی ہیں۔ہم کئی اقسام میں منقسم ہیں۔ اس لیے آج کل ہمیں قوم نہیں، بلکہ جتھا یا ریوڑ کہا جاتا ہے۔ ان دنوں فرقہ وارانہ بحث سے زیادہ "اسلام یا سیکولرازم" پر بحث ہوتی ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ عوام کا مزاج مذہبی ہے۔ جب کہ دانش وروں کا مزاج مذہبی نہیں ہے۔ ہمارے دانش ور پاکستان کو ایک سیکولر یا لبرل ریاست دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب کہ عوام یہ نہیں چاہتے۔ دانش ور سمجھتے ہیں کہ عوام کا جھکاؤ

سیکولر ازم کی طرف اس لیے نہیں ہے، کیوں کہ وطنِ عزیز میں ملائیت کی اجارہ داری ہے۔ یہ مولوی عوام کو سیکولر ازم کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میڈیا کے زیادہ تر حصے پر دانش وروں کی اجارہ داری ہے، مگر اس کے باوجود وہ عوام کا جھکاؤ مذہب کی طرف سے ہٹا کر سیکولر ازم کی طرف نہ کر سکے۔ انھیں سوچنا چاہیے ان کی کوششیں بار آور ثابت کیوں نہیں ہو رہیں ؟

مذہبیوں اور سیکولر حضرات کے درمیان ایک وسیع خلیج ہے۔ یہ خلیج روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس دوری کے کیا نتائج نکلیں گے، فی الوقت مذکورہ بالا دونوں قسموں کے حضرات اس سے بے خبر ہیں۔ ہم پہلے سے منقسم تھے۔ مذہب اور سیکولر ازم کی جدید نظریاتی کش مکش نے ہمیں مزید تقسیم کر دیا ہے۔ حال یہ ہے ایک مذہبی اور ایک سیکولر شخص ایک ساتھ بیٹھ نہیں سکتے۔ جب دلوں میں نفرتیں اور کدورتیں گھر کر لیں تو یوں ہی ہوتا ہے۔ زمانے کے انداز دیکھتے ہوئے ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا ہم اس طرح کی نفرتوں اور کدورتوں کے متحمل ہو سکتے ہیں ؟

23 مارچ کو ایک پروگرام میں ایک دانش ور نے کہا، قراردادِ پاکستان دراصل قرار دادِ لاہور کے نام سے جانی جاتی ہے۔ قرار دادِ پاکستان میں کسی

اسلامی ریاست کا ذکر نہیں ہے۔" مانا کہ مولوی مذہب کے معاملے میں جذباتی ہوتا ہے۔ مولوی حضرات، شاعرِ مشرق، علامہ محمد اقبال کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اپنی تقریروں میں ان کے اشعار لہک لہک کر پڑھتے ہیں۔ مگر اقبال مولویوں کو اتنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا شعر ہے:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا

کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

ملا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور" کہنے والے بھی اقبال تھے۔ مولوی جذباتی اور عصر" سے نا اہنگ ٹھہرا۔ مگر ان دانش وروں کو کیا ہوا، جو آئے روز نظریاتی بحث چھیڑ کر قوم کو مزید الجھن میں ڈالتے ہیں۔ ایسی بحثوں کے لیے قومی دن چنے جاتے ہیں۔ قومی دن قوموں کو جوڑنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ایسے دنوں میں توڑنے کی بجائے جوڑنے کی بات کی جائے تو اچھا ہے۔

کئی مسائل بکھرے پڑے ہیں۔ سندھ میں کچی شراب پینے سے تین درجن سے زائد لوگوں کی ہلاکتیں ہوئیں۔ تھر سے روزانہ ہلاکتوں کی اطلاعات آتی ہیں۔ پاکستان کا معیارِ تعلیم اچھا نہیں ہے۔ مہنگائی نے عوام کا جینا دو بھر کر رکھا ہے۔ گھریلو جھگڑوں میں ہلاکتوں کی خبریں پریشان کر رہی ہیں۔ یہ اور اس جیسے کئی موضوعات ہیں، جن پر کئی پروگرام کیے جا سکتے ہیں۔ یہ ہمارے بنیادی موضوعات ہیں۔ ایسے موضوعات کی موجودگی میں مذہب اور سیکولر

ازم کا موضوع چھیڑنا عجیب محسوس ہوتا ہے۔ہمارے دانش وروں اور مذہبی طبقے کو ان موضوعات پر لکھنا اور بولنا چاہیے۔ یقین کیجیے اس سے زیادہ عوامی پزیرائی ملے گا۔

یہ تو حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان میں اسلامیت کا جذبہ کار فرما تھا۔ قیامِ پاکستان سے قبل برصغیر کے مسلمان ایک ایسے خطۂ پر امن کے متلاشی تھے، جہاں وہ پرسکون انداز میں اپنے مذہب پر عمل پیرا ہو سکیں۔ سیکولر حضرات بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح کی 11 اگست 1947ء والی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہیں۔اس کے برعکس مذہبی لوگ کئی ایسی تقریروں کے حوالے دیتے ہیں، جن میں انھوں نے اسلام کی بات کی ہے۔ ہمارے قومی شاعر، عظیم فلسفی اور شاعرِ مشرق کا ایک شعر بڑا مشہور ہے:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ٹھنڈے دماغ سے سوچا جائے تو اس معاملے میں مذہبی لوگوں کی دلیل سیکولر حضرات سے زیادہ قوی نظر آتی ہے۔اس کے باوجود بھی میں سمجھتا ہوں کہ دونوں قسموں کے ان لوگوں کو نظریاتی بحث میں نہیں الجھنا چاہیے۔کچھ موضوعات حساس ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک حساس موضوع ہے۔ایک دوسرے کے جذبات کے احترام کی فضا پیدا کرنی چاہیے۔

ملک کے سیکولر دانش وروں کی دیکھا دیکھی میں ہمارا حکم ران طبقہ بھی لبرل ازم اور سیکولرازم کی بات کر رہا ہے۔ یعنی وہ بھی قوم کو تقسیم در تقسیم کے عمل میں شامل ہو چکا ہے۔ ہمارے وزیرِ اعظم نے پاکستان کو لبرل ملک بنانے کی بات کی تو اس پر کافی لے دے ہوئی۔ پنجاب حکومت نے تحفظِ نسواں بل منظور کیا تو ملک کی 25 مذہبی جماعتیں متحد ہو گئیں۔ ان کے خیال میں یہ بل لبرل ایجنڈے کو فروغ دینے کے لیے منظور کیا گیا ہے۔ سندھ حکومت نے 24 مارچ کو ہندوؤں کے مذہبی تہوار ہولی پر عام تعطیل کا اعلان کر دیا۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول بھٹو زرداری نے 24 مارچ کو سندھ کے علاقے عمر کوٹ میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مذہب کی جبری تبدیلی کے خلاف قانون سازی کریں گے۔ بھارت میں اقلیتی برادری والا شخص صدر ہو سکتا ہے تو پاکستان میں کیوں نہیں بن سکتا۔ بلاول کے نانا اور پاکستانی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کرنے والے جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جو آئین ملک و قوم کو دیا تھا، اس میں بلاول بھٹو زرداری کی اس خواہش کی کوئی گنجائش نہیں کہ پاکستان کا صدر غیر مسلم ہو۔

کچھ موضوعات پر جبراً لکھنا پڑتا ہے۔ یعنی نہ چاہتے ہوئے بھی لکھنا پڑتا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ آج میں نے جس موضوع پر لکھا، وہ ایسا ہی ایک موضوع

ہے۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی عوامی موضوع پر لکھوں۔ لیکن جب سیکولر ازم اور مذہب کی بحث دیکھتا ہوں تو خود بہ خود اس موضوع پر لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ میرے خیال میں ان موضوعات پر تبصرہ آرائی سے قبل دیگر اہم اور بنیادی موضوعات پر لکھنا اور بولنا چاہیے۔ اگر اس طرح کی بحث ہو بھی تو جذبات سے ہٹ کر اپنا نقطہِ نظر دینا چاہیے ۔تاکہ نفرتیں پروان نہ چڑھیں۔

## لیاری والے

یہ کوئی چودہ پندرہ سال کا بچہ ہوگا۔ جو چند معزز مہمانوں کے سامنے انگریزی میں تقریر کر رہا تھا۔ بچہ فر فر بول رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے انگریزی اس کی مادری زبان ہے۔ وہ علم کی اہمیت کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا۔ اس کی تقریر ختم ہوئی تو اس کے استاد نے دوبارہ تقریر کرنے کا حکم دیا۔ کیوں کہ اس کے استاد نے اس کی تقریر نہیں سنی تھی۔ بچے نے دوبارہ تقریر کی۔ لیکن تغیر و تبدل کے ساتھ۔ جس سے واضح ہو گیا کہ بچہ کچھ حد تک فی البدیہہ تقریر کر رہا تھا۔ اس نے کسی انگریزی کتاب یا کسی ویب سائٹ سے سو فی صد تقریر نہیں رٹی تھی۔ بلکہ بہت ساری باتیں اس کی اپنی تھیں۔ بچے نے تقریر میں ولیم شیکسپئیر اور نیلسن منڈیلا کے اقوال بھی حاضرین کا بتائے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بچے کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بچہ لیاری کے ایک غیر معروف پرائیویٹ اسکول میں جماعتِ ہفتم کا طالبِ علم ہے۔

میں اپنی تحریروں میں لیاری کے بارے میں لکھتا رہتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ لیاری کے لوگ اپنی مدد آپ کے تحت آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیاری کے لوگوں میں قابلیت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہاں کے لوگوں میں کھیل سے لے کر

تعلیم تک کے ہر شعبے میں قابلیتیں اور صلاحیتیں بدرجہِ اتم موجود ہیں۔ مگر ان کو ابھارنے والا اور ان صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے اور ان کے قدر دان بہت کم ملتے ہیں۔ عام طور پر اب بھی یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ لیاری کے لوگ ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ لیاری میں بے نظیر بھٹو شہید یونی ورسٹی کے قیام نے تعلیم پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ کئی کالج اس یونی ورسٹی سے ملحق ہیں۔ بے نظیر بھٹو شہید یونی ورسٹی کے قیام کی وجہ سے لیاری کے نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اب انھیں اعلیٰ تعلیم لیاری میں ہی مل جاتی ہے۔اس کے باوجود بھی لیاری کے لوگوں کو جاہل اور ان پڑھ سمجھا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ جو لوگ لیاری کو پسند نہیں کرتے، انھیں چاہیے کہ وہ ایک بار یہاں ضرور آئیں۔ تاکہ انھیں معلوم ہو کہ یہ علاقہ اور یہاں کے مکین کیسے لوگ ہیں۔ یہ علاقہ کھیلوں کے حوالے سے بھی کافی ذرخیز رہا ہے۔ یہ علاقہ اب بھی ماضی کے عظیم فٹ بالروں کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ قومی سطح کے بہت سے مشہور فٹ بالر لیاری میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ باکسنگ کا کھیل بھی یہاں عام ہے۔ معروف باکسر حسین شاہ کا تعلق لیاری سے ہے ۔ تعلیمی میدان میں پروفیسر علی محمد شاہین کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا تعلق بھی لیاری سے تھا۔ اردو کے مشہور شاعر ن۔م۔دانش، جو ان دنوں امریکا میں ہیں، کا تعلق بھی لیاری سے ہے۔ پروفیسر صبا دشتیاری بھی لیاری کے تھے۔ ان کے

علاوہ اور بھی ایسے کئی لوگ ہیں، جو لیاری کی شان ہیں۔ جب بھی لیاری کی تاریخ لکھی جائے گی، ان کا نام سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

تقریباً ایک مہینا قبل لاہور کی فاسٹ یونی ورسٹی میں گرافکس ڈرائنگ کا ایک مقابلہ منعقد ہوا تھا۔ اس مقابلے میں پورے پاکستان سے طلباء نے شرکت کی تھی۔ یعنی یہ ایک قومی مقابلہ تھا۔ اتنے سخت مقابلے میں بے نظیر بھٹو شہید یونی ورسٹی کے دو طلبہ عبدالواحد بلوچ اور مبشر بازی لے گئے۔ ان دونوں طلبہ کا تعلق لیاری سے ہے۔ انھوں نے لیاری میں ہی تعلیم حاصل کی۔ اب بھی وہ لیاری میں ہی اعلیٰ تعلم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ مقابلہ جیت کر انھوں نے ثابت کر دیا کہ لیاری والے بھی کسی سے کم نہیں۔ لیاری والوں میں بھی ٹیلنٹ موجود ہے۔ مگر کوئی ان قابلیتوں اور صلاحیتوں کو ابھارنے والا تو ہو۔ عبدالواحد بلوچ نے مجھے بتایا کہ کہ 2014ء میں محمد علی جناح یونی ورسٹی میں ویب ڈویلپمنٹ کا مقابلہ منعقد ہوا تھا۔ اس مقابلے میں بھی انھوں نے اور ان کے دوست فرحان نے فتح کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ حکامِ بالا لیاری پر توجہ دیں۔ تاکہ یہاں کے لوگوں کی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے پورا پاکستان مستفید ہو سکے۔

## نقل بھی ایک آرٹ ہے

جب سے ہمارے ہونہار طلبہ وطالبات کے امتحانات شروع ہوئے ہیں، اخبارات نے "پکڑے گئے" جیسے لاحقے والی خبریں شائع کرنا شروع کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر، "اردو کے پرچے میں 24 طلبہ نقل کرتے ہوئے پکڑے گئے"، "حیاتیات کے پرچے میں 10 طلبہ نقل کرتے ہوئے پکڑے گئے" وغیرہ۔ سچ پوچھیں تو ہمیں ایسی خبریں بالکل اچھی نہیں لگتیں اور اچھی لگنی بھی نہیں چاہئیں۔ کیوں کہ ان خبروں سے ہمارے ذہین، ہوش یار، لائق اور ہونہار طلبہ وطالبات کی شرمندگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں، مگر مستقبل کے معماروں کی ایسی بے عزتی ہر گز۔۔۔ ہر گز برداشت نہیں کر سکتے۔

جس طرح ڈگری، ڈگری ہوتی ہے، چاہے وہ اصلی ہو یا نقلی، بالکل اسی طرح امتحانات امتحانات ہوتے ہیں۔ پرچے، پرچے ہوتے ہیں، چاہے ان کو نقل کرکے پاس کیا، جائے یا بغیر نقل کیے۔ ہمیں نقل کرنے والے اور نقل نہ کرنے والے۔۔۔ دونوں قسم کے طلبہ وطالبات کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ کیوں کہ جتنے نقل نہ کرنے والے بچے مستقبل کے معمار ہیں، اتنے ہی نقل کرنے والے ہمارے مستقبل کے معمار ہیں۔ ہمیں دونوں قسم کے بچوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں کسی بھی

قسم کے بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ویسے بھی بخیل آدمی کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ جو بچے بغیر نقل کیے امتحانات دیتے ہیں، وہ ہمارے لیے قابلِ فخر ہیں اور جو نقل کرکے امتحانات پاس کرتے ہیں، وہ بھی ہمارے لیے قابلِ فخر ہیں۔ بلکہ وہ زیادہ قابلِ فخر ہیں، جو "بے چارے" نقل کے ذریعے امتحانات پاس کرتے ہیں۔

اگر آپ نقل کے سخت نقاد ہیں تو ضرور باضرور آپ کو کسی ایسے امتحان گاہ کی ضرورت ہے، جہاں نقل کے بغیر ہمارے مستقبل کے معماروں کے لیے ایک لفظ لکھنا بھی جوئے شیر لانے کے مساوی ہوتا ہے۔ یقینا ایسے امتحان گاہ کی سیر کے بعد آپ نقل کے سب سے بڑے حامی بن جائیں گے۔ حامی کیا ۔۔۔ بلکہ نقل کے "مبلغ" بن جائیں گے اور مستقبل کے معماروں کو اس "کارِ خیر" میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی بھرپور تاکید کریں گے۔ کیوں کہ ایسے امتحانی مرکز کا منظر ہی عجیب ہوتا ہے۔ بچے ہمہ تن مصروفِ کار نظر آتے ہیں۔ کبھی یہاں جھانکتے ہیں تو کبھی وہاں۔ کبھی یہاں سے کوئی "پرّا" لیا تو کبھی وہاں سے۔ کبھی واٹس اپ کے ذریعے اپنے پرانے دوستوں اور "ہم عمر" اساتذہ کرام سے مدد لی تو کبھی اسکول کے "ہم درد" پرنسپل کو فون کرکے نگران کی سخت گیری کی شکایت کردی۔ کبھی کبھار اسمارٹ موبائل کے ذریعے آگے بیٹھے ہوئے "مستقبل کے معمار" کی کاپی کی تصویر کھینچ کر وہی سب کچھ اپنی کاپی میں لکھنا شروع کردیا۔

طلبہ کی اس "مصروفیت" سے بڑے بڑے لوگوں کا دل پسیج جاتا ہے۔ نقل کے بڑے بڑے نقاد، اس کے حامی بن جاتے ہیں۔

نقل کرنا بھی ایک آرٹ ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آرٹ اظہار چاہتا ہے۔آرٹ بڑا حساس ہوتا ہے۔ اگر اس کو اظہار کا موقع نہ ملے تو یہ فورا مر جاتا ہے۔اگر آپ نقل کو آرٹ نہیں سمجھتے تو آپ کو "نقال طلبہ" کے امتحان گاہ کی سیر کا مشورہ ہی دیا جا سکتا ہے۔جب آپ وہاں کی ہوا کھائیں گے اور ہونہار بچوں کو نقل کا آرٹ استعمال کرتے ہوئے دیکھیں گے تو خود بہ خود ہمارے خیال سے متفق ہو جائیں گے۔ جو لوگ تعلیمی سرگرمیوں میں نقل کے مخالف ہیں، دراصل وہ ایک ایسے آرٹ کی موت چاہتے ہیں، جو ہمارے ہونہار، ذہین اور لائق طلبہ وطالبات کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے ۔ قارئین انصاف سے کام لیں ۔کیا ایسے آرٹ کی موت واقع ہونی چاہیے ؟ بے شک اس سوال کے جواب میں آپ "نہیں"۔۔ بلکہ "ہرگز نہیں" کہیں گے۔ ہمارے خیال میں اپنے ہونہار بچوں کی نقل کی طرف بڑھتی ہوئی والہانہ رغبت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس آرٹ کی خوب تشہیر ہونی چاہیے۔ ہونہاروں اور مستقبل کے معماروں کو اس آرٹ کے اظہار کو بھرپور موقع دینا چاہیے ۔تاکہ ان کا آرٹ نہ مرے۔

# قرآن و حدیث کی روشنی میں رمضان المبارک کی فضیلت

رمضان المبارک کے مقدس مہینے کی آمد آمد ہے۔ اس ماہِ مقدس میں مسلمانانِ عالم اسلام کا ایک اہم رکن بڑے ذوق و شوق سے ادا کرتے ہیں۔ روزہ اسلام کے پانچ اہم، ارکان میں سے ایک ہے۔ اسلام کی عمارت جن پانچ ستونوں پر استوار ہے، روزہ ان میں سے ایک انتہائی اہم ستون ہے۔ صحیحین کی مشہورِ زمانہ حدیث ہے:

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اس امر کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ نماز پڑھنا۔ زکوٰۃ دینا۔ حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔"۔(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر 3، راوی: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ)

رمضان المبارک اور فرض روزے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ان سے متعلق اللہ تعالٰی کی آخری کتاب، قرآنِ حکیم کی کیا تعلیمات ہیں؟ نیز احادیثِ مبارکہ میں ان کی کیا فضیلتیں آئی ہیں؟ آج کی تحریر میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

روزہ ایک ایسی عبادت ہے، جو امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے

:علاوہ دیگر امتوں پر بھی فرض تھی۔ چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا۔ جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر"
(فرض کیا گیا تھا۔ تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔" (سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 183

سورۃ البقرۃ کی آیات 183 سے 187 روزے سے متعلق ہیں۔ رمضان المبارک وہ
:مقدس مہینا ہے، جس کا نام قرآنِ حکیم میں آیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

ماہِ رمضان وہ ہے، جس میں قرآن اتارا گیا۔ جو لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور"
جس میں ہدایت کی اور حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں۔ تم میں سے جو شخص اس
مہینے کو پائے، اسے روزہ رکھنا چاہیے۔ ہاں! جو بیمار ہو یا مسافر ہو، اسے دوسرے
دنوں میں یہ گنتی پوری کرنی چاہیے۔ اللہ کا ارادہ تمھارے ساتھ آسانی کا ہے، سختی کا
نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کر لو اور اللہ کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائیاں
(بیان کرو اور اس کا شکر کرو۔" (سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 185

ماہِ رمضان میں ایک رات 'شبِ قدر' ہوتی ہے۔ یہ بڑی فضیلت والی رات ہے۔
رمضان المبارک کی آخری دس دنوں کی طاق راتوں میں سے ایک رات شبِ قدر ہوتی
ہے۔ اس مبارک رات کا ذکر قرآنِ حکیم میں دو مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ

الدخان میں اور سورۃ القدر میں ۔ اس عظیم رات کی عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کی ایک سورۃ کا نام سورۃ القدر ہے۔ سورۃ الدخان میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

حٰمٓ ! قسم ہے اس وضاحت والی کتاب کی ۔ یقینا ہم نے اسے بابرکت رات میں اتارا" ہے۔ بے شک ہم ڈرانے والے ہیں ۔ اُسی رات میں ہر ایک مضبوط کام کا فیصلہ کیا جاتا (ہے۔ " (سورۃ الدخان ، آیات 1 تا 4

: سورۃ القدر میں اس عظیم و بابرکت رات سے متعلق ارشادِ خداوندی ہے

یقیناََ ہم نے اسے (یعنی قرآنِ مجید کو) شبِ قدر میں نازل فرمایا۔ تو کیا سمجھا کہ " شبِ قدر کیا ہے ؟ شبِ قدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس (میں ہر کام ) کے سر انجام دینے کو اپنے رب کے حکم سے فرشتے اور روح (جبرائیل علیہ السلام ) اترتے ہیں ۔ یہ رات سراسر سلامتی کی ہوتی ہے۔ اور فجر کے طلوع ہونے تک ( ہوتی (ہے) " (سورۃ االقدر کا مکمل ترجمہ

شبِ قدر کو ایک ہزار مہینوں سے بہتر کہا گیا۔ یعنی اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ تفسیر احسن البیان میں لکھا ہے :

ہزار مہینے 83 سال 4 مہینے بنتے ہیں ۔ یہ امتِ محمدیہ پر اللہ کا کتنا احسانِ عظیم ہے کہ " مختصر عمر میں زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کے لیے کیسی سہولت عطا فرمادی۔ "

:اب آتے ہیں احادیث کی جانب۔ صحیحین کی حدیث ہے

جب ماہِ رمضان شروع ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور ایک" روایت میں ہے کہ جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کیے جاتے ہیں اور شیطانوں کو قید کیا جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔" .(مشکوۃ المصابیح، حدیث نمبر 1860، راوی: حضرت (ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

:ایک اور حدیث ملحوظ ہو۔ یہ بھی صحیحین کی حدیث ہے

جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام باب الرّیان ہے۔اس" دروازے میں سے جنت کے اندر صرف روزے رکھنے والے داخل ہوں گے۔ (مشکوۃ (المصابیح، حدیث نمبر 1861، راوی: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ

:صحیحین کی ایک اور حدیث ہے

اللہ تعالی نے فرمایا کہ روزہ صرف میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ " روزہ دار) اپنی خواہشات کو اور اپنے کھانے کو صرف میری خوشی کے لیے چھوڑتا ہے) اور روزہ دار کو دو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خوشی روزہ کھولتے وقت اور دوسری خوشی اپنے پروردگار سے ملاقات کے وقت۔ روزہ دار کے منھ کی بو خدا کے نزدیک مشک سے زیادہ خوش بو دار ہوتی ہے اور روزہ ڈھال ہے۔جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ نہ فحش باتیں کرے، نہ بے ہودگی سے

چلّائے۔ اگر کوئی اسے برا کہے یا اس سے لڑنے کا ارادہ کرے تو وہ اس سے کہہ دے کہ بھئی میں روزہ دار ہوں۔" (مشکوۃ المصابیح، حدیث نمبر 1863، راوی: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ)

رمضان المبارک اور روزے کے فضائل سے متعلق اور بھی بہت سی احادیث ہیں۔ مگر طوالت کا خوف ہے۔ سو اسی پر اکتفا ہے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رمضان المبارک میں ہمیں زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

## !!! بِاَیِّ ذَنبٍ قُتِلَت

وطنِ عزیز میں پے در پے ایسے واقعات پیش آ رہے ہیں، جن کا ہماری تہذیب و تمدن سے نہ کوئی واسطہ ہے، نہ ہمارے دین سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ لگتا ہے، عورت کی مظلومیت کا سلسلہ زمانہِ جاہلیت کی طرح آج بھی جاری و ساری ہے۔ یہ سلسلہ ابھی تک نہیں ٹوٹا۔ نہ جانے یہ کب ٹوٹے گا۔ پے در پے وطنِ عزیز میں تین ایسے واقعات پیش آ چکے ہیں، جن کے تصور سے بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔ یعنی لڑکیوں کو زندہ جلا دینے کے واقعات۔ ہم نے سنا ہے، ماؤں کے سینوں میں اولاد کی محبت سے لبریز دل دھڑکتے ہیں۔ مگر یہ کیا ہو رہا ہے کہ ایک ماں اپنی سترہ سالہ بیٹی کو زندہ جلا دیتی ہے۔ سنا ہے، باپ سارا دن محنت ہی اس لیے کرتا ہے، تاکہ اس کی اولاد پروان چڑھے، ان کی اچھی تربیت ہوسکے اور ان کی تعلیم کا بندوبست ہوسکے۔ مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ ایک والد اپنی سگی بیٹی کو قتل کرکے خود کو پولیس کے حوالے کر رہا ہے۔ یہ سنگ دلی غیرت کے نام پر بپا ہے۔ مگر اس غیرت کا مظاہرہ کرنے سے پہلے سو بار سوچنا چاہیے کہ ہم جس دینِ متین کے پیروکار ہیں، کیا وہ دین اس کی اجازت دیتا ہے۔ ممکن ہے، ایک عام شخص کو عورت کے ضمن میں اسلامی تعلیمات کے بارے میں مکمل معلومات نہ ہوں۔ لیکن اس کو یہ تو معلوم ہوگا کہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ

اللعالمین تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت ہر خاص و عام پر تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب کے چند قبائل میں بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسمِ قبیح اپنی پوری آن بان کے ساتھ جاری وہ ساری تھی۔ رحمۃ اللعالمین پیغمبر آئے تو آپ نے دوسرے طبقوں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کو بھی اپنے سایہ رحمت میں لے لیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسم قبیح کا خاتمہ فرمایا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں عورت کی عظمت کا اجمالا احاطہ کیا جائے۔ کیوں کہ اس چھوٹی سی تحریر میں تفصیل سے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عورت کی عظمت کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔جب ہم قرآن و سنت کی روشنی میں عورت کی عظمت پر نظر ڈالیں گے تو ہم پر یہ راز افشا ہو جائے گا کہ بے شک آج کل کے اس پر فتن اور ہوس زدہ دور میں اسلام ہی صرف وہ پناہ گاہِ امن ہے، جہاں عورت کو حقیقی امن و سکون میسر آ سکتا ہے۔

اسلام جہاں 'مومنین' کا ذکر کرتا ہے، وہاں 'مومنات' کا بھی ذکر کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی تعلیمات بتاتی ہیں کہ آخرت میں جتنا اجر ایک مومن کو ملے گا، اتنا ہی اجر ایک مومنہ کو ملے گا۔سورۃ المومن کی آیت نمبر 40 میں ارشاد

: باری تعالیٰ ہے

"جس نے گناہ کیا، اسے تو برابر کا بدلہ ہی ہے اور جس نے نیکی کی ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان دار ہو تو یہ لوگ جنت میں جائیں گے اور وہاں بے شمار روزی پائیں گے۔"

: سورۃ النساء کی آیت نمبر 124 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے

"جو ایمان والا مرد ہو یا عورت اور وہ نیک اعمال کرے، یقیناً ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور کھجور کی گٹھلی کے شگاف برابر بھی ان کا حق نہ مارا جائے گا۔

: سورۃ النحل کی آیت نمبر 97 میں اس سے ملتا جلتا مضمون کچھ یوں ہے

"جو شخص نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت لیکن باایمان ہو تو ہم اسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطا فرمائیں گے اور ان کے نیک اعمال کا بہتر بدلہ بھی انھیں ضرور دیں گے۔
"

قرآنِ حکیم میں مسلمان مرد اور عورت کے اجر کی برابری کی متعدد آیات آئی ہیں۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جہاں مومن مرد کا ذکر آرہا ہے، وہاں مومن عورت کا ذکر بھی آرہا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مرد کے ساتھ ساتھ عورت کی بھی اہمیت ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت نمبر 71 ، سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر 195 اور سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر 35 میں بھی مومن مرد

اور مومن عورت کے نام لے کر اجر کی برابری کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

زوجین کا رشتہ ایک اہم رشتہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام زوجین کے درمیان اچھے تعلقات کا خواہاں ہے۔ کتنے پیارے انداز میں سورۃ النساء کی آیت نمبر 19 میں اس رشتے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے:

ان (عورتوں) کے ساتھ اچھے طریقے سے بود و باش رکھو، گو تم انھیں ناپسند کرو۔" "لیکن بہت ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا جانو اور اللہ اس میں بہت ہی بھلائی کر دے۔

اسلام عورت کو وراثت میں حصہ دیتا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت نمبر 7 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ماں باپ اور قریب رشتے دار جو مال چھوڑ جائیں، اس سے مردوں کے لیے حصہ ہے" اسی طرح) عورتوں کے لیے بھی اس مال سے حصہ ہے، جو ماں باپ اور قریبی رشتہ) دار چھوڑ جائیں۔ خواہ مال کم ہو یا زیادہ (اس میں ہر ایک کا) حصہ اللہ کی طرف سے "مقرر کیا ہوا ہے۔

پاک دامن عورتوں پر جھوٹی تہمتیں باندھنا، اسلام میں قابلِ تعزیر جرم

: سمجھا جاتا ہے۔ سورۃ النور کی آیت نمبر 4 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے
جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی لگائیں، پھر چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو انھیں اسی "
" کوڑے لگاؤاور کبھی بھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ اور یہ لوگ فاسق ہے۔ (80)
سبحان اللہ ! کتنی بڑی بات ہے کہ پاک دامن عورتوں پر تہمتیں لگانے والے کو تین
سزائیں دی گئیں۔ یہ تینوں سزائیں بہت سخت ہیں۔ خصوصاً دوسری سزا۔
سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام عورت کو زندہ رہنے کا ایسا حق دیتا ہے، جو شاید کوئی نہیں
دیتا۔ سورۃ التکویر کی آیت نمبر 8 اور 9 میں بڑے جذباتی انداز میں عرب کے
: باشندوں کو زندہ دفن کرنے کی رسم قبیح سے منع کیا گیا
اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا کہ کس گناہ کی وجہ سے وہ قتل کی "
" گئی؟

میرے ملک کے باشندوں نے جن بیٹیوں کے جلایا، اگر قیامت کے دن انھوں نے یہ
پوچھ لیا کہ کیا واقعی ہی ہمارا جرم اتنا بڑا تھا کہ ہمیں آپ نے جلادیا؟ ہم تو آپ کا اپنا
خون تھے۔ آپ نے جس غیرت کا مظاہرہ کیا، کیا آپ کا دین اس کی اجازت دیتا تھا، تو
ان لوگوں کا کیا ہوگا، جنھوں نے یہ جرائم کرکے سب کو خون کے آنسو رلا دیا؟؟

: اب چند حدیثیں ملحوظ ہوں

:ابو داؤد کی حدیث ہے

جس شخص کے لڑکی ہو، وہ نہ تو اسے زندہ در گور کرے اور نہ اس کے ساتھ حقارت" آمیز سلوک کرے اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ تعالٰی اسے جنت میں داخل (فرمائے گا۔" (اسلام میں عورت کے حقوق، سید جلال الدین عمری، صفحہ 25

: صحیحین کی حدیث ہے

اللہ تعالٰی جس شخص کو ان لڑکیوں کے ذریعہ کچھ بھی آزمائش میں ڈالے اور وہ ان کے" ساتھ اچھا سلوک کرے تو وہ اس کے لیے جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ ہوں گی۔" (اسلام میں (عورت کے حقوق، سید جلال الدین عمری، صفحہ 26

: صحیح مسلم کی حدیث ہے

جو شخص دو بچیوں کی ان کی جوانی کا پہونچنے تک پرورش کرے گا، قیامت کے روز میں" اور وہ اس طرح ہوں گے۔یہ کہہ کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انگشتہائے مبارک (کو ملادیا۔" (اسلام میں عورت کے حقوق، سید جلال الدین عمری، صفحہ 27

:ابو داؤد کی ایک اور حدیث کچھ یوں ہے

"جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی۔ ان کو تعلیم و تربیت دی۔ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ (بعد میں بھی) حسنِ سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔" (اسلام میں عورت کے حقوق، سید جلال الدین عمری، صفحہ 28)

ہمارے معاشرے کی لڑکی ایک گھٹن زدہ ماحول میں رہتی ہے۔ اسلام ایسی گھٹن کا قائل نہیں ہے۔ عورت کے نکاح سے پہلے اس کی رائے معلوم کرنا ضروری ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایسا کرنے سے غیرت کا مسئلہ آڑے آتا ہےاور غیرت بھی ایسی، جو بچی کو جلادیتی ہے۔ صحیحین کی حدیث ہے:

"بیوہ یا مطلقہ کا نکاح نہ کیا جائے گا، جب تک کہ اس کی رائے نہ معلوم کر لی جائے۔ دو شیزہ کا نکاح نہیں ہوگا، جب تک کہ اس سے اجازت نہ لی جائے۔" (اسلام میں عورت کے حقوق، سید جلال الدین عمری، صفحہ 30)

:ابنِ ماجہ کی حدیث ہے

"کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ افضل صدقہ کیا ہے۔ تمہاری لڑکی جو (بیوگی یا طلاق کی وجہ سے) تمہاری طرف لوٹادی جائے۔ تمہارے سوا کوئی اس کا کمانے والا نہ ہو۔" (خاتونِ اسلام، مولانا وحید الدین خاں، صفحہ 148)

عورت کی عظمت سے متعلق اور بھی کئی قرآنی آیات واحادیث ہیں۔ لیکن وقت کی قلت ہے۔ سو اسی پر اکتفا ہے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی بیٹیوں سے اچھا سلوک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) چ

# اسلام کا ضابطہِ اخلاق

ہماری اخلاقیات کہاں گم ہوگئیں ؟اس کا جواب فی الوقت نہیں مل رہا۔ اگر کوئی عام شخص اخلاق سے گری ہوئی بات کرے توزیادہ افسوس نہیں ہوتا کہ وہ ہے ہی عام شخص ۔ مگر جب خواص بھی بداخلاقی کا مظاہر کرنے لگیں تو بہت افسوس ہوتا ہے ۔ جو کچھ حافظ حمد اللہ اور ماروی سرمد کے درمیان ہوا ہے، وہ پہلی بار نہیں ہوا ہے ۔ یو ٹیوب ایسی وڈیو کلپس سے بھری پڑی ہے، جو ہمارے خواص کے اخلاقی دیوالیہ پن کے جیتے جاگتے ثبوت ہیں ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ میڈیا وہ ضابطہ اخلاق اپنائے ۔ جس کا درس اللہ تعالٰی اور اس کے پیارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دیتے ہیں ۔ہمارا دین اخلاق سب سے بڑا داعی ہے ۔ آج کی تحریر میں ہم کسی حدتک اسلامی ضابطہِ اخلاق کا جائزہ لیتے ہیں :

سورۃ النحل کی آیت نمبر 125 میں ارشادِ باری تعالٰی ہے :

"اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو اللہ کی وحی اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلایئے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجیے ۔"

اللہ تعالٰی نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو انھیں، فرعون سے نرمی سے گفتگو کرنے کی تلقین فرمائی ۔ سورۃ طٰہٰ کی

:آیت نمبر 44 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے

"تم دونوں اس سے نرمی سے بات کرنا، شاید وہ نصیحت پکڑے یا ڈر جائے۔"

معلوم ہوا کہ اسلام نرمی سے گفتگو کرنے کا قائل ہے۔ اسلام سختی کا قائل نہیں ہے۔ داعی نرم مزاج ہوگا تو اثر زیادہ ہوگا۔ داعی سخت ہوگا تو اثر کم ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ بالکل اثر نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نرم خو تھے۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر

: میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے 159

"اللہ کی رحمت سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان پر نرم دل ہیں۔ اور اگر آپ سخت زبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔ سو آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لیے استغفار کریں۔"

اسلام کہتا ہے کہ اگر آپ کی دانست میں کوئی شخص آپ سے جاہلانہ گفتگو کر رہا ہے تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس پر سلامتی بھیجتے ہوئے آگے.بڑھ جایئے۔ سورۃِ فرقان کی

: آیت نمبر 63 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے

"رحمٰن کے سچے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے باتیں کرنے لگتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ سلام ہے۔"

: سورۃ الحجرٰت کی آیت نمبر 11 میں کس طرح اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے، ملحوظ ہو

"اے ایمان والو! کوئی قوم دوسری قوم سے مسخرہ پن نہ کرے۔ ممکن ہے کہ یہ اس سے بہتر ہو اور نہ عورتیں عورتوں سے، ممکن ہے کہ یہ ان سے بہتر ہوں۔ اور

آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور نہ کسی کو برے لقب دو۔ ایمان کے بعد فسق
".برا نام ہے اور جو توبہ نہ کریں وہی ظالم لوگ ہیں۔

:اب اخلاق سے متعلق چند حدیثیں ملحوظ ہوں

: صحیح بخاری کی حدیث ہے

مسلمان وہ ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔" (رحمۃ اللعالمین صلی "
(اللہ علیہ وسلم، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ

: صحیح بخاری کی ایک اور حدیث ہے

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں بن جاتا، جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی "
کچھ پسند نہ کرے، جو کچھ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے۔" (رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ
(وسلم، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ

: صحیح بخاری کی ایک اور حدیث کچھ یوں ہے

راست بازی اختیار کرو۔ باہمی محبت کو بڑھاؤ۔ لوگوں کو اللہ کی طرف سے بشارت "
پہنچاؤ۔" (رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمۃ
(اللہ علیہ

: صحیح بخاری کی ایک اور حدیث ملحوظ ہو

"خبردار! بدگمانی کو اپنی عادت نہ بناؤ۔ بدگمانی تو جھوٹ ہی جھوٹ ہوتا

ہے۔ بے بنیاد باتوں پر کان نہ لگاؤ، اوروں کے عیب تلاش نہ کرو۔ آپس میں بغض نہ رکھو، کسی کی روگردانی نہ کرو، اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بن کر رہو۔" (رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ)

:صحیح بخاری کی ایک اور حدیث ہے

"جو کوئی شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے، اسے لازم ہے کہ بات کہے تو اچھی بات کہے ورنہ خاموش ہی رہے۔" (رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ)

:صحیحین کی ایک حدیث ہے

"شہ زور وہ نہیں جو دوسروں کو پچھاڑ دیتا ہے، شہ زور تو وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو تھام لیتا ہے۔" (رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اسلام کی تعلیمات کی اشاعت کے لیے مامور فرمایا :۔روانگی کے وقت انھیں ارشاد فرمایا

"لوگوں کے لیے آسانی پسند کرنا، انھیں سختی میں نہ ڈالنا۔ خوشخبری اور بشارت انھیں سنانا، دین سے نفرت نہ دلانا اور تم آپس میں مل جل کر رہنا۔ (رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری

(رحمۃ اللہ علیہ

: صحیح بخاری کی ایک اور حدیث کچھ یوں ہے

چار خصلتیں جس شخص میں ہوں، وہ منافق ہے۔ اگر ان چار (4) میں سے کوئی ایک "
خصلت اس میں ہے تو نفاق کی ایک علامت اس کے اندر ہے۔ (1)

۔ بولے تو جھوٹ بولے۔ 1

۔ وعدہ کرے تو خلاف کرے۔ 2

۔ عہد کرے تو پورا نہ کرے۔ 3

۔ جھگڑنے لگے تو فحش بکنے لگے۔ " (رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم، قاضی محمد 4
(سلیمان سلمان منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ

قرآن حکیم کی کئی آیات اور احادیثِ مبارکہ کا ایک وسیع مجموعہ اخلاقیات سے بھرا ہوا ہے۔ پھر ہم تو اس نبی کے امتی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے حسنِ اخلاق کے اعلیٰ مقام پر فائز فرمایا تھا۔ اگر ہم ہی اسلامی ضابطۂ اخلاق نہیں اپنائیں گے تو کون اپنائے گا۔ ذرا

!! سوچیے

# سبق آموز واقعات

اچھا انسان وہ ہوتا ہے، جو چھوٹی چھوٹی باتوں سے نصیحت پکڑتا ہے۔وہ قصوں، کہانیوں کو محض تفننِ طبع کے لیے نہیں پڑھتا، بلکہ ان میں پنہاں سبق اور نصیحت پر عمل کرکے اپنی اصلاح کرتا ہے۔ دنیا کی سب سے سچی کتاب اور اللہ تعالیٰ کے آخری صحیفہِ ہدایت میں حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام کا پر عبرت قصہ بیان کرکے کہا گیا : یقیناً ان کے قصوں میں عقل مندوں کے لیے سامانِ عبرت ہے۔" (سورۃ یوسف، "آیت نمبر111)

آج کی تحریر میں چند سبق آموز وقعات بیان کیے جائیں گے۔ یہ واقعات اس لیے لکھے جارہے ہیں، تاکہ سبق یا نصیحت حاصل ہو۔اس لیے کتابوں کا حوالہ نہیں دیا جائے گا۔ کیوں کہ نصیحت کے لیے سند کی اتنی حیثیت نہیں ہوتی۔

۔ حضرت ابراہیم بن ادہم سے کسی شخص نے کہا: " میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ 1 "سے یہ جبہ ہدیے میں قبول فرمائیں۔

انھوں نے جواب دیا، "اگر آپ غنی اور مال دار ہیں تو میں آپ کا ہدیہ قبول کرلیتا "ہوں۔اگر آپ فقیر ہیں تو قبول کرنے سے معذرت کرتا ہوں۔

"اس شخص نے کہا: " میں امیر ہوں۔

"حضرت نے پوچھا: "آپ کے پاس کتنا مال ہے ؟
"اس نے کہا : "دو ہزار
"حضرت نے پوچھا: "اگر آپ کے پاس چار ہزار ہو جائیں تو آپ کو خوشی ہو گی؟
"! اس نے جواب دیا: " جی ہاں ! کیوں نہیں
حضرت نے کہا: معلوم ہوا کہ آپ فقیر ہیں۔ لہٰذا میں آپ سے ہدیہ قبول نہیں کرتا۔
"

۔ابنِ سماک تقریر کر رہے تھے۔ ان کی باندی سن رہی تھی۔جب وہ تقریر سے فارغ 2
"ہو کر گھر آئے تو باندی سے پوچھا: "میری تقریر کیسی رہی؟
باندی نے جواب دیا: " تقریر بہت اچھی تھی۔ مگر ایک ہی بات کو بار بار دہرانا پسند
"نہیں آیا۔
ابنِ سماک نے کہا: "میں ایک ہی بات کو بار بار اس لیے دہرا رہا تھا، تاکہ جو نہیں
" سمجھا، وہ سمجھ جائے۔
باندی نے کہا: "جب تک نہ سمجھنے والوں کو آپ سمجھاتے رہے، اس وقت تک سمجھنے
"والے اکتاتے رہے۔
۔ایک بادشاہ لباس اور غذا میں حلال و حرام کا بہت خیال رکھتے تھے۔ سفر کے دوران 3
لکڑی کے تختوں پر بوئی ہوئی سبزیاں ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ایک

بار انھوں نے ایک شہر پر حملہ کیا۔ جنگ نے طول پکڑا تو "حلال سبزی" ختم ہو گئی۔
انھوں نے علاقے کے ایک عالم اور بزرگ سے دریافت کیا: "مولانا! کسی نہایت
" دیانت دار سبزی فروزش کا پتا بتایئے۔ مجھے اس سے سبزیاں خریدنی ہیں۔
عالم صاحب نے جواب دیا: "افسوس، صد افسوس! ایک طرف آپ دوسروں کے گھر
اجاڑنے میں مصروف ہیں اور دوسری طرف سبزیاں خریدنے میں حرام و حلال کی
"!! پابندی کر رہے ہیں

۔ سکندر اعظم ایک بار اپنے استاد ارسطو کے ساتھ جنگل سے گزر رہے تھے۔ راستے 4
میں ایک بہت بڑا برساتی نالا آگیا۔ نالا بارش کی وجہ سے طغیانی پر آیا ہوا تھا۔ استاد
اور شاگرد کے درمیان بحث ہونے لگی کہ خطرناک نالا پہلے کون عبور کرے۔ آخر کار
سکندر نے پہلے نالا عبور کر لیا۔ نالا عبور کرکے ارسطو نے سکندر سے پوچھا: "کیا تم نے
"آگے چل کر میری بے عزتی نہیں کی؟
سکندر نے ادب سے جواب دیا: "نہیں استاد! میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ ارسطو
رہے گا تو ہزاروں سکندر تیار ہو جائیں گے، لیکن سکندر ایک بھی ارسطو تیار نہیں کر سکتا۔
"

۔ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ قبرستان میں رہتے تھے۔ ایک دن حضرت سری سقطی 5

"رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے پوچھا: "آپ شہر میں قیام کیوں نہیں کرتے؟
انھوں نے جواب دیا: "میں ایسے لوگوں کے پاس رہتا ہوں، جو مجھے تکلیف نہیں
"پہنچاتے اور جب میں ان سے غائب ہوتا ہوں تو غیبت نہیں کرتے۔

6 ۔ ایک زاہد ایک بادشاہ کا مہمان ہوا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو اس نے ضرورت سے بہت کم کھایا۔ اور نماز پڑھنے میں جلدی کی۔ تاکہ لوگ اس کے متعلق حد سے زیادہ حسنِ ظن میں مبتلا ہو جائیں۔ جب گھر لوٹا تو دوبارہ کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ زاہد کے ذہین لڑکے نے اپنے والد سے پوچھا: "آپ نے بادشاہ کے ہاں پیٹ بھر کر کھانا نہیں
"کھایا؟
انھوں نے جواب دیا: "میں نے ان کے سامنے کچھ نہیں کھایا، تاکہ میرا یہ عمل کام
"آئے۔ لوگوں کی نظر میں میری بزرگی میں اضافہ ہو جائے۔
بیٹے نے کہا: "پھر آپ نماز بھی دوبارہ پڑھیے۔ کیوں کہ آپ نے ان لوگوں کے سامنے
"ریاکاری والی نماز پڑھ کے گویا نماز نہیں پڑھی۔

7 ۔ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا، "حضور! آپ نے ساری عمر کس طرح بسر کی؟
"

انھوں نے کہا: "چار باتوں میں۔
الف) میں نے یقین کے ساتھ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر سے میں ایک لمحہ بھی)
غائب نہیں رہ سکتا۔ اس یقین کے بعد مجھے اپنے رب کے سامنے اس کی

نافرمانی کرنے سے شرم محسوس ہونے لگی۔

ب) میں نے یقین کے ساتھ جان لیا کہ میری قسمت میں جو رزق ہے، اس کا ذمہ اللہ) تعالیٰ نے لے لیا ہے۔ یعنی میرا رزق مجھے ہر حال میں ملے گا۔ یوں میں اپنے رزق کی طرف سے بے فکر ہو گیا۔

ج) میں نے یقین کے ساتھ جان لیا کہ جو فرائض میرے ذمے لگائے گئے ہیں، وہ) میرے علاوہ کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ اس طرح میں میں اپنے فرائض کی ادیگی میں مشغول ہو گیا۔

د) میں نے یقین کے ساتھ جان لیا کہ ایک روز مجھے ضرور مرنا ہے۔ اور دوسری دنیا) میں بہر حال جانا ہے۔ پس میں دوسری دنیا کو اپنے لیے اچھا بنانے کی کوشش میں لگ "گیا۔

۔ ایک عقل مند شخص نے کسی سے کہا کہ ہندوستان میں ایک ایسا درخت ہے، جس کا 8 پھل کھانے سے انسان ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ یہ بات بادشاہ تک پہنچ گئی۔ بادشاہ نے اس درخت کا پھل لانے کے لیے ایک شخص کو ہندستان کی طرف بھیجا۔ یہ شخص ہندوستان میں پہنچ کر جس سے بھی اس درخت سے متعلق پوچھتا تو وہ اس کا مذاق اڑا دیتا۔ آخر سال ہا سال کی بے سود محنت کے بعد جب وہ وطن کو لوٹنے لگا تو بوقتِ واپسی اسے ایک بزرگ ملا۔ اس نے بزرگ کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بزرگ نے یہ ماجرا سنا تو ہنس دیے۔ پھر انھوں نے کہا: "یہ درخت

صرف علم کی نعمت ہے۔ علم سے انسان دائمی زندگی پاتا ہے اور بے علم آدمی مردہ ہوتا ہے۔"

# مسجدِ نبوی کے قریب حملہ۔۔۔ مسلمان کب جاگیں گے ؟؟

خلیفہِ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ حکومت میں جب باغی مدینہ منورہ تک پہنچ گئے تو ایسے نازک حالات میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے تین تجویزیں پیش کیں ۔ ان میں سے ایک تجویز یہ تھی کہ آپ جہاد کا حکم دے دیجیے ۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بردبار اور حلیم الطبع تھے ۔آپ نے فرمایا : "مجھے یہ منظور نہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہو کر امت کا خون بہاؤں ۔ میں وہ خلیفہ نہیں بنوں گا، جو امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام میں خون ریزی کی ابتدا کرے۔" یہ واقعہ مجھے مسجدِ نبوی کے قریب ہونے والے حالیہ خود کش دھماکے پر یاد آیا۔ جس میں چار لوگ شہید ہو گئے ۔ یہ کون لوگ ہیں ، جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری آرام گاہ کے قریب خود کش دھماکے کرنے سے نہیں چوکتے ۔ بے شک یہ اندوہ گیں واقعہ تمام عالمِ اسلام کے مسلمانوں کے لیے لمحہِ فکریہ ہے۔ ایک ایسا مقام جس کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے مجھ ایسے ناتواں اور عاصی شخص کے لفظوں کا ذخیرہ ختم ہو جائے ، لیکن عظمت ختم نہ ہو ۔ ایک ایسا مقام جہاں بادشاہ ، فقیر بن جاتے ہیں ۔ جہاں رحمۃ اللعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم محوِ استراحت ہیں ، ایسے پر عظمت مقام پر حملہ کر کے مسلمانانِ عالم

کو کیا بتانے کی کوشش کی جا رہی ہے ؟ فارسی کا ایک شعر اس پر عظمت مقام کی بہترین منظر کشی کرتا ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرشِ نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

:علامہ اقبال نے کہا تھا

خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

جی ہاں، میرے آقا علیہ السلام کا روضہِ اقدس بڑا پر سکون مقام ہے۔ وہاں خاموشی اور ادب و احترم کو محبت کا سب سے بڑا قرینہ سمجھا جاتا ہے کہ کہیں آقا علیہ السلام کے آرام میں کچھ خلل نہ آ جائے۔ ہم نے وہاں بادشاہوں اور تونگروں تک کو خاموش اور نظریں جھکائے دیکھا ہے۔ نہ شور نہ شرابا، سکوت ہی سکوت ۔۔ سکون ہی سکون۔ مگر یہ خود کش بم بار کون تھا، جو مسجدِ نبوی کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ جو ہمارے آقا علیہ الصلوۃ والسلام کی آخری آرام گاہ تک پہنچ کر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ جو ہمارے شیخین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پریشان کرنا چاہتا تھا۔ بے شک میرا رب سب سے بڑا حفاظت کرنے والا ہے۔ جس طرح اب حفاظت کی، ان شاء اللہ پھر بھی اسی طرح اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہِ اقدس کی حفاظت

کرے گا۔

لیکن امت کو اب جاگ جانا چاہیے ۔ دہشت گردی پوری مسلم دنیا سے ہوتی ہوئی ہمارے لیے محبوب ترین شہر مدینہ منورہ تک پہنچ گئی ہے۔ کچھ دن پہلے بغداد کو خون میں نہلا دیا گیا۔ وہاں اب تک کی اطلاعات کے مطابق 165 لوگ شہید ہو چکے ہیں۔ زخمیوں کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔ اس سے پہلے بنگلہ دیش کے حالات خراب تھے۔ پھر اس سے پہلے ترکی کے ایک ہوائی اڈے کو، جو دنیا کا تیسرا مصروف ترین ہوائی اڈا تھا، نشانہ بنایا گیا ۔ عید الفطر قریب ہے۔ لیکن امت سوگ وار ہیں۔ نہ جانے یہ عید کیسے گزرے گی ؟ حالات نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر امت خوابِ غفلت میں سوئی ہوئی ہے۔ وہی فرقہ واریت ، وہی نا اتفاقی اور انتشار۔

اسلام کے مرکز پر اس اندوہ گیں حملے نے پوری مسلم دنیا کو مضطرب کر کے رکھ دیا ہے۔ کیوں کہ یہ مرکز ہے۔ اس مرکز سے مسلمانوں کا ایسا روحانی تعلق ہے، کہ اس پر مسلمان سب کچھ فدا کر سکتے ہیں۔ ہاں سب کچھ ۔مال سے لے کر جان تک ۔۔ سب کچھ۔ چند مذمتی بیان یہاں درج کیے جاتے ہیں، جس سے مسلم دنیا میں پھیلے اضطراب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مصر کے مفتی اعظم الشیخ شوقی علام نے کہا ہے کہ مسجد نبوی کے نزدیک دھماکا ایک انتہائی گھٹیا حرکت ہے جس کا تصور بھی محال ہے۔ حالیہ دھماکے ہمیں دہشت گردی کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ دہشت گردوں کے جرائم تمام حدیں پار کر چکے ہیں۔ دہشت گردی کا مقابلہ تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دہشت گردی کی حالیہ کارروائیاں سعودی عرب کی منزل کھوٹی نہیں کر سکتے۔

عرب لیگ کے جنرل سیکرٹری احمد ابو الغیط نے کہا ہے کہ نفرت انگیز دھماکوں نے ایک مرتبہ پھر ثابت کر دیا ہے کہ دہشت گردی کا کوئی مذہب اور وطن نہیں ہے۔ جن لوگوں نے یہ دھماکے کیے ہیں انھوں نے رمضان المبارک کی حرمت کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا۔ عرب لیگ دہشت گردی کی مذمت کے مسلمہ موقف پر قائم ہے اور اس کی تمام شکلوں کی واضح مذمت کرتی ہے۔

وزیر اعظم نواز شریف نے کہا ہے کہ دہشت گردی عالمی مسئلہ ہے، عالم اسلام کو متحد ہونا ہوگا۔ مشکل کی اس گھڑی میں سعودی عرب کے ساتھ ہیں۔

شہباز شریف نے دھماکوں کی مذمت کرتے کہا ہے کہ دہشت گردی جیسے ناسور سے نمٹنے کیلئے مشترکہ اقدامات کرنا ہوں گے۔

عمران خان نے کہا ہے کہ کرب کی اس گھڑی میں سعودی عرب اور عوام کے ساتھ ہیں۔ عالمی سطح پر دہشت گردی میں تیزی باعثِ تشویش ہے۔ عالمی برادری کو دہشت گردی کے اسباب کا سنجیدگی سے جائزہ لینا ہوگا۔

چیئرمین رویت ہلال کمیٹی مفتی منیب الرحمٰن نے کہا ہے کہ دہشتگردی کہیں بھی ہو قابل مذمت ہے۔ دہشت گردوں کو وقت سے پہلے کچل دیا جاتا تو یہ واقعات نہ ہوتے۔

دہشت گردوں کیخلاف عوام کو ایک ہونا ہوگا۔

امیر جماعۃ الدعوۃ پاکستان حافظ محمد سعید نے سعودی عرب میں ہونے والے دھماکوں کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسلمانوں کے روحانی مرکز سعودی عرب میں خودکش حملے سرزمین حرمین شریفین کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کی خوفناک سازش ہے۔ ایسے خودکش حملے منظم سازشوں اور منصوبہ بندی کے تحت کیے جا رہے ہیں۔ جو لوگ ان حملوں میں ملوث ہیں وہ یقیناً دشمن کے ہاتھوں میں کھیل رہے اور اسلام کی بدنامی کا باعث بن رہے ہیں۔ اسلام دشمن قوتیں دیگر مسلم ملکوں کی طرح سعودی عرب میں بھی قتل و غارت گری پروان چڑھانا چاہتی ہیں۔ مسلم ممالک کو متحد ہو کر ان سازشوں کو ناکام بنانا چاہیے۔

ڈاکٹر طاہر القادری نے سعودی عرب میں خودکش حملوں کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مذمتی بیان ہیں۔ لیکن طوالت کے خوف کے سبب اسی پر اکتفا ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ بات صرف مذمتی بیان دینے تک ہی رہتی ہے یا اس عالمی مسئلے کے حل کے لیے اقدامات بھی کیے جائیں گے۔

آخر میں اللہ تعالی سے نہایت عاجزی کے ساتھ دعا کرتے ہیں :

(اے اللہ ! حرمین شریفین اور روضہِ اقدس کی حفاظت کر۔(آمین

(اے اللہ ! امتِ مسلمہ کے حال پر رحم کر۔(آمین

(اے اللہ ! امتِ مسلمہ کو اس کے دشمنوں کے خلاف متحد کر۔(آمین

# ہمارے ایدھی بابا چلے گئے

ہمارے ایدھی بابا چلے گئے۔ جانا تو سب کو ہوتا ہے۔سب کی منزل وہی ہے۔ لیکن کچھ لوگ جا کر بھی نہیں جاتے۔پتا ہے، وہ کون لوگ ہوتے ہیں ؟ ہمارے بابا جیسے لوگ ۔یعنی وہ لوگ جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ جن کی خواہشیں، جن کی امنگیں، جن کی خوشیاں ۔۔ غرض سب کچھ دوسروں کے لیے وقف ہوتا ہے۔

بابا ایدھی کا پورا نام عبدالستار ایدھی تھا۔لیکن وہ ہمارے بابا تھے۔ پوری قوم کے بابا ۔غریب بستیوں کے رہنے والوں کے بابا۔سچ پوچھیے تو پوری انسانیت کے بابا۔اس لیے میں ان کو بابا ایدھی کہوں گا۔تاریخِ پاکستان میں ہم نے ایسا بابا نہیں دیکھا۔ ہمارے قومی شاعر نے کہا تھا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بابا ایدھی جیسے لوگ روز روز نہیں آیا کرتے۔ صدیاں گذر جاتی ہیں۔تب کہیں جا کر ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔

بابا نے ساری عمر سادگی میں گزار دی۔ ان کے لباس اور کھانے پینے سے سادگی جھلکتی تھی۔ ان کے پاس سستے ترین کپڑوں کے صرف دو جوڑے تھے۔ جن میں سے ایک میلا ہو جاتا تھا تو وہ دوسرا پہن لیتے تھے۔ وہ دو کمروں کے سادہ فلیٹ میں رہتے تھے۔ جہاں سادگی ہی سادگی نظر آتی تھی۔ وہ کتنے عظیم تھے کہ جاتے ہوئے اپنی آنکھیں عطیہ کر گئے۔ وہ محبِ وطن پاکستانی تھے۔ وطن کی محبت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بابا 2013ء سے گردوں کے عارضے میں مبتلا تھے۔ ایک بار ان کو سابق صدر آصف علی زرداری نے ملک سے باہر علاج کرانے کی پیش کش کی۔ بابا نے انکار کر دیا اور کہا کہ میرا علاج پاکستان میں ہوگا۔ ان کا علاج آخر تک پاکستان میں ہوتا رہا۔

بابا کو غریبوں سے سچی محبت تھی۔ وہ ساری زندگی غریبوں کا دکھ درد بانٹتے رہے۔ وہ ساری زندگی انھی کے رہے۔ آج بھی غریبوں کی بستی میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یعنی موت بھی ان کو غریبوں سے جدا نہ کر سکی۔ انھوں نے 25 سال پہلے وہاں اپنی قبر تیار کروا دی تھی۔ کیوں کہ موت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ یہ کبھی بھی آ جاتی ہے۔

بابا کی موت نے سب کو سوگ وار کر دیا۔ بچے، بوڑھے، جوان، سبھی ان کی موت پر افسردہ ہیں۔ لوگ کہتے ہیں، انھیں نوبل ایوارڈ کیوں نہیں ملا۔ ہم کہتے ہیں، عوام سے ن کا لگاؤ اور محبت ہی ان کا نوبل ایورڈ تھا۔ نوبل

ایوارڈ نہیں ملا تو کیا ہوا۔ان کو 20 سے زائد قومی و بین الاقوامی اعزازت مل چکے تھے ۔ نوبل ایوراڈ کوئی سچے پکے ہونے کی سند نہیں۔ سند یہ ہے کہ عام عوام کسی کو کتنا چاہتے ہیں۔ ایدھی صاحب کو عام عوام بہت چاہتے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ وہ عظیم شخص تھے۔ بی بی سی اردو کی ویب سائٹ پر کوئٹہ سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون کا ذکر کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ یہ عورت اپنے ایدھی بابا کے غم میں مسلسل رو رہی تھی۔اس کی آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ایک رضا کار کا کہنا تھا کہ سترہ سال پہلے یہ خاتون ایدھی رضاکاروں کو ملی تھی۔ گونگی ہونے کے باعث اس خاتون کا نام معلوم نہیں ہو سکا ہے۔انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ایدھی بابا جب کوئٹہ آتے تھے تو یہی خاتون ان کے لیے کھانا بنایا کرتی تھی۔ یہ خاتون آنکھوں سے رواں دواں آنسوؤں کے ساتھ ایدھی صاحب کی تصویریں اپنے دوپٹے سے صاف کر رہی تھی۔ یہ عورت کسی کو بھی بابا ایدھی کی تصویریں صاف نہیں کرنے دی رہی تھی۔ بابا ایدھی کے جانے کے بعد وہ بچے دوسری بار یتیم ہو گئے، جو پہلی بار یتیم ہونے کے بعد اپنے بابا ایدھی کے یتیم خانوں میں رہتے تھے۔ وہ بچے بھی افسردہ ہیں۔ پتا نہیں، اب ان کے معصوم چہروں پر پھیلی زردیوں کو کون ختم کرے گا۔

بابا ایدھی کی بات ہوئی تو میرے ایک دوست نے اظہارِ خیال کیا۔انھوں نے اپنا نکتہِ نظر پیش کیا۔ میں نے وعدہ کیا کہ اپنی تحریر میں آپ کا نکتہ

نظر دوں گا۔ ان کا خیال تھا کہ میڈیا اس وقت بابا ایدھی کے بارے میں اچھی رپورٹنگ کر رہا ہے کہ وہ ایک اچھے انسان تھے۔ لیکن میڈیا کو اس کے ساتھ یہ بھی بتانا چاہیے کہ جو کام بابا ایدھی نے کیے ہیں، وہ کام حکومت کے کرنے کے تھے۔ لیکن حکومت نے غفلت برتی۔ اس لیے اب بابا ایدھی کی وفات کے بعد حکومت کو ان کے کام کی باگ ڈور سنبھالنی چاہیے۔ کیوں کہ یہ کام حکومت کے کرنے کا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد فوت ہوئے تو شورش کاشمیری تڑپ اٹھے تھے۔ انھوں نے اس وقت ایک دردناک نظم کہی تھی۔ کل جب میں نے بابا ایدھی کی وفات کی خبر سنی تو مجھے فوراً وہ نظم یاد آ گئی۔ اس نظم کے دو بند پیش کرکے آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

عجب قیامت کا حادثہ ہے، کہ اشک ہے آستیں نہیں ہے
زمین کی رونق چلی گئی ہے، اُفق پہ مہر مبیں نہیں ہے
تری جدائی سے مرنے والے، وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے!
اگرچہ حالات کا سفینہ اسیر گرداب ہو چکا ہے
اگرچہ منجدھار کے تھپیڑوں سے قافلہ ہوش کھو چکا ہے
اگرچہ قدرت کا ایک شہکار آخری نیند سو چکا ہے

مگر تری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے !

یہ کون اٹھا کہ دیر و کعبہ شکستہ دل، خستہ گام پہنچے
جھکا کے اپنے دلوں کے پرچم، خواص پہنچے، عوام پہنچے
تری لحد پہ خدا کی رحمت، تری لحد کو سلام پہنچے
مگر تری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے !

## !! محمد احمد سبزواری نہیں رہے

کل کی ایک خبر سے معلوم ہوا کہ ہمارے ملک کی 'سوشل میڈیا سلیبریٹی' قندیل بلوچ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ میڈیا بتاتا ہے کہ ان کو ان کے بھائی نے غیرت کے نام پر قتل کیا۔ وہ متنازعہ تو تھیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو یوں ہی قتل کر دیا جاتا۔ بہر حال اب وہ دنیا میں نہیں رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

کل ایک اور افسوس ناک خبر بھی آئی۔ مگر یہ افسوس ناک صرف مجھ جیسے لوگوں کے لیے ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے، آپ بھی یہ 'افسوس ناک' خبر پڑھ کر مسکرا دیں۔ خبر یہ ہے کہ محمد احمد سبزواری، جو کہ معروف کالم نگار اور معیشت دان تھے، 104 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جس اخبار کے لیے انھوں نے 23 سال تک کالم نگاری کی تھی، اس میں دوسرے صفحے پر ایک یک کالمی خبر شائع ہوئی۔

مجھے کل فیس بک پر ڈاکٹر رئیس صمدانی صاحب کی ایک پوسٹ کی وساطت سے اس خبر کا علم ہوا۔ درحقیقت محمد احمد سبزواری جیسے لوگ ہمارے لیے اصل اور حقیقی سلیبریٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ، جن کی پوری زندگی علم کا اجالا پھیلانے میں گزر جاتی ہے۔ ایسے لوگ جن کے دم سے علم کی شمعیں ان کی حیات میں بھی روشن رہتی ہیں اور بعد از مرگ بھی اپنے

علم کے نور کی وجہ سے وہ لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ مگر ہم سطحی ذہن رکھنے والے لوگ ہیں۔ ہم ایسے لوگوں کی قدر بالکل نہیں جانتے۔ ہم ایسے لوگوں کو بھول جاتے ہیں۔ کل جب مجھے ان کے انتقال کے بارے میں معلوم ہوا تو میں نے گوگلنگ' شروع کردی۔ آپ یقین جانیے، ان کے انتقال کے بارے میں ایک خبر بھی' نہیں تھی۔ بعد میں میں نے اردو میں ان کا نام لکھا تو ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی صاحب کے ان کے بارے میں لکھے ہوئے مضمون کے دو تین لنکس آئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کے بارے میں اخبارات اپنا ایک صفحہ 'قربان' کردیتے کہ وہ ذی علم شخص تھے اور انھوں نے اپنی پوری زندگی اپنے لوگوں کو معیشت کا علم دینے میں صرف کردی تھی ۔ویب سائٹیں ان کے کارناموں سے بھری ہوئی ملتیں۔ ٹی وی میزبان ان کے کارناموں کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ محمد احمد سبزواری جیسے لوگ مغربی دنیا میں ہوتے تو نہ جانے ان کے انتقال کے بعد کتنے دنوں تک ان کے کارناموں کا ڈنکا بجایا جاتا۔ مگر یہاں کیا ہوا۔ ایسا لگتا ہے، جیسے ہم ان سے جان چھڑانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ کیوں کہ ان کی عمر 104 سال ہو چکی تھی۔ اب تو ان کو رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ میں یہ بات میں مشاہدے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ جمیل الدین عالی، علیل تھے، مگر ہم نے سنا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اسی طرح کا قصہ عبد الستار ایدھی مرحوم کے ساتھ بھی ہوا۔

محمد احمد سبز واری16 جنوری، 1913ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔1939ء میں حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونی ورسٹی سے انھوں نے ایم اے کیا تھا۔1948ء میں وہ ہجرت کرکے پاکستان آ گئے تھے۔ یہاں انھوں نے حکومتِ پاکستان کے اسٹیٹکس کے شعبے میں ملازمت اختیار کر لی۔ 1976ء میں وہ اس ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔

ء سے ان کے تحریری کیریئر کا آغاز اس وقت ہوا، جب انھوں نے لاہور سے1931 شائع ہونے والے 'تہذیبِ نسواں 'میں 'جنون کی کہانیاں ' کے نام سے ایک تحریر لکھی۔ 1942ء میں انجمن ترقی اردو نے ان کی کتاب 'ہماری بنک' شائع کی۔ جو شاید بنک کے موضوع پر اردو کی اولین کتاب ہے۔1951ء میں انھوں نے 'اصطلاحاتِ بینکاری' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ انھیں اردو زبان سے محبت تھی۔ شاید اسی وجہ سے بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ انھوں نے ماہانہ رسالے 'معاشیات' کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کے ساتھ کام کیا تھا۔1993ء سے وہ روزنامہ جنگ میں 'معیشت کی جھلکیاں ' کے نام سے کالم لکھ رہے تھے۔ یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔

درج بالا اقتباس میں میں نے ان کے چند علمی کارناموں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے
۔

ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ سو سال سے زائد عمر کے تھے، لیکن چاق و

چو بند تھے۔اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وہ شہر قائد میں رہتے تھے۔یعنی کسی دیہات یا گاؤں میں نہیں رہتے تھے۔ شہر کی آلودہ فضا میں رہتے ہوئے بھی وہ صحت مند تھے۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ کچھ لوگ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ پھر جب ان سے صحت کی خرابی کا پوچھا جائے تو وہ ماحولیاتی آلودگی پر دوش ڈال دیتے ہیں۔ وہ سگریٹ نوشی اور دیگر مضرِ صحت چیزوں سے مکمل طور پر پرہیز کرتے تھے۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت پڑھنے اور لکھنے جیسی صحت مند اور جان دار سرگرمیوں میں صرف کر دیتے تھے۔لکھنا اور پڑھنا واقعی صحت مند سرگرمیاں ہیں۔ مولانا وحید الدین خان صاحب، جو انڈیا میں رہتے ہیں، ان کی پیدائش 1925ء کی ہے۔ لیکن ابھی تک ہم نے ان کی بیماری کی خبر نہیں سنی۔الحمد للہ۔ شاید ان کی صحت کا راز بھی یہی ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو پڑھنے اور لکھنے جیسی صحت مند سرگرمیوں میں مصروف رکھا ہوا ہے۔ محمد احمد سبزواری جیسے لوگ اگر مغربی دنیا کے رہنے والے ہوتے تو ضرور بالضرور ان کی قابلِ رشک صحت پر بھی ان کے انتقال کے بعد کئی دنوں تک بحث جاری رہتی۔آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔(آمین)

# کشمیر کا لہو

.برہان مظفر وانی کی شہادت کے بعد سے لے کر اب تک وادیِ کشمیر لہو لہان ہے۔ یہ وادی اکثر و پیشتر لہو لہان ہوتی رہتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے، پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔اس وادی کے بار بار سلگنے کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ اگر اس دفعہ پچاس سے زائد لوگ شہید اور کئی سو لوگ زخمی ہو گئے تو کیا ہوگیا۔ جو چیز بار بار ہوتی آ رہی ہے، اس پر احتجاج، واویلا، غصہ، اقوامِ متحدہ میں آواز اور یومِ سوگ کا کیا فائدہ ! ہاں، اثرات نظر آئیں تو پھر چیخ و پکار بھی ہونی چاہیے، شور بھی ہونا چاہیے احتجاج کی ہڑبونگیں بھی ہونی چاہئیں۔ اقوامِ متحدہ کا دروازہ بھی کھٹکھٹانا چاہیے اور، یومِ سوگ بھی منانا چاہیے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری ان 'حرکات' سے کشمیر کے منظر نامے میں ذرا سی تبدیلی بھی واقع نہیں ہوئی۔ ظلم اسی طرح جاری ہے۔ تشدد کا اسی طرح عروج ہے۔ وادی اسی طرح اداس ہے۔

.برہان مظفر وانی کا 'قصور' تھا کہ وہ بھارت سے آزادی کا خواہاں تھا۔ اس کے ساتھی بھی 'قصور وار' تھے کہ وہ آزادی کے سپنے دیکھ رہے تھے۔ یہ سارے 'باغی' تھے۔اور بغاوت' کو حکومتیں معاف نہیں کیا کرتیں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے'

کہ آخر یہ لوگ جذبہ حریت سے سرشار کیوں تھے ؟آخر کشمیر کے لوگ بھارتی حکومت سے مایوس کیوں ہیں ؟کیا وجہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے پڑھے لکھے ، باشعور اور مہذب لوگ بھی کشمیر میں بھارتی حکومت کو پسند نہیں کر رہے؟ یہ وہ سوالات ہیں ، جن پر بھارتی حکومت کے دانش وروں اور وہاں کے حکومتی لوگوں کو ایک بار نہیں ، سو بار سوچنا چاہیے ۔جب ان کو ان تلخ سوالات کے جوابات مل جائیں گے تو ان کا کام آسان ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ ان سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی بہ جائے اندھا دھند فائرنگ کرکے کشمیر میں ہر دم ظلم کی کالی رات بپا کرتے رہیں گے تو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی ۔بھارت لاکھ 'اندرونی معاملہ' کی رٹ لگاتا رہے ، پاکستان سمیت ہر ملک کے وہ مہذب اور معزز لوگ ، جن کے دلوں میں ذرا سی بھی انسانیت کا درد ہوگا، ضرور اس ظلم کے خلاف آواز بلند کریں گے ۔

بھارت سمجھتا ہے کہ کشمیر میں اس طرح شبِ ظلمت کی تاریکی پھیلا کر کشمیریوں کے دلوں میں اپنا خوف بٹھالے گا۔ لیکن یہ اس کی بھول ہے۔جب کسی قوم میں جذبہ حریت پیدا ہو جائے تو پھر دنیا کا کوئی ظلم اس جذبے کو ٹھنڈا نہیں کر سکتا۔ کشمیر میں پچھلے کئی دنوں سے انڈیا کی فوج ظلم کر رہی ہے ، لیکن اب تک احتجاج جاری ہے ۔ بھارتی فوج لاکھ کوشش کر رہی ہے کہ کسی طرح حالات قابو میں آجائیں ، لیکن ان کا یہ ظالمانہ طریقہ کشمیریوں کے دلوں

میں بھارت کی مزید نفرت پیدا کر رہا ہے۔ بھارت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے کہ کشمیریوں کے حالیہ احتجاجات کو روکنے کا بھارتی طریقہ درست نہیں ہے۔ اگر درست ہوتا تو.برہان وانی کی شہادت کے دوسرے تیسرے روز بعد یہ احتجاجات رک جاتے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ معاملات بگڑتے گئے۔ پچاس سے زائد لوگ شہید ہو گئے۔ سیکڑوں لوگ زخمی ہو گئے۔ کئی لوگوں کے گھر اجڑ گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ کشمیر میں ان دنوں 'باغیوں' کے لیے چھرے والی بندوقوں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ بندقیں جان لیوا تو نہیں ہوتیں، لیکن ان سے متاثرین کو شدید چوٹیں لگتی ہیں، ایسی چوٹیں، جو ان کے لیے پوری زندگی کا روگ بن جاتی ہیں۔ اس گن کے متاثرین کا علاج مہنگے داموں ہوتا ہے۔ شمالی کشمیر میں رہنے والے کبیر کی دونوں آنکھوں کی بینائی اس چھرے والی ظالم بندوق نے چھین لی ہے۔ کبیر کی ماں نے اس کے علاج کے لیے اپنے زیورات تک بیچ دیے۔ پھر پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے قرضے لیے۔ 15 سالہ عابد میر کو اس بندوق سے چوٹیں لگیں تو اس کا علاج کشمیر کی بجائے امرتسر میں ہوا۔ اس کے علاج پر دو لاکھ روپے کی لاگت آئی۔ چھرے والی بندوقوں کی وجہ سے جن لوگوں کی بینائی چلی جاتی ہے، وہ سخت مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ڈار گریجویشن کے آخری سال میں تھے، جب چھرے والی اس ظالم بندوق نے ان کی

آنکھیں زخمی کر دیں۔ وہ پانچ مرتبہ سرجری کرا چکے ہیں۔ اب جا کر ان کی بائیں آنکھ میں تھوڑی سی روشنی واپس آئی ہے اور وہ کسی حد تک اس آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ چودہ سالہ انشا مشتاق بھی اسی ظالم چھرے والی بندوق سے شدید زخمی ہو گئی ہے۔ انشا مشتاق کا علاج کرنے والے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس کی بینائی کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اب وہ کبھی نہیں دیکھ سکے گی! انشا مشتاق کا چہرہ مکمل طور پر سوج کر بگڑ چکا ہے۔

یہ ظلم کی وہ چند تصویریں ہیں، جن سے بھارت کے 'رحم و کرم' کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ورنہ سوشل میڈیا پر ایسی کئی تصویریں دیکھ جا سکتی ہیں، جن کے ذریعے اس بات کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھارت پچھلی نصف صدی سے زیادہ وقت پر محیط عرصے میں کشمیریوں کی خوش نودی حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکام کیوں رہا ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ یہ صدی تقاضا کرتی ہے کہ شکوہ شکایت کرنے والوں کی شکایتیں سنی جائیں۔ جو لوگ احساسِ محرومی کا شکار ہیں، ان کا یہ جان لیوا احساس ختم کیا جائے، بہ صورتِ دیگر غیروں سے زیادہ اپنے لوگوں کی ناپسندیدگی کا نشانہ بننا پڑے گا۔ اب تو بھارت کے دانشور بھی یہ کہنے لگے ہیں کہ کشمیریوں کو حقِ خود ارادیت دے دیا جائے۔

# مظلوم انسانیت کے حق میں اٹھنے والی آوازیں

کچھ لوگوں کی نظر میں سب سے اہم شے انسانیت ہوتی ہے۔ یہ لوگ بغیر کسی مذہبی، سیاسی اور معاشرتی تفریق کے، انسانوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ یہ لوگ واقعی عظیم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بہادر بھی ہوتے ہیں کہ گھٹن زدہ ماحول میں انسانیت کے حق میں آوازیں بلند کرتے ہیں۔ دراصل انصاف اسی کو کہتے ہیں کہ مظلوم چاہے اپنوں میں سے ہو، یا غیروں میں سے۔۔ مظلوم، مظلوم ہوتا ہے۔ یہ ناانصافی ہے کہ اپنے مظلوم کے خلاف تو آواز بلند کی جائے، لیکن جو اپنا مظلوم نہ ہو، اس کو مظلوم ہی نہ سمجھا جائے۔ اسی طرح اپنا ظالم، ظالم نہ لگے۔ لیکن دوسروں کے ظلم کی خوب تشہیر کی جائے۔ بہت سے مظلوم سیاست کی آڑ میں، ظلم کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور انھیں خبر ہی نہیں ہوتی۔ سیاست ایک خونی کھیل ہے۔ میرے خیال میں تاریخِ انسانیت میں جتنا ظلم سیاست کے نام پر ہوا، کسی اور نام پر نہیں ہوا۔ بہر حال انسان پر ہونے والے ظلم کے خلاف جو آواز بھی بلند ہو، ہمیں اس کو سراہنا چاہیے۔ چاہے وہ آواز اپنے بلند کریں یا غیر۔

کم و بیش ایک سال قبل میں نے ایک برطانوی شہر ڈیمین موران کے بارے میں لکھا تھا۔ ڈیمین موران نے بھی دراصل انسانیت پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز

بلند کی تھی۔۔برطانوی شہری ڈیمین موران نے اسرائیلی صدر بنجمن نیتن یاہو کی خلاف ایک آن لائن پٹیشن دائر کی تھی۔ اس پٹیشن کے مطابق جب بنجمن نیتن یاہو لندن پہنچیں تو انھیں جنگی جرائم کی بنا پر گرفتار کیا جائے۔ کیوں کہ وہ 2014ء میں ، فلسطین میں 2000 عام شہریوں کے قتلِ عام کے مرتکب ہوئے تھے۔ ڈیمین موران کا اشارہ جولائی 2014ء میں غزہ پر ہونے والی اس بے رحم اسرائیلی بم باری کی طرف تھا، جس نے 2200 لوگوں کی جان لے لی تھی۔ ان دنوں لندن میں اسرائیلی صدر کو دورہ کرنا تھا۔ اسرائیلی صدر کے خلاف.برطانیہ سے اٹھنے والی یہ 'کم زور' آواز واقعی قابلِ ستائش تھی۔ ڈیمین موران کی اس آن لائن پٹیشن کو نواسی ہزار سات سو ساٹھ ووٹ اس وقت تک مل چکے تھے جب میں ان کے بارے میں کالم لکھ رہا تھا۔ حالاں کہ اس آن لائن پٹیشن کو صرف.برطانوی شہری ووٹ دے سکتے تھے۔ یعنی یہ نواسی ہزار سات سو ساٹھ.برطانوی لوگ بھی فلسطینیوں کو 'انسان' سمجھتے ہوئے، ان پر ہونے والے اسرائیلی مظالم کے خلاف تھے۔

"Never Forget Pakistan" فیس بک کے ایک پیج پر کشمیر کے حق میں آواز بلند کرنے کے لیے عجیب وغریب انداز میں احتجاج کیا گیا ہے۔ اس پیج پر چند مشہور شخصیات کے چہروں کو اس طرح دکھایا گیا ہے، جیسے ان کے چہروں کو کشمیر میں استعمال ہونے والی چھروں والی بندوقوں نے بری طرح بگاڑ دیا ہو۔ یہ احتجاج

کا بڑا عجیب طریقہ ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس سے پہلے احتجاج کا ایسا طریقہ کبھی نہیں اپنایا گیا۔ جن مشہور لوگوں کے چہروں کو بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے، ان میں فیس بک کے بانی مارک زکر برگ، بھارت کے وزیرِ اعظم نریند مودی، کانگریس کی رہنما سونیا گاندھی، بھارتی اداکار شاہ رخ خان اور امیتابھ بچن وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان تصویروں کے ساتھ انگریزی میں تنقیدی اور تلخ طنز پر مبنی تحریریں بھی لکھی گئی ہیں۔ جبران ناصر، جو اس مہم کے پیچھے کارفرما ہیں، کہتے ہیں کہ جس طرح مرضی ہم اپنی مہم کو بنائیں، مگر یہ واضح ہونا چاہیے کہ ہم کسی کے آلہ کار نہ بنیں صرف مظلوم کی آواز آگے پہنچائیں اور ہم سب ایک بات پر متفق ہیں کہ کشمیریوں کو فیصلہ کرنے کا حق ملنا چاہیے۔ جبران ناصر کی اس مظلوموں کے حق میں اٹھنے والی اس آواز کو نہ سراہنا اچھی بات نہیں ہے۔

ان دنوں بھارت کی ایک خاتون صحافی برکھا دت کو کافی شہرت ملی ہے۔ وہ پہلے سے ہی بہت مشہور تھی۔ لیکن حافظ محمد سعید صاحب نے ان کو اور 'مشہور' کر دیا ہے۔ برکھا دت کو حافظ صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا، لیکن انھوں نے حافظ صاحب کو سخت تنقید کا نشانہ بنا دیا۔ حافظ صاحب نے بھارت کی خاتون صحافی برکھا دت کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب میں کشمیر کے حوالے سے بات کرتا ہوں تو ہندوستان اپنے مظالم اور دہشت گرد کارروائیاں چھپانے کے لیے

مجھ پر الزام لگاتا ہے، لیکن وہاں برکھا دت جیسے اچھے لوگ بھی موجود ہیں۔ برکھا دت نے دراصل کشمیر میں ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کی تھی ۔ جس کی وجہ سے انھیں ان کے اپنے ملک کے ایک معروف صحافی نے سخت تنقید کا نشانہ بنا دیا۔ جس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان دنوں کشمیر کے ضمن میں بھارتی میڈیا سخت تردد کا شکار ہے ۔ جب حافظ محمد سعید نے برکھا دت کی تعریف کی تو انھوں نے حافظ صاحب کو سوشل میڈیا کی ویب سائٹ ٹویٹر پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ لیکن اس کے باوجود کشمیر میں ہونے والے ظلم کے خلاف ان کی 'صحافتی آواز' کو ضرور سراہنا چاہیے ۔

جب اپنے لوگ 'غیروں' کا ساتھ دینا شروع کر دیں تو سمجھ لیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے ۔ برکھا دت کے علاوہ اور بھی کئی بھارتی صحافی اور دانش ور ہیں، جو کشمیر میں ہونے والے حالیہ بھارتی ظلم کے خلاف لکھ رہے ہیں اور بول رہے ہیں ۔ لیکن بھارت کے سیاہ و سفید کے مالک حکم ران پھر بھی کشمیریوں کو اپنی سیاست کے بھینٹ چڑھا رہے ہیں ۔ بھارت کے مرکز میں قائم بی جے پی کی حکومت فی الحال کشمیریوں پر ظلم کرنے کے موڈ میں ہے ۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نریندر مودی کی حکومت اپنے 'زیرِ انتظام کشمیر میں امن کا قیام نہیں چاہتی ۔ '

# 14 اگست کا پیغام

14 اگست 1947ء کو ہمارا پیارا وطن پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ یہ وہ عظیم دن ہے، جس دن مسلمانانِ ہند کو آزادی ملی۔ آزادی کی اس تحریک میں بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ، شاعرِ مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ، سر سید احمد خان، نواب محسن الملک، نواب وقارالملک، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جوہر، اے کے فضل الحق، چوہدری رحمت علی اور ان کے علاوہ دیگر بہت سے قائدین کی انتہائی اہم خدمات ہیں۔ جو خواب حکیم الامت، شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا تھا، بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔ پاکستان کی بنیاد "دو قومی نظریہ" پر رکھی گئی تھی۔ اس نظریے کے بانی سر سید احمد خان تھے۔ سر سید احمد خان کے قائم کردہ علی گڑھ کالج کے طالب علموں نے تحریکِ پاکستان میں انتہائی اہم خدمات سرانجام دیں۔ اس طرح مسلمانانِ ہند کی آزادی میں سر سید احمد خان نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

پاکستان 14 اگست 1947 کو دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ لیکن بد قسمتی سے محض 24 سال بعد پاکستان دو لخت ہوگیا۔ یعنی یہ دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اس خطہ

پاک کو دولخت کرنے میں اپنوں کی غفلتیں اور غیروں کی سازشیں کارفرما تھیں۔
حیرت کی بات یہ ہے کہ پاکستان کی تحریک میں بنگلہ دیش کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ 23 مارچ 1940ء کو قراردادِ پاکستان مولوی اے۔کے فضل الحق نے پیش کی تھی۔ ان کا پورا نام ابوالقاسم فضل الحق تھا۔ وہ بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے تھے۔ بنگالی لہجے میں ان کا نام "ابوالکاشم فضل الحق" تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نام میں " اے۔کیو" کی جگہ "اے۔کے" استعمال ہوتا ہے۔
14 اگست کا پیغام کیا ہے ؟ اس عظیم دن کا پیغام یہ ہے کہ ہم اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں۔ انتشار سے بچیں۔ ہر قسم کے تعصبات کو بھول جائیں۔ دشمن ہمارے درمیان قومیت، صوبائیت، فرقہ واریت کی بنیاد پر انتشار اور نااتفاقی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ دشمن کی یہ چال سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو متحد کرلیں۔ ہمارے درمیان اسلام کا رشتہ ہے۔ اسلام اتحاد کا درس دیتا ہے۔ اگر ہم حقیقی اسلام پر عمل پیرا ہو جائیں تو خود بہ خود ہماری صفوں میں اتحاد پیدا ہوجائے گا۔
14 اگست ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے بڑی محنت اور جد جہد سے پاکستان حاصل کیا۔ اب ہمارے وہ بزرگ دنیا میں نہیں رہے۔ یعنی اب ہمیں ہی

اس ملک کو سنبھالنا ہے۔ اس ملک کی ترقی میں ہمیں اہم کردار ادا کرنا ہے۔ اس خطہِ ارضی کو جنت بنانا ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے ؟آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم ہر قسم کی دو نمبری' سے بچیں۔ جب پوری قوم 'امانت دار' بن جائے گی تو یہ پاک خطہ خود بہ' خود جنت بن جائے گا۔ ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ ہم کس حد تک اپنے پیارے وطن سے مخلص ہیں۔ دوکان دار سے لے کر سیاست دان تک ۔۔ کتنے لوگ ہیں، جو دو نمبری' نہیں کرتے ۔۔ بے شک ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ جب ایسے لوگ آٹے میں' نمک کے برابر ہیں تو ہمارا پیارا ملک کیوں کر ترقی کر سکتا ہے ؟

اگست ہمیں پیغام دیتا ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔وہ نظریہ کیا ہے ؟ 14 بے شک وہ نظریہ اسلام ہے۔ بانیِ پاکستان نے فرمایا تھا کہ ہم پاکستان کو ایک 'اسلامی تجربہ گاہ' بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا ہم اس اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں ؟ بے شک ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں، جو اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہمیں دنیا و آخرت، دونوں میں کام یابی حاصل ہو گی۔ جو لوگ دین اور سیاست، دونوں کو الگ الگ چیزیں سمجھتے ہیں، انھیں حکیم الامت علامہ محمد اقبال رحمۃاللہ علیہ کے درج ذیل شعر میں پنہاں نکتے پر غور کرنا چاہیے :

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جو لوگ اسلام سے خائف ہیں، انھیں دینِ اسلام کے بنیادی ذرائع یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا عمیق مطالعہ کرنا چاہیے۔ بے شک اس طرح وہ دینِ اسلام کے گرویدہ ہو جائیں گے۔

میں نے درج بالا تین اقتباسات میں اپنی دانست کے مطابق 14 اگست کے تین پیغامات اور تقاضے تحریر کیے ہیں۔ ان میں سے پہلا یہ ہے کہ ہم انتشار سے بچتے ہوئے متحد ہو جائیں۔ دوسرا یہ ہے کہ ہم ہر قسم کی 'دو نمبری' کو چھوڑ کر اپنے ملک کے لیے مخلص اور اپنے ملک کے لوگوں کے لیے امانت دار بن جائیں۔ تیسرا پیغام یہ ہے کہ ہم اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر ہم اس 14 اگست پر اپنے اندر یہ مثبت تبدیلیاں لانے میں کام یاب ہو گئے تو بے شک ہم بہت آگے نکل جائیں گے۔ اور بہت جلد ترقی یافتہ قوموں میں ہمارا شمار ہو گا۔

## 9/11 نے کیا دیا؟

9/11 کا واقعہ 2001ء میں پیش آیا۔ اس واقعے کے نتیجے میں 2750 لوگ نیو یارک میں، 184 پینٹاگون میں اور 40 لوگ پینسلوانیا میں ہلاک ہوئے۔ امریکا نے ان دھماکوں کا ذمہ دار القاعدہ کو قرار دیا۔ یہ امریکی تاریخ کے سب سے زیادہ بھیانک ترین اور موت آور دھماکے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دراصل چار فضائی حملے تھے۔ واضح رہے کہ جن طیاروں سے یہ حملے کیے گئے، وہ امریکا کے اغوا شدہ طیارے تھے۔ 11 ستمبر کو صبح آٹھ بجے ایک طیارہ امریکا کی بلند و بالا عمارت ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرایا۔ اٹھارہ منٹ بعد تباہ شدہ عمارت کے قریب، دوسری عمارت سے دوسرا طیارہ ٹکرایا۔ ایک گھنٹے بعد تیسرا اغوا شدہ طیارہ پینٹاگون پر گرایا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد پنسلوانیا میں ان حادثات سے ملتا جلتا ایک حادثہ پیش آیا۔ اس عظیم واقعے نے عالمی سیاست کو بدل کر رکھ دیا۔ دراصل یہی وہ عظیم واقعہ ہے، جس سے پورے عالم میں صحیح طور پر امریکی برتری کا آغاز ہوا۔ اس لیے اس واقعے کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس دن ہونے والے چار حادثات میں لگ بھگ 2974 لوگ ہلاک ہوئے، لیکن ان 2974 لوگوں کی ہلاکت کے بدلے میں امریکا کو پوری دنیا کی بادشاہت اور چوہدراہٹ مل گئی۔

امریکا نے 11/9 کا ذمہ دار القاعدہ کو ٹھہرایا۔ القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن ان دنوں افغانستان میں تھے ۔اسامہ بن لادن کو سوویت یونین کو افغانستان سے نکال باہر کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس لیے افغانی ان کا دل سے احترام کیا کرتے تھے ۔امریکا نے افغانیوں کو اسامہ بن لادن کو امریکا کے حوالے کرنے کا کہا۔افغانستان میں اس وقت طالبان کی حکومت تھی ۔ لہٰذا انھوں نے اسامہ بن لادن کو امریکا کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ امریکا غیض وغضب کے عالم میں ۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بس نہتے افغانیوں پر چڑھ دوڑا۔ صدر بش کی حکومت ختم ہو گئی ، لیکن امریکیوں کو اسامہ نہ ملا۔ امریکا نے اس کا بدلہ افغانیوں سے خوب لیا۔ افغانستان کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ کچھ عرصے بعد امریکا کو اطلاع ملی کہ عراق کے صدر صدام حسین کے پاس خطرناک ہتھیار ہیں۔ بس یہ اطلاع ملنی تھی کہ امریکا نہتے عراقیوں پر بھی چڑھ دوڑا۔اور اس ملک کو اس حد تک مفلوج کیا کہ اتنے سال گزرنے کے باوجود اس ملک کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔

امریکا نے اپنے 2974 لوگوں کی ہلاکتوں کا بدلہ بڑی 'آن ، بان اور شان' سے لیا۔ کیوں کہ سپر پاور یوں ہی بدلہ لیا کرتے ہیں ۔ افغانستان میں امریکا کی نام نہاد وار آن ٹیرر 2001ء سے 2014ء تک جاری رہی ۔ وکی پیڈیا کے مطابق

اس دوران اکیانوے ہزار لوگ بالواسطہ اور تین لاکھ ساٹھ ہزار لوگ بلاواسطہ ہلاک ہوئے۔ واضح رہے کہ ان میں وہ لوگ شامل نہیں، جو پاکستان میں امریکا کی اس نام نہاد وار آن ٹیرر کا نشانہ بنے۔ امریکا کی عراق میں مسلط کی گئی وار آن ٹیرر کے نتیجے میں ایک ملین لوگ موت کا نشانہ بنے۔ واضح رہے کہ یہ جنگ کے ابتدائی چار سالوں کا تخمینہ ہے۔ یہ جنگ 2003ء میں شروع ہوئی تھی اور قریبا 2011ء میں ختم ہوئی تھی۔ امریکا عراق سے مہلک ہتھیار کے خاتمے کے لیے گیا تھا۔ لیکن آج تک اسے وہاں سے مہلک ہتھیار نہ ملے۔ جانی نقصان کے علاوہ دونوں ملکوں کا جو مالی نقصان ہوا، اس کا ذمہ دار بھی امریکا ہے۔

9/11 کے واقعے سے جہاں امریکا کی بالادستی کا آغاز ہوا، وہاں مسلم دنیا میں ایک نہ ختم ہونے والی دہشت گردی بھی شروع ہوئی۔ 11/9 سے پہلے ہم صرف القاعدہ کا نام سنتے تھے۔ اب تو القاعدہ جیسی اتنی ساری تنظیمیں معرضِ وجود میں آ گئی ہیں کہ ان پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ مسلم دنیا میں تسلسل سے خود کش حملوں کا آغاز بھی 9/11 کے بعد شروع ہوا۔ 11/9 کے بعد ہی اپنوں کے ہاتھ، اپنوں کے لہو سے رنگنے کی رسم جاری ہے، جو اب تک عراق کے بازاروں میں، افغانستان کے کوہ ساروں میں اور پاکستان کی عبادت گاہوں میں جاری وساری ہے۔ مسلم دنیا میں دہشت گردی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اب اس کے

سائے مقاماتِ مقدسہ تک منڈلانے لگے ہیں۔ پھر یہ سوال ضرور جنم لیتا ہے کہ امریکا نے جو وار آن ٹیرر شروع کی تھی اور جس کی وجہ سے اس نے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اس کا کیا ہوا؟ یعنی امریکا عالمی دہشت گردی کو روکنے میں ناکام ہو گیا؟ یا پس منظر میں اس کی کچھ ایسی وجوہات ہیں، جن کو امریکا سامنے نہیں لانا چاہتا؟ 9/11 کے بعد امریکا غیض و غضب کے عالم میں دھاڑنے لگا تھا۔ امریکا کی طرف سے پاکستان کو دھمکی دی گئی کہ اگر تم ہماری وار آن ٹیرر کا حصہ نہ بنے تو تمھارے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جا سکتا ہے، جیسا سلوک ہم اپنے 'مغضوب' لوگوں سے کرنے والے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ ہماری جنگ کا حصہ بنو۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا۔ پاکستان کے حکم ران امریکا کی اس دھمکی کے آگے رام ہو گئے۔ پھر کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ پاکستان سات سمندر پار رہنے والے امریکا کے غیض و غضب سے تو کسی حد تک بچ گیا، لیکن اپنوں کی دہشت گردی نے اسے اس طرح مفلوج کیا کہ اب تک اس کی حالت نہیں سنبھل سکی۔ پاکستان کو امریکی کی دہشت گردی کی جنگ کے بدلے میں کم و بیش ساٹھ ہزار لوگوں کی جانوں کے ضیاع کا نقصان.برداشت کرنا پڑا ہے۔ لیکن اب تک اس ملک کے حکم ران امریکا کی سچی خوشی حاصل نہ کر سکے۔ کیوں کہ امریکا اب تک 'ڈو مور' کی رٹ پر رٹ لگائے جا رہا ہے۔

## نصیحت آموز باتیں

کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو ایک بار پڑھا جائے تو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے
۔ پچھلے دنوں ایک ایسی ہی کتاب میری نظروں سے گزری ۔ اس کتاب کو سرسری طور
پر دیکھا تو یہ ایک نصیحت آموز کتاب تھی ۔ اس میں مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے
واقعات اور بزرگانِ دین کی نصیحتیں تھیں ۔ میرا ماننا ہے کہ جو کتاب جتنے زیادہ خلوص
کے ساتھ لکھی جائے گی ، اس کی قدر و اہمیت اسی قدر زیادہ ہوگی ۔ وہ اسی قدر شہرت
حاصل کرے گی ۔ مذکورہ بالا کتاب کے مولف نصر بن محمد بن احمد بن ابراہیم ہیں ۔ یہ
بزرگ اور عالمِ دین الفقیہ ابو اللیث سمرقندی کے نام سے مشہور ہیں ۔ ان کا انتقال سن
373 ہجری میں ہوا تھا ۔ کتاب کا نام "تنبیہ الغافلین " ہے ۔ غور کریں کہ مولف کے
انتقال کو ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے ، لیکن ان کی کتاب ہنوز
پڑھی جا رہی ہے ۔ آج میں اسی کتاب کی چند اچھی اور نصیحت آموز باتیں اپنے قارئین
کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ کیوں کہ اچھی بات کو دوسروں تک پہنچانا بھی ایک
بہت بڑی نیکی ہے ۔

1 ۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے ۔ راستے میں کچھ لوگ
وزنی پتھر اٹھا کر اپنی طاقت کا موازانہ و مقابلہ کر رہے تھے ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس پتھر سے بھی زیادہ وزنی ایک چیز ہے۔ جہاں طاقت کا موازنہ بہتر ہوگا۔

لوگوں نے عرض کیا، وہ کیا ہے ؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دو بھائیوں میں کسی بنیاد پر عداوت و دشمنی ہوجائے اور دونوں پر شیطان غالب آجائے تو اس وقت ایک بھائی عارضی عزت و ذلت کی پرواہ کیے بغیر (صرف اللہ کی رضا کے لیے ) دوسرے بھائی کے پاس جا کر صلح صفائی کر لے چاہے اس کے لیے معافی مانگنی پڑے) یا کسی شخص کو سخت غصہ ہو (تو غصے کے تقاضے ) پر عمل کی قدرت کے باوجود ) وہ اللہ کے لیے صبر کرے۔

۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چھے قسم کے لوگ چھے باتوں کی وجہ سے 2 حساب سے قبل ہی جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے:

الف۔ امراء و روسا اپنے ظلم وزیادتی کی وجہ سے۔

ب۔ غریب، تعصب کی وجہ سے

ج۔ چودھری اور صاحبِ اقتدار لوگ تکبر و غرور کی وجہ سے

د۔ تاجر حضرات اپنی بد دیانتی اور خیانت کی وجہ سے

ہ۔ دیہاتی لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے

و۔ علماء، حسد کی وجہ سے

: ۔ عارف وہ ہے، جس کے اندر چھ خصلتیں پائی جائیں 3

(الف۔ جب اللہ کو یاد کرے تو اس نعمت کو بڑا جانے۔ (یعنی اس کی قدر کرے۔

ب۔ جب خود پر نظر جائے تو اپنے کو حقیر جانے۔

ج۔ اللہ کی آیات کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے۔

د۔ شہوت و گناہ کا خیال آئے تو ڈر جائے۔

ہ۔ اللہ کی صفتِ عفو کے تصور سے خوش ہو۔

و۔ گذشتہ گناہ یاد آئیں تو استغفار کرے۔

۔ حضرت لقمان رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے معلوم کیا کہ آپ نے اتنا بلند مقام و مرتبہ 4 کیسے حاصل کیا۔ فرمایا، سچائی، امانت داری اور لغویات سے پرہیز کے ذریعے۔

۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا فلاں شخص نے آپ کی غیبت کی 5 ہے۔ یہ سن کر انھوں نے تازہ کھجوروں کا ایک تھال اس کے پاس بھیج دیا اور کہلو بھیجا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے اپنی نیکیاں مجھے عنایت فرما دی ہیں۔ اس کے بدلے میں یہ معمولی سا ہدیہ پیشِ خدمت ہے۔

۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رات کو ایک مہمان آیا۔ آپ چراغ کے 6
سامنے بیٹھ کر لکھ رہے تھے ۔ چراغ گل ہونے لگا۔

مہمان نے عرض کیا، میں چراغ درست کر دوں ؟

فرمایا، مہمان سے خدمت لینا بد اخلاقی ہے۔

مہمان نے عرض کیا، غلام سو رہا ہے، اس کو اٹھا دوں ؟

فرمایا، نہیں ابھی سویا ہے۔

چناں چہ خود اٹھ کر چراغ میں تیل ڈالا

! مہمان نے عرض کیا، میرے ہوتے ہوئے آپ نے تکلیف فرمائی

ارشاد فرمایا، میں اُس وقت بھی ابنِ عمر تھا اور اب بھی ابنِ عمر ہوں۔ چراغ میں تیل ڈالنے سے میری شان نہیں گھٹ گئی۔ اللہ کو متواضع لوگ پسند ہیں۔

۔ حضرت لقمان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے صاحب زادے سے فرمایا، بیٹا ! تین آدمی 7
: تین موقعوں پر پہچانے جاتے ہیں

الف۔ حلیم (بردبار) غصے کے وقت

ب۔ بہادر لڑائی کے وقت

ج۔ دوست ، غربت کے وقت

(اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان نصیحتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین

# عمدہ اخلاق قرآنِ حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں

اسلام کو سمجھنے کے دو بنیادی ذرائع ، قرآن حکیم اور احادیثِ مبارکہ ہیں ۔ یعنی کتاب و سنت ۔ اگر ہم ان دونوں ذرائع کا بہ خوبی مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہم آج کل کے اس مادی دور میں ، شاید ہی عملی مسلمان ہوں ۔ 'عملی' کیا ، ہم تو 'علمی' ، مسلمان بھی نہیں رہے ۔ یعنی ہم اپنے دین کو جانتے ہی نہیں ہیں ۔ جب جانتے ہی نہیں ہیں ، تو عمل کیوں کر ہوگا ۔ ایک دور تھا ، جب عوام کے لیے اسلامی تعلیمات کو سمجھنا از حد مشکل تھا ۔ لیکن اب سچے علما کی محنتوں اور کوششوں سے یہ مشکلات خاصی آسان ہو گئی ہیں ۔ جدید دور نے اور بھی آسانیاں پیدا کر دی ہیں ۔ عام لوگ عربی نہیں سمجھتے ، لیکن اردو سمجھ لیتے ہیں ۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ کے آسان ترجمہ شدہ نسخے آسانی سے بازار میں مل جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی ویب سائٹیں بھی بن چکی ہیں ، جن کی مدد سے ہم بہ آسانی دینِ اسلام کو سمجھ سکتے ہیں ۔ لیکن اس کے لیے ذوق و شوق کی ضرورت ہے ، جو فی الوقت ہماری قوم میں معدوم ہے ۔

قرآنِ حکیم ہمیں اعلیٰ اخلاق کی دعوت دیتا ہے ۔ اخلاقِ حسنہ کی تلقین کرتا ہے ۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کئی پہلو ایسے ہیں ، جن میں

ہمیں اخلاقِ حسنہ سے کام لینا ہوتا ہے، لیکن ہم نہیں لیتے۔ جس کی وجہ سے غیروں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ مسلمان ایک اخلاق سے گری ہوئی قوم ہے۔ اگر ہم قرآنِ حکیم میں بتائی گئی اچھی باتوں کو اپنی زندگی کا شعار بنالے تو در حقیقت ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ قرآن حکیم اور احادیثِ مبارکہ ہمیں بہت سی اچھے باتوں کی تلقین کرتے ہیں۔ احادیث اچھی عادتوں کی بابت کیا کہتی ہیں، اس پر ان شاء اللہ، پھر کبھی نظر کریں گے۔ فی الحال قرآنِ حکیم کی تعلیمات کو دیکھتے ہیں۔

۔ "کہہ دو آؤ میں تمھیں سنا دوں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ اس 1 کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور تنگدستی کے سبب اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، ہم تمھیں اور انہیں رزق دیں گے، اور بے حیائی کے ظاہر اور پوشیدہ کاموں کے قریب نہ جاؤ، اور ناحق کسی جان کو قتل نہ کرو جس کا قتل اللہ نے حرام کیا ہے، (اللہ) تمھیں یہ حکم دیتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ۔

اور سوائے کسی بہتر طریقہ کے یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچے، اور ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، اور جب بات کہو تو انصاف سے کہو اگرچہ رشتہ داری ہو، اور اللہ کا عہد پورا کرو، (اللہ نے) تمھیں یہ حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔"

(سورۃ الانعام، آیات نمبر 151 اور 152)

2 ۔ " اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب ان سے بے سمجھ لوگ بات کریں تو کہتے ہیں سلام ہے۔

" اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ ان دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔"

" اور جو بیہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے، اور جب بیہودہ باتوں کے پاس سے گزریں تو شریفانہ طور سے گزرتے ہیں۔" (سورۃ الفرقان، آیات نمبر 63، 67، 72)

3 ۔ " بے شک مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں سو اپنے بھائیوں میں صلح کرادو، اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

" اے ایمان والو! ایک قوم سے دوسری قوم ٹھٹھا نہ کرے عجب نہیں کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں سے ٹھٹھا کریں کچھ بعید نہیں کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کے نام دھرو، فسق کے نام لینے ایمان لانے کے بعد بہت برے ہیں، اور جو باز نہ آئیں سو وہی ظالم ہیں۔"

" اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو، کیوں کہ بعض گمان تو گناہ ہیں، اور ٹٹول بھی نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی سے غیبت کیا کرے، کیا تم میں

سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے سو اس کو تو تم ناپسند کرتے
"ہو، اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم والا ہے۔
اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے خاندان
اور قومیں جو بنائی ہیں تاکہ تمہیں آپس میں پہچان ہو، بے شک زیادہ عزت والا تم میں
سے اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے، بے شک اللہ سب کچھ
جاننے والا خبردار ہے۔" سورۃ الحجرات ،آیات نمبر 10، 12،11، 13
ان آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات میں اچھی اچھی باتوں کی تلقین کی گئی ہے۔
لیکن طوالت کا خوف ہے۔ سو اسی پر اکتفا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآنی اخلاقیات پر عمل
( کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین
سے quranurdu.org نوٹ: اس مضمون میں قرآنِ حکیم کے ترجمے کے لیے )
(استفادہ کیا گیا ہے۔

# قرآنِ حکیم کے ریاضیاتی اعجازات

قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، جو آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ چوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، لہٰذا اس جیسا کلام لانا مشکل ہی نہیں، نا ممکن ہے۔ سورۃ الاسراء کی آیت نمبر 88 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"کہہ دو اگر سب آدمی اور سب جن مل کر بھی ایسا قرآن لانا چاہیں تو ایسا نہیں لا سکتے اگرچہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مددگار کیوں نہ ہو۔"

سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 23 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اور اگر تمہیں اس چیز میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو ایک سورت اس جیسی لے آؤ، اور اللہ کے سوا جس قدر تمہارے حمایتی ہوں بلا لو اگر تم سچے ہو۔"

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سورۃ الاسراء مکی سورت ہے، جب کہ سورۃ البقرہ مدنی سورت ہے۔ یعنی پہلے کہا گیا کہ قرآنِ حکیم جیسا دوسرا کلام لانا نا ممکن ہے۔ پھر کہا گیا کہ پورا کلام لانا تو درکنار، اس جیسی ایک سورت لانا بھی نا ممکن ہے۔

قرآنِ حکیم جیسا کلام لانا کیوں نا ممکن ہے؟ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔

لیکن ایک عجیب وجہ یہ بھی ہے کہ آج کل کے اس سائنسی دور میں یہ معلوم بھی ہوگیا ہے کہ قرآنِ حکیم میں بہت سے ریاضیاتی اعجازات بھی ہیں۔ آج ہم انھی ریاضیاتی اعجازات میں سے چند کا ذکر کریں گے۔

۔قرآن مجید میں لفظ "رجل" یعنی مرد 24 مرتبہ آیا ہے۔ اسی طرح "امرءۃ" یعنی1
عورت بھی 24 مرتبہ آیا ہے۔

۔ قرآن مجید میں لفظ "شیطان" 68 دفعہ آیا ہے۔ اسی طرح لفظ "ملائکہ" بھی2
مرتبہ آیا ہے۔ 68

۔قرآن مجید میں لفظ "دنیا" 115 مرتبہ آیا ہے۔ اسی طرح لفظ "آخرۃ" بھی3
مرتبہ آیا ہے۔ 115

۔قرآن مجید میں لفظ "ایمان" 25 مرتبہ آیا ہے۔ اسی طرح لفظ "کفر" بھی 425
مرتبہ آیا ہے۔

یہ تو ہوگئیں، متضاد الفاظ کی مطابقتیں۔

اب کچھ اور مطابقتیں ملحوظ ہوں۔

۔سال میں بارہ مہینے ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں لفظ "شہر" یعنی مہینا 12 مرتبہ آیا5
ہے۔

۔سال میں 365 دن ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں لفظ "یوم" یعنی دن 365 مرتبہ6
آیا ہے۔

۔ مسلمان پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔ قرآن مجید میں لفظ "صلوات" پانچ7

مرتبہ آیا ہے۔

اب آگے چلتے ہیں۔

۔قرآنِ حکیم کی ستاونویں سورت، سورۃالحدید ہے۔اس سورۃ میں 29 آیات ہیں۔8

اگر ہم 57 کو 29 سے ضرب دیں تو 1653 آتا ہے۔یعنی:

57x29=1653

اگر ہم 1 سے 57 تک اعداد لکھیں اور ان کے درمیان جمع کے نشانات لگائیں تو

آجاتا ہے۔یعنی 1653:

1+2+3+4......57=1653

۔سورۃالتوبہ قرآنِ حکیم کی نویں سورت ہے۔یہ وہ سورت ہے، جس کے ابتدا میں 9 بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں ہے۔لیکن جب ہم سورۃ النمل، جو کہ قرآنِ حکیم کی 27 ویں سورۃ ہے، پڑھتے ہیں تو ہمیں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورت کے اندر نظر آجاتا ہے

۔

اور 9 کے درمیان 18 کا فرق ہے۔یعنی 27:

27-9=18

اور 27 کے درمیان 19 سورتیں ہیں۔(اگر 27 ویں سورت کو شامل کیا جائے۔) 9

اور 19 کے درمیان بڑا دلچسپ تعلق ہے۔ملحوظ ہو 18:

18x19=342

9+10+11.....+27=342

۔دوسرا دلچسپ تعلق یہ ہے کہ اس سورۃ کی آیت نمبر 18 میں " نمل " یعنی چیونٹی 10 کا ذکر ہے۔اور یہ آیت 19 الفاظ پر مشتمل ہے۔

۔سورۃ النمل قرآنِ حکیم کی 27 ویں سورۃ ہے۔اس سورۃ میں 93 آیات ہیں۔یہ 11 سورت "طس" سے شروع ہوتی ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ اس سورت میں 27 مرتبہ "ط" آیا ہے۔جب کہ 93 مرتبہ "س" آیا ہے۔اگر 93 اور 27 کو جمع کیا جائے تو 120 آتا ہے۔جو کہ سورۃ کے نام یعنی " نمل " کے اعداد ہیں۔

۔قرآن حکیم کی 13 ویں سورۃ، سورۃ الرعد ہے۔حیرت انگیز طور پر اس سورت کا 12 نام ،آیت نمبر 13 میں آیا ہے۔اس سے بھی بڑی حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ سورۃ، تیرھویں پارے میں ہے۔اس سورۃ کی تیرھویں آیت ، جس میں اس سورۃ کا نام یعنی "رعد" آیا ہے، 19 الفاظ اور 83 حروف پر مشتمل ہے۔قرآنِ حکیم میں "رعد" یعنی اس سورت کا نام ایک اور مقام پر بھی آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 19 میں یہ لفظ آیا ہے۔ حیرت انگیز طور پر اس آیت میں بھی 19 الفاظ ہیں اور 93 حروف ہیں۔

یہ تو چند ریاضیاتی اعجازات ہیں۔ اس کے علاوہ ماہرین نے اور بھی اس طرح کی بہت سی حیرت ناک ریاضیاتی مطابقتیں تحریر کی ہیں۔یعنی سائنس جتنی روشن ہوتی جارہی ہے، قرآنِ حکیم کی حقانیت و صداقت بھی اس طرح روشن ہوتی جارہی ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مقدس کتاب کی تعلیمات سمجھنے کی توفیق عطا

فرمائے۔ (آمین)

نوٹ: میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں، اس مضمون میں تحریر شدہ ریاضیاتی اعجازات کے سلسلے میں میری ذاتی ریسرچ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ میں نے درج ذیل لنکس سے استفادہ کیا ہے:

http://www.islaminfo.com/3/74/the-quran-as-a-mathematical-miracle

http://www.miraclesofthequran.com/mathematical_01.html

http://numerical19.tripod.com/noon_center/surah_annaml.htm

## مسکرائیے

سیاست کی گرم بازاری میں مسکرانا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ بہت سے موضوعات بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن سچ پوچھیں تو حالاتِ حاضرہ پر لکھنے کا جی ہی نہیں چاہتا۔ میں نے پچھلے چند مہینوں سے حالاتِ حاضرہ پر نہیں لکھا۔ میری کوشش رہی کہ قارئین کو کوئی معلوماتی تحریر پڑھنے کو دے سکوں۔ آج دل کر رہا ہے کہ اپنے قارئین کے چہروں پر مسکراہٹوں کو سجاؤں۔ لطیفوں کے سلسلے میں میرا نقطہِ نظر یہ ہے کہ مذاق کی آڑ لے کر کسی مخصوص قوم کو نشانہ بنانا اچھی بات نہیں ہے۔ ہمارا دین بھی اس سے منع کرتا ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے ایسے لطیفے رائج ہیں، جن میں 'سردار' اور 'پٹھان' کا ذکر ہوتا ہے۔ اور خاص طور پر ان دونوں کو سخت طنز و مزاح کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس سے احتراز برتنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ایسے لطائف جن سے ابتذال ٹپکتا ہو، اچھے نہیں ہوتے۔ یہ معاشرے میں بگاڑ پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسے لطیفوں سے بچنا بھی بے حد ضروری ہے۔ چند لطیفے پیشِ خدمت ہیں۔ یہ سارے لطیفے میں نے انٹرنیٹ کی مختلف ویب سائٹوں سے نکالے ہیں۔ یعنی اس میں میرا کوئی 'کمال' نہیں۔

1۔ ایک آدمی کسی شخص سے ملنے گئے۔ جب دروازے پر پہنچے تو گھنٹی بجادی۔

"نوکر: "جی کس سے ملنا ہے؟

آدمی: جاؤ، اپنے صاحب سے کہو کہ فلاں آدمی تم سے ملنے کیلئے آیا ہے۔

جب نوکر اندر جانے لگا تو اِس آدمی کو مکان مالک کا سر کھڑکی میں نظر آیا جو کمرے میں

" ٹہل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نوکر آیا اور آدمی سے کہا: "صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔

آدمی: "میں جا رہا ہوں، لیکن جب تمھارے صاحب آئیں تو ان سے کہنا کہ جب بھی وہ

" گھر سے نکلیں تو سر کھڑکی میں نہ رکھیں بلکہ یہ بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں۔

"۔ ڈاکٹر: موٹاپے کا ایک ہی علاج ہے کہ تم روزانہ صرف 2 ہی روٹیاں کھایا کرو۔ 2

" مریض: " ٹھیک ہے لیکن یہ 2 روٹیاں کھانے سے پہلے کھانی ہیں یا کھانے کے بعد؟

۔ ڈاکیا ایک محلے میں ایک لڑکے سے پوچھتا کہ خالد کا گھر کہاں ہے؟ 3

"لڑکا: "فیصل کے گھر کے سامنے۔

"ڈاکیا: " فیصل کا گھر کہاں ہے؟

"لڑکا: "خالد کے گھر کے سامنے۔

"ڈاکیا: "اچھا تو ان دونوں کا گھر کہاں ہے؟

"لڑکا: " آمنے سامنے۔

۔ ایک مقدمے میں گواہوں کے بیانات سننے کے بعد جج نے ملزم کے وکیل سے کہا کہ 4
کیس تمھارے موکل کے خلاف جارہا ہے۔ تم چاہو تو ملزم کو مزید کارروائی سے قبل اس
کو الگ لے جا کر مناسب مشورہ دے دو۔
یہ سن کر وکیل ملزم کو لے کا الگ چلا گیا تھوڑی دیر بعد وکیل آکیلا واپس آیا تو جج نے
دریافت کیا کہ ملزم کہاں ہے؟
وکیل نے جواب دیا، وہ تو بھاگ گیا۔ میرا اسے یہی مشورہ تھا۔

۔ دو افراد جن کے درمیان کچھ رنجش تھی ایک ایسی گلی میں آمنے سامنے آ گئے۔ 5
جہاں دونوں اکٹھے نہیں گزر سکتے تھے۔
کم از کم ایک کو ضرور سائیڈ پر ہونا پڑنا تھا۔

...

اب کچھ دیر تو وہ کھڑے رہے۔
"آخر ایک صاحب بولے: "میں گدھوں کو راستہ نہیں دیا کرتا۔
: یہ سن کر دوسرے صاحب مسکراتے ہوئے ایک طرف ہو گئے اور کہا
"میں دے دیا کرتا ہوں۔"

۔ایک صاحب ولیمے کی دعوت میں بڑی تیزی سے بریانی کی پلیٹوں پر ہاتھ صاف کر 6
:رہے تھے، ایک واقف کار نے انھیں ٹوکتے ہوئے کہا
..جناب! پانی کے لیے بھی گنجائش رکھیے
اس موقع پر انھوں نے ایک خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا: "بھائی! بس کتنی ہی بھری
"ہوئی کیوں نہ ہو، کنڈکٹر اپنی جگہ خود بنالیتا ہے۔
۔ ٹیکسی ڈرائیور (مسافر سے): "جناب! میں میٹر چلانا بھول گیا ہوں اس لیے سمجھ 7
میں نہیں آیا آپ سے کتنے پیسے لوں؟"۔
مسافر: "پریشانی کی کوئی بات نہیں، میں بھی اپنا بٹوا گھر بھول آیا ہوں"۔
۔ایک شخص کسی وکیل کے پاس آیا اور کہا: "جناب! میں نے ایک شخص کے چہرے 8
پر مکا مار کر اس کے دانت توڑ دیے ہیں۔ اس نے مجھ پر مقدمہ کر دیا ہے، مہربانی کرکے
"آپ میری پیروی کریں۔
"وکیل نے اس سے پوچھا: "تم نے اسے مکہ کیوں مارا تھا؟
"اس شخص نے جواب دیا: "جناب! اس نے مجھے ایک ماہ قبل گینڈا کہا تھا۔
"وکیل نے حیران ہو کر پوچھا: "تم نے ایک ماہ گزرنے کے بعد اسے مکا کیوں مارا ہے؟
اس شخص نے معصومیت سے جواب دیا: "جناب! دراصل میں نے گینڈا آج ہی دیکھا
"ہے۔

## سیرتِ طیبہ کے دو واقعات

اس امتِ مرحومہ کو اس پر آشوب اور سخت دور میں اسوہِ حسنہ یعنی پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر عمل کرنے کی جتنی اب ضرورت ہے، شاید اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ سوچتا ہوں کہ ہماری اخلاقیات کہاں گم ہوگئیں ؟ ہم کبھی زمانے کے امام تھے، مگر اب کیا ہیں ؟ کچھ بھی تو نہیں۔ سچ یہ ہے کہ جب سے ہم نے اپنے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت پر عمل کرنا چھوڑ دیا، تب سے ہم پر مصیبتوں کے دور کا آغاز ہوگیا۔ میں اکثر کہتا رہتا ہوں کہ ہم قرآنِ حکیم کی تعلیمات پر کس طرح عمل کریں گے، جب کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہے کہ اس پاک کلام کی تعلیمات کیا ہیں ؟ بالکل اسی طرح، جب ہمیں آقا علیہ السلام کی پاک سیرت کے بارے میں معلوم ہی نہیں ہے تو ہم کیوں کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر عمل کر سکیں گے ؟ضرورت اس بات کی ہے کہ سیرتِ طیبہ کی حتی المقدور تشہیر کی جائے۔ مکتبوں میں، درس گاہوں میں، کالجوں میں، یونی ورسٹیوں میں، فیکٹریوں میں، کارخانوں میں اور یہاں تک کہ پارلیمنٹ میں۔ کیوں کہ آقا علیہ السلام کی سیرت انسانی زندگی کے ہر ہر گوشے کی رہنمائی اور تربیت کرتی ہے۔ تعلیم ہو یا سیاست، امورِ خانہ داری ہوں، یا تجارت، معیشت ہو یا رہن سہن کے اطوار، ہر جگہ اسوہِ حسنہ کی پیروی کرنا ہمارے لیے از حد

ضروری ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ ایک بحرِ بے کراں ہے ۔ اس کا پورا پورا احاطہ کرنا مشکل ہی نہیں ، نا ممکن ہے ۔ جی چاہتا ہے ، آقا علیہ السلام کی سیرتِ پاک کے دو واقعات سے آج کی اپنی تحریر کو معطر کروں ۔

۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ، ایک دن میں حضورِ اکرم صلی اللہ 1 علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالائی منزل پر تشریف رکھتے تھے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمِ مبارک پر صرف ایک تہہ بند تھا ۔ ایک کھری چارپائی تھی ، سرہانے ایک تکیہ پڑا تھا ، جس میں خرمے کی چھال بھری ہوئی تھی ۔ ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے ۔ ایک کونے میں پائے مبارک کے پاس کسی جانور کی کھال پڑی تھی ۔ کچھ مشکیزے کی کھالیں سر کے پاس کھونٹی پر لٹک رہی تھیں ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب دریافت کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی ، "یا رسول اللہ ! میں کیوں نہ روؤں ۔ چارپائی کے بان سے جسمِ اقدس پر بدھیاں پڑ گئی ہیں ۔ اس میں جو سامان ہے ، وہ نظر آ رہا ہے ۔ قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹیں اور خدا کے پیغمبر و برگزیدہ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامانِ خانہ کی یہ کیفیت ہو ۔ " آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ، " اے ابنِ

"خطاب ! تم کو یہ پسند نہیں کہ وہ یہ دنیا لیں اور ہم آخرت۔
یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا مشہور واقعہ ہے۔ اب ذرا غور کیجیے کہ ہم دنیا و آخرت میں سے کس کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں ؟ ہمیں ان دونوں میں سے کو ن سی شے زیادہ مرغوب ہے ؟ اسلام کا جھکاؤ دنیا کے مقابلے میں آخرت کی طرف زیادہ ہے ، کیوں کہ وہ ابدی زندگی ہے۔
۔ قبیلہِ اراش کا ایک شخص مکہ مکرمہ میں اپنے اونٹ بیچنے کے لیے لایا۔ ابو جہل نے 2 اس سے سارے اونٹوں کا سودا کر لیا۔ اونٹ لینے کے بعد ابو جہل نے قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول شروع کر دی۔ اراشی کئی روز مکہ مکرمہ میں ٹھہرا رہا، مگر ابو جہل برابر حیلے بہانے کرتا رہا۔ جب اراشی تنگ آ گیا تو اس نے ایک روز حرمِ کعبہ میں پہنچ کر قریش کے سرداروں کو اپنی بپتا سنائی اور فریاد کی کہ میری رقم ابو جہل سے دلوادو۔ میں ایک غریب الوطن مسافر ہوں ، خدارا میری مدد کرو۔ جس وقت وہ قریش کے سرداروں سے فریاد کر رہا تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حرمِ کعبہ کے ایک گوشے میں تشریف فرما تھے۔ سردارانِ قریش کو مذاق سوجھا تو انھوں نے اس کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے میں مدد طلب کرنے کو کہا۔ مظلوم اراشی اپنی فریاد لے کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا۔ دوسری طرف سرداران

قریش خوش ہو رہے تھے کہ آب مزہ آئے گا۔آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اجنبیِ مظلوم کی فریاد سن کر اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور ابو جہل کے مکان پر پہنچ گئے۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رعب دار آواز میں کہا، "تم نے اس اراشی سے اونٹ خریدے ہیں، فوراً اونٹوں کی رقم لا کر اس شخص کو دے دو۔" یہ ایک سچے کردار کی عظمت اور رعب کا نتیجہ تھا کہ ابو جہل نے مطلوبہ رقم اراشی کے سپرد کر دی۔
اس واقعے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں مظلوم کی حمایت کرنی چاہیے، چاہے وہ مظلوم کسی اور قوم کا ہی کیوں نہ ہو !
( اللہ تعالی ہمیں اسوہِ حسنہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین)